

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہاں)

یا گارِ عِلّٰہِ وَجِیہِ نَزِیجِ جِسِّسِ مِیّٰنِ مُحَمَّدِ اُصَاہِ مَحَبِّیوں

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد بی، اے (آکسن) بیرسٹریٹ لاء

حامد علی خاں بی بی

منصور احمد

جاسٹ ایڈیٹر

فہرست مضامین

بابر ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء

تصویر: چارلس ڈارون

جلد ۱۷

نمبر

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	نمبر شمار
۶۷۷	باغبان	ناکامیاں	۱
۶۷۸		جہاں نما	۲
۶۸۲	جناب پروفیسر فیض احمد صاحب ایم اے	مشرقی لٹریچر مغرب میں کیونکر پہنچا	۳
۶۸۹	حضرت اصغر گوندوی	نشاط روح (نظم)	۴
۶۹۰	جناب مولانا مارون خاں صاحب شروانی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ	مبادی سیاسیات	۵
۷۰۶	حاج علی خاں	نوائے راز (نظم)	۶
۷۰۷	جناب وحید اکبر آبادی	ڈارون	۷
		تصویر: چارلس ڈارون	
۷۱۰	جناب سید عین الحق صاحب حق	تم میرے دل میں ہو	۸
۷۱۱	جناب مولانا شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی	پیران سالوس (رباعیات)	۹
۷۱۲	جناب خاجہ عبد السمیع صاحب پال انتر صہبائی ایم اے، ایل بی لیگ	جام صہبائی رباعیات	۱۰
۷۱۳	فلک پیم	زیتا	۱۱
۷۱۷	ڈرامی	یعنی میں؟	۱۲
۷۱۹	حضرت اکبر سروری لکھنوی	تجلیات (نظم)	۱۳
۷۲۰	مفتوا احمد	دم واپس (افسانہ)	۱۴
۷۲۴	جناب پنڈت رام رتن صاحب مضطر	غزل	۱۵
۷۲۵	جناب ظفر قریشی دہلوی	پراسرار قیدی (افسانہ)	۱۶
۷۳۲	جناب پروفیسر رام پرشاد صاحب کھوسلا ناٹک ڈائریکٹر	بچپن کی یاد (نظم)	۱۷
۷۳۳	ہندی	چیتوا (ڈراما)	۱۸
۷۳۳		مختل ادب	۱۹
۷۳۷		تبصرہ	۲۰

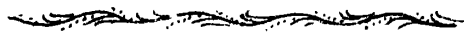
ناکامیاب

زندگی کی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو! وہ زندگی کامیاب نہیں جو نری کامرانی ہو، وہ خوشی خوش نہیں کر سکتی جو درد و الم کی قیمت دے کر حاصل نہ کی گئی ہو! دن کی جلوہ گری رات کی پردہ پوشی سے ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں کو وادیوں کی افتادگی بلند کئے ہوئے ہے، حسن زشت نمائی کا پروردہ ہے، دید کا لطف غم فراق کا دست نگر ہے اور زندگی کی فتح اُس کی شکستوں سے ہے۔

وہ عیش و عشرت بے لذت ہے جسے کبھی دنیا کی مصیبتوں سے واسطہ نہیں پڑا، وہ آرام غم انجام ہے جس کا کوئی انجام نظر نہ آئے، وہ سکون روح کی موت ہے جس میں بے تابی اگر اپنا خون نہ دوڑا دے! وہ جو خدا سے ابدی راحت کے طلب گار ہیں وہ خدا کو ایک فارغ حکمران ایک غرقِ عشرت ہستی تصور کئے ہوئے ہیں وہ ایک ایسی جنت کے تمنائی ہیں جس میں دیکھنے کے لئے آنکھ، سننے کے لئے کان اور کھانے کے لئے منہ تک بھی کھولنا نہ پڑے! جب تک زندگی زندگی ہے اس میں برکت حرکت ہی سے ہے کہ کامل سکون روح کے لئے عین موت ہے!

جو کہتے ہیں کہ اس دنیا میں برائی کیوں ہے کمی کیوں ہے رکاوٹ کیوں ہے وہ فی الحقیقت نیکی اور فراوانی اور آزادی کے قدردان نہیں، وہ ان موتیوں کے لئے ان کی پوری قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے وہ دوست کے بستم کے لئے دل میں آرزو کی کسک کو بھی اک مصیبت جانتے ہیں! جس قدر ایک عطیہ شاندار ہوگا اُسی قدر کٹھن وہ کوششیں ہونگی جو اس کے حصول کے لئے درکار ہیں۔ زندگی کی ناکامیوں سے مایوس نہ ہو کہ وہ محض تمہاری سچی وقت کی امیدیں سترنگوں ہیں!

باغبان



جہاں نما

دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ

پچھلے عیسے دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ کی ہزاروں سالگرہ منائی گئی۔ یہ پارلیمنٹ گزشتہ دس صدیوں سے جریرہ آئیں لینڈ کے دارالحکومت میں اپنے اجلاس منعقد کرتی اور اپنے مندوبین کے ذریعہ سے امور سلطنت انجام دیتی آئی ہے، اور ان قدیم ایام سے لے کر آج سے چند سال پہلے تک اس کے اجلاس کھلے میدان میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ اس کی ابتدا اُس زمانہ میں ہوئی جب سیرلڈ فیئر شاہ ناروے کے مظالم سے تنگ آکر وہاں کے رُوسا کا ایک گروہ ترک وطن کر کے آئیں لینڈ میں آئے بسا تھا۔ ان دنوں سے لے کر آج تک جمہور کے مندوب منتخب ہو کر اس مجلس میں آتے ہیں اور قوانین وضع کرنے کے علاوہ ضروری مقدمات کے فیصلے کرتے اور قومی مسائل پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔

عالمگیر رسم الخط کی عالمگیر تحریک

کچھ دنوں سے ہندوستان میں بھی عالمگیر رسم الخط کی ترویج کا مسئلہ جاذب توجہ ہو رہا ہے۔ حال میں ڈاکٹر الما لطیفی، آئی سی ایس، نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستانی زبانوں کے لئے انگریزی یعنی لاطینی رسم الخط استعمال کیا جائے تاکہ اس طرح ملک بھر میں ایک یکسانیت پیدا ہو جائے اور اردو ہندی وغیرہ کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ مزید یہاں چند وہ نقائص بھی گناتے ہیں جو موجود رسوم خط میں پائے جاتے ہیں۔

اس تجویز کو ہندوستان میں بہت سی وجوہ کی بنا پر ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے۔ اور اب انگلستان سے بھی یہی آواز بلند ہوئی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے نظریہ کی تائید میں ایک علمی مجلس کے سامنے ایک مضمون پڑھا تو اس کے بعد ایک عام مباحثہ منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے سر ڈنیل ساس نے کہا کہ ”لاطینی رسم الخط دنیا کے بذکرہ رسم الخطوں میں سے ہے۔ اس کے برعکس دو رسم الخط اکمل اور بے عیب ہیں، ایک عربی اور دوسرا روسی۔ اگر آپ ہندوستانی زبانوں میں آسانی پیدا کرنی چاہتے ہیں تو رسم الخط کی اصلاح سے شروع کیجئے۔“

اس کے بعد مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کے لئے ناگری حروف کا رواج ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے پاس بہترین رسم الخط موجود ہے۔ لیکن اگر وہ پسند کریں تو وہ دوسری زبان کے طور پر ناگری سیکھ سکتے ہیں تاکہ باقی ہندوستان سے نامہ و پیام کر سکیں، لیکن میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تمام ہندوستان میں ایک مصنوعی انگریزی رسم الخط کو رواج دیا جائے۔

مسئلہ حیات نباتات

نباتات کی زندگی کے متعلق سر جے سی بوس نے جو اہم انکشافات کئے ہیں اگرچہ وہ بہت سی ممتاز علمی مجالس کے سامنے ثابت کئے جا چکے ہیں اور اب عام طور پر دنیائے سائنس میں قبول کر لئے گئے ہیں، لیکن کئی دفعہ ان کے خلاف انفرادی طور پر سختہ چینی کی گئی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں امریکا کے ایک حکیم نے اُن کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

ڈاکٹر پرسن رسالہ ”سائنٹیفک امیریکن“ میں لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے دارالتجربہ میں سر جگدیش کے تجربات کو دہرایا لیکن مجھے کامل طور پر ناکامی ہوئی، اور میں اُن نتائج میں سے ایک بھی حاصل نہ کر سکا جن کا ذکر سر جگدیش نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سر جگدیش کو اپنی زیرِ عمل نباتات میں حرکتِ قلب اس لئے محسوس ہوئی کہ وہ خود اسے محسوس کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سر جگدیش کی تحقیقات کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تجربے اس نتیجے سے شروع کئے کہ ہمیں پودوں کی حرکتِ نبض کا احساس اور اُن تغیرات کا ادراک ہو گا جو مختلف ادویہ کے داخل کرنے سے اس حرکت میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن باوجود انتہائی کوشش اور احتیاط کے ہم اس قسم کی کیفیت محسوس نہیں کر سکے۔ ہم نے بار بار یہ تجارب کئے اور اُن آلات سے بدجہان کی تر آلات استعمال کئے جن کا ذکر سر جگدیش اپنی کتاب میں کرتے ہیں لیکن کچھ بھی معرضِ ظہور میں نہ آیا۔ آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی تحقیقات سے پبلک کو آگاہ کر دیا جائے۔

درحقیقت سر جگدیش زندگی کی وحدانیت پر نہایت پختہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور یہ اعتقاد ہندو فلسفہ کی بنیاد ہے ممکن ہے کہ اسی اعتقاد نے اُن کی علمی تحقیقات پر ضرورت سے زیادہ اثر کیا ہو۔

چائے بنانے کے عجیب و غریب طریقے

روسی طریقے سے چائے بنانے کا اب پھر رواج ہو رہا ہے اور حقیقت میں اس سے زیادہ فرحت دینے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے کہ سادہ اور صاف چائے کی ایک پیالی ہو اور اس میں لیموں کی ایک قاش تیر رہی ہو۔ اس میں شکر حسب پسند ملائی جاتی ہے اور یہ عموماً مصری کی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سگنڈ نے اپنے سیاحت رس کے حالات بیان کئے ہوئے ایک مرتبہ لکھا کہ میں نے اپنی عمر میں بہترین چائے ایک کاسک کے ہاں سے پی تھی جس نے ایک قبلی میں پانی اور چائے ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیا اور جب وہ لپٹنے لگی تو اس نے کہا کہ چائے تیار ہے اس میں کوئی اور چیز نہیں ملائی گئی مگر اس قسم کی چائے پہلے ہی سے یاسمین یا دوسرے خوشبودار پھولوں میں ملائی جاتی ہے۔ سیامی چائے کا خاندانہ تیار کر لیتے ہیں اور مصری کی ایک ڈلی منہ میں رکھ کر پینا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر چینی جو چائے کے صرف اس سے ذرا زیادہ خوشبودار پروردوں کی مہک حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں چائے کے چند تہوں پر گرم پانی انڈیل کر جلد ہی پیالوں میں ڈال لیتے ہیں۔

لیکن تبت کے لوگ عجیب طریقے کی چائے پیتے ہیں۔ وہ پہلے چند گھنٹوں تک چائے کو ایک برتن میں اباتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کا رنگ گہرا سیاہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو چائے پانچ پانچ دن تک آگتے چڑھی رہتی ہے۔ پھر اس میں سے تھوڑا سا سیاہ رس لے کر اس میں تازہ گرم پانی ملائے ہیں اور شکر کی بجائے اس میں تھوڑا سا سوڈا اور مکھن کی ایک گولی ڈال لیتے ہیں۔ چائے میں ڈالنے کا مکھن عجیب طریقے سے تیار ہوتا ہے۔ اس کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں انتہا درجہ کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ جن گڑھوں میں ملائی لاما کے لئے مکھن تیار ہوتا ہے ان میں پچاس پچاس سال کا بلکہ اس سے بھی پرانا مکھن موجود رہتا ہے۔ چنانچہ جس چائے میں یہ مکھن ملا جاتا ہے اس کی ”مک“ صرف تصویر میں آسکتی ہے بیان سے باہر ہے۔

چائے بنانے کے یہ طریقے مغربیوں کو کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہوئے لیکن خود ان کے ہاں اس سے بھی اتنے کے طریقے رائج ہیں۔ مثلاً وکٹریبیو گونے چائے میں تھوڑی سی رم ڈال لینے کا فیشن نکالا اور لارڈ لٹن ہمیشہ چائے میں ٹھنڈے پانی کی ایک پیالی ملا کر مکیم چڑھا جایا کرتے تھے۔

ہیزلٹ اپنی چائے ہمیشہ نہایت احتیاط سے تیار کیا کرتا تھا۔ پہلے وہ اپنی چائے دانی کو نہایت قیمتی سیاہ چائے سے آدھی کے قریب بھر لیتا تھا پھر اس پر کھولتا ہوا پانی ڈالتا تھا اور فوراً پیالی میں الٹ کر اور بہت سی شکر اور بالائی ڈال کر پی جاتا تھا۔

بہترین ورزش

ڈاکٹر لیسٹر نکس لکھتے ہیں "میرے خیال میں گانا بہترین صحت افزا ورزش ہے۔ باوجود تلاش کے بارہ پندرہ سال کے عرصہ میں نے ایک بھی پیشہ ور گانے والا ایسا نہیں دیکھا جس کی صحت عام آدمیوں سے بہت اچھی نہ ہو۔ دوسرے، جو لوگ کم سے کم چھ ماہ تک گانے کی مشق جاری رکھتے ہیں، ان کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ میں نے خود بھی اس کا تجربہ کیا ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میری صحت کبھی ایسی اچھی نہیں ہوئی جیسی تین چار مہینے کے متواتر گانے سے ہوئی ہے۔

گانے سے طبعی اور نفسیاتی، دونوں قسم کا عمل ہوتا ہے۔ تفریح کو شقت پر جو فوقیت حاصل ہے وہی گانے کو تمام دوسری ورزشوں پر ہے۔ موسیقی خوشی کی علامت ہے۔ تندرست اور خوش آدمی گانا ہی سیٹی بجاتا ہے یا کسی اور طرح سے موسیقی پیدا کرتا ہے، اس کلیہ کو ناستے ہوئے کہ دل جسم پر اثر انداز ہوتا ہے کوئی شخص تردید نہیں کر سکتا کہ مسرت صحت کو بڑھاتی ہے۔ ہزاروں آدمی نہایت تن دہی سے تنفس کی ورزش کرتے ہیں لیکن کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی ناکامی کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ اسے بے دلی سے انجام دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اسے بطور تفریح کے نہیں بلکہ بطور ایک پُرشقت کام کے کرتے ہیں تنفس کے عمل سے گانے والے کے پردہ شکم کو خاص طور پر قوت حاصل ہوتی اور یہ وہ عضو ہے جس پر صحت کا بیشتر انحصار ہے علاوہ ازیں وہ رغبت سے اسے انجام دیتا ہے۔

چھاتی کا زیادہ سے زیادہ ناپ صحت اور طاقت کی دلیل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ فیصلہ ہمیشہ درست نہیں ہوتا کیونکہ ناپ کی زیادتی بیرونی مٹاپے پر بھی منحصر ہے۔ گانے والے مردوں کی چھاتی عام طور پر چالیس انچ ہوتی ہے۔ اور یہ بہترین صحت و قوت پر دلالت کرتی ہے، لیکن دوسری طرف اگر ایک پہلوان کی چھاتی اسی قدر ہو تو اس کا نپ تنی ہو مگر جانتے نہیں دونوں میں فرق یہ ہے کہ گانے والے کی چھاتی اندر سے پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے پھیپھڑوں کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے اور پہلوان کے ناپ کو اس کی پٹھ چھاتی، سینہ اور بغل کے بیرونی اعصاب ٹٹائے رکھتے ہیں ان اعصاب کی موجودگی میں پہلوان اپنی چھاتی کو دس سے بیس انچ تک پھلا سکتا ہے لیکن گانے والا صرف چار یا پانچ انچ۔

لیکن پھیپھڑوں کی پوری پوری وسعت اس زیادہ سے زیادہ ہوا کے حجم سے معلوم ہوتی ہے جو ان میں سماتی ہے۔ سینہ و اپنی چھاتی کو اٹھارہ یا بیس انچ تک ابھار سکتا تھا لیکن اس کے پھیپھڑوں کی وسعت صرف ۲۰ کعب انچ تھی جو ایک معمولی آدمی سے بڑھ کر نہ تھی۔ میرے پھیپھڑوں کی وسعت ۵۰ کعب انچ ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض گانے والوں کے پھیپھڑوں کی وسعت چار سو کعب انچ ہوگی۔

مشرقی لٹریچر مغرب میں کنوکر پہنچا

(سر ڈینی سن واس کے ایک مضمون کا ترجمہ)

اس امر کا تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ پندرہویں صدی میں یورپ کا ایک تعلیم یافتہ اور خواندہ آدمی ایٹلیا کی خیالی تصویر قائم کئے ہوئے ہوگا، اور چین و ہند کے متعلق اس کا مبلغ علم کیا ہوگا۔ ایشیائی جغرافیہ کے متعلق تو اس کے نظریے محض تخمینہ درست ہو گئے مگر ایشیائی ممالک کے لوگوں کے متعلق اس کی واقفیت سرے سے صفر ہوگی، اُسے ہندومت اور بدھ مت کا کوئی علم نہیں ہوگا اور اُس نے کنفیوشس یا رامائن کا نام تک نہیں سنا ہوگا، چنانچہ مشرق کے متعلق جو عدم واقفیت یورپ پر تسلط تھی اُس کی تائید میں واقعہ ذیل کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جب پرتگیز راس امید کا چکر کاٹ کر ۱۴۹۸ء میں سرزمین ہند میں اترے تو اُن کا خیال تھا کہ ہندوستان میں واحد غیر عیسائی مذہب صرف اسلام ہے، چنانچہ اپنے دروپردہ ایک ہندو معبد میں داخل ہو گئے، اور اپنے معالجہ پر خدائے بزرگ کا شکریہ اس خیال کے ماتحت ادا کیا کہ وہ ایک عیسائی گرجا میں جس کے پادری بظاہر راہِ رشد سے کسی حد تک منحرف ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کی اسلام سے واقفیت بالکل طبعی تھی بالخصوص اس لئے کہ سرزمینِ چین سے آخری مور صرف دس سال پیشتر دیس بدر ہوئے تھے۔ مگر مشرق سے وہ کلیئہ نا آشنا تھے۔ اس کے باوجود مشرق اس وقت سے کہیں پیشتر اپنے افسانوں کا انمول تحفہ مغرب کی نذر کر چکا تھا، جو ہندوستان سے دو بڑی بڑی قسطوں میں ارد ہوئے، ایک تو وہ جو لقمان کے منہ عیسوی سے پیشتر مرتب کئے، اور دوسرے وہ جو تراجم کی وساطت سے، از منہِ وسطیٰ میں عربی سے عبرانی، یونانی، اور ہسپانوی زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ مگر ان زبانِ زردافسانوں کے ہندی الاصل ہونے کا احساس اُس وقت کیا گیا جب کہ الافان ٹین نے ۱۶۷۷ء کے ایڈیشن میں اس امر کی وضاحت کی کہ اس کی جدید نظموں کی اکثریت بیدپائے ہندی افسانوں پر مبنی ہے۔

تاہم جب ہم مغربی لٹریچر پر مشرق کے تشقیقی اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی دوسری ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی جو یہودی کتب مقدسہ کے اثرات کے مقابلہ پر آسکے، جو زبان و معانی میں بالکل مشرقی ہیں۔ یورپ میں بائبل سب چیزوں سے بڑھ کر پڑھی جاتی ہے، اور یہ ایک خاص بات ہے کہ انگریزوں کے ہاں کوئی اپنے اساطیر نہیں، کوئی ایسی شے نہیں جو انہیں اوشان و اصنام کی جانب منسوب کرے۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ شاہِ آرتھر اور اس کی گول میز کا افسانہ ہے

جس میں یقیناً فرق العادۃ امور داخل ہو گئے ہیں۔ مگر دوسرے شمالی لوگوں مثلاً اہل سکندریہ نیویا اور اہل جرمنی کے اپنے باضابطہ اور خصوصی اساطیر ہیں جیسا کہ ان سے پیشتر یونانیوں اور رومنوں کے ہاں موجود تھے۔ ان اساطیر کی نمائش پہاڑیوں، دادلوں، اور دریاؤں پر ہوتی ہے جن سے کہ یہ لوگ مانوس ہیں، لیکن حکایات جن پر انگریز بچوں کی تربیت ہوتی ہے تو وہ عمدتاً قدیم کی کہانیاں ہیں جن کا تعلق محض تمدنی اور تعلیمی حالات سے ہے اور جو ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن سے کہ انگریز اپنے ملک میں مانوس ہیں۔ چنانچہ ہر حکایت کی تشریح بطور واقعہ و خیال کے کرنی پڑتی ہے اور ایسے لوگوں کی نصا ویر دکھانی پڑتی ہیں جو غیر مانوس مشرقی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ لہذا یہ امر محض فطرتی ہے کہ بائبل نے ان جزائر کی زبان اور لٹریچر کی تشکیل میں خاص طور پر بڑا کام کیا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرق نے مغرب پہ اپنے ادب و فنون کا اظہار نہایت متزل سے کیا، اور یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ ایشیائے مشرق کی صد ہا سالہ تجارت مشرقی تشقیف و تہذیب کا کوئی حصہ اپنے ہمراہ نہیں لائی، اور نہ ہی مشرق و مغرب کے شخصی اختلاف میں خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی یا کاروباری کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہے جس نے مذہب دنیا کے ان دو نصفوں میں کوئی باہمی تشخص پیدا کیا ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے چین اپنا ریشم تجارتی راستوں سے ایران میں بھیجتا رہا جہاں سے پھر وہی ریشم یورپ میں جاتا، مگر یورپ کو چین کے متعلق تیرہویں صدی کے وسط تک علی طور پر کوئی علم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ چین ایک ایسا ملک ہے جہاں سے ریشم آتا ہے۔

ساتویں صدی میں فاتحند عربوں نے یورپ پر حملہ کیا اور اس حملہ کا نتیجہ ایک حیرت انگیز کیفیت تھی، جس کی رو سے یورپ کے اکثر لوگ اسلامی حکومت کے تحت میں آ گئے، یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے مشرق و مغرب کے عام مفہوم کے ضمن میں، اور موجودہ سیاسیات یورپ پر ترکی اثرات کی ذیل میں، ہم پیشتر فراموش کر دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ پر عربوں کا پہلا حملہ ۶۶۸ء میں واقع ہوا یعنی حضرت محمد کی ہجرت مکہ کے صرف چھیالیس سال بعد چھوٹی صدی کے وسط سے پیشتر عربوں نے تمام کا تمام سپین اور پرتگال فتح کر لیا، اور یہ صرف چارلس مارٹل کی ذات تھی جس نے ان کی پیش قدمی کا سلسلہ ٹورن اور پاریس کے مابین روک دیا۔ سترہویں یورپ میں عربوں کی موجودگی کی اہمیت جو اپنی ادبی اور دماغی طاقتوں کے کمال پر پہنچے ہوئے تھے، ہم ایسے وقت میں قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے جب کہ یونان و روما کی تہذیب قریب قریب کا لحد مہو چکی تھی، اور جنوبی یورپ میں ان کی جگہ نئی اقوام لے رہی تھیں۔ پانچویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر روما کی سات پہاڑیوں پر قائم شدہ سلطنت کی مستحکم تعمیر آخر کار مغربی یورپ کے گوشہ گوشہ میں شمال کی غیر فزادہ اقوام کے ہاتھوں منہدم ہو چکی تھی، جن کی غیر معمولی طاقت اور ان گنت تعداد کا مقابلہ محض محال تھا۔ مذکورہ حملہ اور اپنے

مہراہ سوائے جسمانی طاقت کے تحفہ کے اور کچھ نہ لائے، اور یہ امر خلاف توقع تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کے علم و فن یا دیگر کمال کی قدر شناسی کا کوئی ثبوت پیش کرتے، چنانچہ سترہ و تک ہمارے سامنے کوئی ایسی نمایاں شخصیت نہیں آتی جس نے اسبق کی اہمیت کا اندازہ کیا ہو۔ شمالی اقوام کے مابین اشاعت عیسائیت نے جس کا آغاز پانچویں صدی کے خانہ کے ساتھ ہوا کلیسائی طبقہ کے علاوہ ان فاتح طبقات پر کوئی خوشگوار اثر پیدا نہیں کیا، اور یہ صرف چارلی مین کی ذات تھی جس نے پہلے پہل اپنے لوگوں کی وحشیانہ عادات اور طبعی بغاوت کو قومی اصلاح کے نظریوں سے مانوس کرنے کی سعی کی۔

بلٹنک و شبہ مشرق کا انگلستان پر اولین براہ راست اثر، اہل انگلستان کا حروب صلیب میں اشتراک تھا، جس نے یورپ کی آنکھیں اُس تہذیب پر واکردیں جس کا اہل یورپ کو خیال تک نہیں تھا۔ مشرقِ ادنیٰ و متوسط کی وہ تصویر جو عام لوگوں کے ذہن میں بارہویں صدی میں محفوظ تھی غالباً سرے سے غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ لٹریچر کی وساطت سے اسے مصر و ایران اور ہندوستان جیسے ممالک کے ناموں سے واقفیت تھی اور بائبل کے ذریعہ اُسے فلسطین اور عراق و عرب کے متعلق کچھ نہ کچھ علم تھا مگر ان واقعات کے متعلق جو ان ملکوں میں سلطنتِ روم کے نوال کے بعد رونما ہوئے اُسے غالباً کوئی علم نہیں تھا، سوائے اس مزعومہ امر کے کہ ساتویں صدی میں ایک جھوٹا نعوذ بالمدین ذالک (پیغمبر محمد نام کا پیدا ہوا ہے جو ان دنوں عیسائیوں اور یہودیوں کے مقامات مقدسہ پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ اس وقت عام طور پر لوگوں کا گمان غالباً یہ تھا کہ محمد کے پیروکار وحشی عرب ہیں، جن کے ہاں بہت کم یا سرے سے کوئی تہذیب و شائستگی نہیں۔ انہیں یقیناً کسی ایسے دربار کا خیال نہیں تھا جس کا صدرالصدور ایک بہادر اور مہذب حاکم ہے اور جس کے ہاں اکثر ممالک کے اہل علم و فن بکثرت آتے جاتے ہیں چنانچہ اُس حیرت مطلق کا تحلیل محض محال ہے جو اولین صلیبی جنگ آزاؤں کو اُس وقت لاحق ہوئی جب کہ انہیں ان برائے نام جاہلوں کی اہلیت کا علم و احساس ہوا۔ اس قسم کے جو جنگ آزاؤں و اٹلی کی سرزمین سے گزرے انہوں نے محسوس کیا کہ ان ملکوں کی پہلی شان و شوکت جاچکی ہے، مگر جب انہوں نے سرزمینِ شام میں قدم رکھا تو ایک ایسی طاقت کو اپنے جوبن پر پایا جس کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔ درحقیقت یورپ میں مشرق کے متعلق ذخیرہ معلومات لانے کا ذریعہ صلیبی جنگجو ہی تھے، مگر یہ ذخیرہ محض محدود تھا جو جزائی حیثیت سے صرف فلسطین، شام اور مصر تک مفید تھا، اور ترقی فی حیثیت سے اُس کی اہمیت یا تو بہت کم تھی، یا سرے سے تھی نہیں صلیبی جنگ آزاؤں کو بادیہ نشینوں سے تعلیم کی کوئی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ صرف انہیں یروشلم سے خارج کرنا چاہتے تھے، اور حتی الامکان انہیں لیا میٹ کر دینے کے متمنی تھے۔

سرزمینِ سپین پر ممکن ہونے کے بعد باقی یورپ پر عربوں کا فوری اثر مقابلۂ خفیف تھا، چنانچہ نویں اور دسویں صدی میں ہمیں ایسی بہت کم شخصیتوں کا علم ہے جن کا علمی مشغلہ عربی زبان کی تحصیل ہوا اور مین مثالوں میں سے نہایت مشہور مثال پوپ سلوٹرمانی رگر برٹ، پچیس کے اسقف اعظم کی ہے، جس نے دسویں صدی کے خاتمے اور گیارہویں صدی کے آغاز میں بحیثیت ایک عالم و فاضل کے خاصی شہرت حاصل کی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسے عربی اور عبرانی زبانوں میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ پوپ سلوٹر کے بعد فریڈرک ثانی کا نام ہے جو سنہ ۱۲۵۵ء میں فوت ہوا۔ فریڈرک ثانی بارباروسا اعظم کا پوتا تھا، اور اسے ازابلاد خضر شاہ جان کا خاوند ہونے کی حیثیت سے انگلستان سے گمراہ تعلق تھا۔ فریڈرک نے عربی تصانیف کے مطالعہ اور ترجمہ کی ترویج کے لئے بہت سہولتیں سکھائی۔ وہ میکائیل سکاکٹ کامرینی تھا، جس نے بولعی سینا کی ”نیچرل ہسٹری“ کا ترجمہ کیا۔ یہ امر تو ظاہر نہیں ہوتا کہ قریبہ یونیورسٹی کے بہت سے فضلا نے باقی یورپ کا سفر کیا ہو، مگر اس قدر یقینی ہے کہ بہت سے یورپین فضلا بالخصوص ڈینیٹے کے استاد برونیو لٹینی جیسے مورخ سپین کے عربوں اور یہودیوں کے زیرِ نظرانی تعلیم کے لئے گئے مگر ان تمام امور کے باوجود یہ صرف صلیبی جنگِ آراؤں کی ذات تھی جس نے پہلے پہل یورپ کو اسلام سے حقیقی طور پر روشناس کرایا۔ جب پیٹر راہب نے سنہ ۱۰۹۶ء میں پہلی صلیبی جنگ کی تبلیغ کی تو وہ ثقیف جو براہِ راست عیسائیت سے منسوب ہو سکتی ہے اُس وقت تک صرف کلیسا تک محدود تھی۔ اور عیسائی یورپ ابھی بچپن کے ابتدائی زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا، بحالیکہ اسلام جو ۶۰۰ برس پیشتر منصفہ شہود پر آیا، اس وقت سے قبل اپنے سیاسی عروج پر پہنچ چکا تھا، اور لٹریچر کا ادبی دور گزار چکا تھا۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی دس صدیوں میں خلافتِ عربیہ کے ارتقا کی سرعت اور ترقی عیسائیت کی سست و غبری کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں کیونکہ اس مقابلہ سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ کیونکر سزار سالہ عیسائی لوگیت کی نمایندہ امارت نے، ایسی شانِ تمدن سے محیط امارتِ اسلام کا مشاہدہ کیا جس کی نظیر انہیں اپنے گھروں میں نہیں ملتی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صلیبی جنگ آراؤں جو انگلستان واپس آئے کس قسم کے اثرات اپنے ہمراہ لائے اولاً تو ہم یہ امر تسلیم کر سکتے ہیں کہ اُن کی ذہنی کیفیت بہت حد تک وسعت پذیر ہو چکی تھی، اور وہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ بادِ نشینِ گوتیکر عیسائیت ہیں لیکن دوسرے پہلوؤں سے وہ ایسے ہی اچھے انسان ہیں جیسے کہ وہ خود بہادری میں اُن کے برابر اسلحہ میں ان کے ہم پلہ اور عسرت و امارت پسندی میں اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ صلیبی لڑائیاں جو ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ تک جاری رہیں، بطورِ خود ملک گیری کے کسی مزید اقدام کا موجب نہ بنیں اس لئے کہ اہل انگلستان نے مشرق میں اٹھارہویں صدی کے وسط سے پیشتر کسی قسم کی فوجی پیش قدمی شروع

نہیں کی۔ یہاں تک کہ مذہبی مقاصد کی جگہ تجارتی اغراض نے لے لی۔ علاوہ ازیں راس امید کی مشرقی راہ کے انکشاف کے وقت تک بحیرہ متوسط سے باہر تجارت کا کوئی عندیہ نہیں تھا۔ لہذا ہم اس امر کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ کے انگلستان کے مشرق سے تعلق کا نتیجہ محض عیش و عشرت، نمائش اور امارت کا اظہار تھا۔ چنانچہ اس دور میں انگلستان پر کسی تشفی اثر کا نشان نہیں ملتا کیونکہ چند ابتدائی تراجم کے قطع نظر مثلاً میکائیل سکاک کی بوعلی سینا کی نیچرل ہسٹری، یہ صرف علوم و فنون کی عام تجدید کے بعد تھا کہ عربوں کا سائنس اور فلسفہ لاطینی زبان کی وساطت سے اہل تدریس کے علم میں آیا۔ تاہم یہ امر طبعی ہے کہ مسلمانوں کے تشفی پہلو نے صلیبیوں پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا، اس لئے کہ ان کے ماں مذہبی اشتعال سے قطع نظر سوائے جنگ آزمائی کے اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

بارہویں صدی کے وسط میں یورپ میں افواہ اٹری کہیں اسلامی سلطنت کی حدود سے باہر ایک عیسائی خبر داز ماسی پیر سطر جان رہتا ہے جس نے بادیہ نشینوں کو تباہ کن شکست دی ہے۔ اس افواہ نے اس امر کی امید لائی کہ صلیبیوں کو ایک ایسا اتحادی مل گیا ہے جو مخالفین پر دوسری جانب سے حملہ کرے گا مگر اس امید نے عملی جامہ کبھی پہنا اس لئے کہ یہ افواہ مغالطہ پہنچی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ سال ۱۱۴۷ء میں سلجوق حکمران کو ایک ترکی شہزادہ کے ہاتھوں جس کی فوج میں بہت سے عیسائی ترک تھے شکست ہوئی، مگر ان ترکوں کو صلیبی جنگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، جن کے متعلق بہت ممکن ہے کہ انہیں کبھی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہو۔

یہ صرف تیرہویں صدی کے وسط میں مخلوں کا مشرقی یورپ پر حملہ تھا، اور اپنے وسط ایشیا کے گھروں میں اُن کی فوری واپسی تھی جس کا نتیجہ مشرق ادنیٰ سے اتر کر ایشیا کا حقیقی انکشاف ہوا، اور جس نے چین کا خشکی کا راستہ کھول دیا۔ اُس وقت مشرقی پادری لوگوں اور تاجروں نے اس امر کے انکشاف کی خاطر سفر کرنا شروع کیا کہ یہ عجیب و غریب اور ناقابل شمار نسل حملہ آور کہاں سے آتے در آنحالیکہ ساتھ ہی انہیں پیر سطر جان سے ملنے کی امید بھی تھی۔ چنانچہ جو بیانات یہ لوگ اپنے ہمراہ لائے، نہایت اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے، اور ان میں سے سب سے زیادہ مطلع نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ مشہور و معروف مارکوپولو کا بیان ہے۔

مارکوپولو وینس کا شہری تھا جو قیلاخاں کے عہد میں شہر یگینگ میں پہنچا اور کئی سال تک چین میں اقامت پذیر رہا اور اسی دوران میں منغل شہنشاہ کے زیر حکومت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ بالآخر وہ ایران کی راہ اپنے اصلی وطن کو مراجعت کر گیا جہاں وہ ہمدرد کے راستے ۱۲۹۵ء میں پہنچا۔

وینس پہنچنے پر منغل لباس میں لمبوس نووارد کو اُس کے ہم وطن پہچان نہ سکے، یہاں تک کہ اُسے خود اپنے مکان

میں بدقت داخلہ نصیب ہوا۔ مارکو پولو کے "اسفار" ہمیشہ غیر معمولی ہر دلہریزی کا باعث بنے رہے ہیں، اور چین کے متعلق یورپین استعجاب کی ابتدا بمقابلہ کسی دوسری کتاب کے صرف اسی سفر نامہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

مگر مشرقی "اسفار" کے متعلق کوئی تصنیف ہر دلہریزی میں اُس کمائی کا مقابلہ نہیں کر سکی جو سر جان منڈیول نے تالیف کی ہے اور جو مارکو پولو کے تقریباً پچاس سال بعد معرضِ ظہور میں آئی۔ صحیح ہے کہ اس کتاب کا نفسِ مضمون صرف مشرقِ ادنیٰ تک محدود ہے مگر بوجہ اپنے انتہائی غلو کے اُسے مطالعہ کرنے والے پسند کرتے تھے اور صدیوں تک اُسے حالات کا حقیقی سرقہ خیال کیا جاتا تھا۔ مگر جدتِ تحقیق کی روشنی میں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا منڈیول فلسطین سے آگے بڑھا بھی یا نہیں، اور یہ محض اسی نوعیت کی کتابوں کی وجہ سے کہ قدیم نقشہ کاروں کو اس بات کی ترغیب ہوئی کہ وہ مالکِ غیر منکشفہ کے نقشوں میں خیالی باشندے دکھائیں — ایسے باشندے جن کے دوسرے یونین ٹانگیں اور علیٰ ہذا القیاس، یا اثر ہاؤں کے سے خوفناک درندے۔ غلط افواہ کے برقی خرگوشوں پر حقیقت کے سگماتے مید انگن کا غلبہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، اور اگر ایسے خرگوش گرفت میں آجھی جائیں تو خرگوش و سگ ہر دو کو حرمان و یاس اور رنج و الم کا سامنا ہوتا ہے۔ بہر حال اس وقت سے آگے مشرقی "اسفار" کی کتابیں پڑھی جانے لگیں اور پرتگیزیوں کی ہندوستان اورابی سینیا میں ابتدائی پیش قدمیاں بے شمار نفیس و غریب بیانات کا موجب بنیں۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کی پہلی شائع شدہ کتاب اب پولو کے اسفارِابی سینیا کا ترجمہ تھا جس پر بعد میں سیلاز کی کمائی کی تعمیر ہوئی۔

لیکن مشرق کے حقیقی حکایت نامہ کا انکشاف یورپ پر "الف لیلہ" کے ترجمہ کی وساطت سے ہوا یہ ترجمہ جس کا اظہار پہلے پہل فرانسیسی میں اور چین بعد انگریزی میں ہوا، بعض کوائف میں یورپ کے لطیف چکر کی تائید کا اہم ترین مائع تھا۔ ہمارے لئے جو چین سے "ریش نیلگون" "علی بابا اور چالیس چور" کی حکایات سے مانوس ہیں اُس استعجاب کا اندازہ لگانا مشکل ہے جس سے یورپ والوں نے ان مسرت آمیز کہانیوں کا استقبال کیا۔ انہیں کہانیوں نے ان لوگوں کا خلفاء، شیوخ، جنات اور غفاریت کی ایک نئی دنیا اور اس قسم کے محلات اور ضیافتوں سے تعارف کرایا جن کا انہیں خواب و خیال تک نہیں تھا۔ ان حکایات نے بغداد و مصر کو محبت و نفاق اور عجائبات کے کرشموں سے از سر نو زندہ کر دکھایا۔

ان حکایات کی عربی اصل کو اول اول ایک فرانسیسی سیمپلینڈ نے جو محکمہ سیاسیات کا ملازم تھا دمشق میں پایا، اور بعد میں اُن کا ترجمہ بھی شائع کیا جو متعدد افسانہ میں شائع اور شائع کے مابین اشاعت پذیر ہوا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد لندن میں ایک گنام انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ ان حکایات کو فوری کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ سر جیمس سٹیورٹ، بکلائٹ

کے لارڈ ایڈووکیٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک ہفتہ کی شام کو اپنی لڑکیوں کو "الف لیل" پڑھتے دیکھا سر جیمز نے اُن سے کتاب چھین لی، مگر دوسری صبح خود لارڈ ایڈووکیٹ اپنی لائبریری میں اس حالت میں سوئے پائے گئے کہ کتاب اُن کی بغل میں تھی، یعنی یہ کہ وہ اس کتاب کو سبت کے دن طویل عرصہ تک پڑھتے رہے تھے۔

تاہم اُس زمانہ تک جب وارن ہیڈنگو ہندوستان کے گورنر جنرل بنے اس سرزمین کی قدیم زبان اور لٹریچر نے مغربی اہل علم کی خاص توجہ حاصل نہ کی۔ وارن ہیڈنگو کا یہ خیال صحیح تھا کہ ہندوستانیوں پر انصاف و ہمدردی سے حکومت کرنے کے لئے ان کے اپنے قوانین اور رسوم سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ سنسکرت لٹریچر کی تشریح کے بلند پایہ کام کے ضمن میں دو ممتاز نام سر ولیم جونز اور کولبرک ہیں۔ سر ولیم جونز تو ایشیا ٹیک سوسائٹی آف بنگال کا بانی ہے، اور کولبرک نے سنسکرت کے کئی متون شائع کئے۔ ان انگریز فضلا نے جس کام کی ابتدا کی فرانس اور جرمنی کے فضلا انہماک سے اُس کے درپے ہو گئے، اور علم الاسناد (فلا لوجی) کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاہم یہ صرف ایف ڈبلیو میکس ملر کتب شرقیہ کا ایڈیٹر تھا، جس نے عہد و کثور یا میں سنسکرت لٹریچر اور فلا لوجی کی ترویج کی خاطر سردوسرے فاضل سے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔

جونہی کہ لوگوں نے سنسکرت زبان میں ضبط شدہ لٹریچر کی فراہمی اور مطالعہ کا کام شروع کیا، انکشافات کے وسیع اور جدید میدان کھل گئے، اور مذہب و فلسفہ کے علوم میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ہمارے لئے یہ امر مشکل ہے کہ ہم اُس اثر کی تشخیص کریں جو یورپ کے فضلا پر ایک قدیم تحقیق و تہذیب کے انکشاف سے مترتب ہوا۔ ایسی تحقیق و تہذیب جس کے وجود کا انہیں علم تک نہیں تھا، جو بلند پایہ ادبی اور فلسفیانہ نوعیت کی بے شمار تصانیف پر مشتمل تھی اور جو اعلیٰ صنف کی شاعری اور ڈراما کے علاوہ، دماغی اور اخلاقی علوم اور فنون و قانون سے متعلق وسیع تصانیف پر حاوی تھی، چنانچہ بعض پہلوؤں میں اُس کی کامیابی یونانیوں کی کامرانی سے حقیقتاً پیش پیش تھا۔

متقابل فلا لوجی کا باقاعدہ مطالعہ جس کا حصول سنسکرت کے انکشاف سے ممکن ہو گیا اُن تمام مروج نظریوں کے مکمل اعادہ کا موجب بنا، جو بنی نوع انسان کی اصل سے متعلق تھے یعنی ایسے نظریے جو اس وقت تک شہرِ بابل میں اختلافِ السنہ کے افسانہ پر مبنی تھے۔ اس طرح پر مشرق نے، جس نے خود کو مغرب پر اس تہل سے منکشف کیا، آخر الامر اپنے سب سے گراں مایہ راز یعنی ہندوستان کو عیاں کیا۔

فیض احمد

نشاطِ روح

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
 ہوں کامیابِ دید بھی مہرِ دید بھی جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا
 یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے گلستاں بنا دیا
 کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں کچھ جم کے رہ گیا اُسے حرام بنا دیا
 اے شیخ وہ بیطِ حقیقت ہے کفر کی کچھ قید و رزم نے جسے ایماں بنا دیا
 اک بق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن آج اُس کو حسن و عشق کا سماں بنا دیا
 وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا
 ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھتے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
 کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا
 کیا کیا قیود دہریں ہیں اہلِ ہوش کے ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اس طرح کی جنوں میں یہاں زندگی بسر
 خود زندگی کو میں نے پشیاں بنا دیا

مبادئی سیاسیات

باب ۷

حکومت کا دائرہ عمل

پہلے باب کے عنوان موسومہ ملکیت کے تحت بتایا گیا تھا کہ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے کہ افراد کے حق مالکانہ اور ان کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیداوار دولت میں بہت کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائیگاں جاتے ہیں، لہذا عالمین پیداوار پر حکومت کا پورا قابو ہونا چاہئے، اور سرمایہ وزمین دونوں مملکت ہی کی ملوکہ ہونی چاہئیں یہ اصول محض ضمنی طور پر بیان کیا گیا تھا اور اُس وقت بحث و تحقیق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ موجودہ باب میں اس اہم بحث پر غور کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ آج کل دنیا کی فضا جن طبقہ داری نزاعات کی وجہ سے مکدر ہو رہی ہے اُن پر ٹھنڈے دل سے تبصرہ کیا جائے۔

ملکیت اور حکومت کی مداخلت۔ اشتراکیت اور اس کے جوابی اصول انفرادیت کا مسئلہ دراصل افراد و ملکیت کے باہمی تعلقات، اور افراد کے کاموں میں ملکیت کی مداخلت کا مسئلہ ہے۔ اس میں نو مشہور گنجائش نہیں کہ ملکیت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، اور چونکہ ملک کی تمام منظم قوت اُس کی پشت پناہی کے لئے حاضر ہو سکتی ہے اس لئے بظاہر وہ ایسی مطلق العنان فرمانروا ہے جس کا حکم گویا قانون ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی کن کن مصروفیات اور امور میں عمال حکومت کو معمولی طور پر مداخلت کرنے کا اختیار ہونا چاہئے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ریاست یوٹاہ میں ہر شخص جتنی عورتوں سے چاہے نکاح کر سکتا ہے، لیکن شرع اسلامی کی رو سے کسی مرد کو چار سے زیادہ

۱۵ اس باب میں بہت سی معاشی اصطلاحات کو استعمال کرنا پڑا ہے۔ سیاسیات اور معاشیات دونوں علوم عمرانی ہیں، اور ان میں جو باہمی رشتہ ہے اُسے باب ۱۱ ہمایوں فروری ۱۹۲۸ء میں واضح کر دیا گیا ہے۔ زمانہ حال میں ان دونوں علوم کا تعلق پہلے سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ باب میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان معاشی اصطلاحات سے گریز کیا جائے لیکن بعض مرتبہ اس سے مفر نہیں ہو سکا۔ ”دولت“، ”اصل“، ”زمین“، ”عالمین پیداوار“، ”آجاریہ“ اور دوسری معاشی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے دیکھو، ایلاس برنی کی کتاب ”دعالم المعیشت“۔

نکل جانے کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی جب وہ اپنی ہر ایک ہوی کے ساتھ مکمل مساوات کا سلوک کر سکے؛ پھر اکثر ممالک یورپ میں کسی فرد کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کرے تو وہ گرفتاری تصور کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عاقل حکومت اکثر ممالک یورپ میں افراد کے حقِ مناکحت میں نسبتاً زیادہ مداخلت کر سکتے ہیں، اسلامی شرع کی رو سے اس سے ذرا کم، اور یونان جیسی ریاست میں انہیں اس نوع کی مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے انگلستان میں جہاں جبری تعلیم کا قانون رائج ہے اگر کوئی شخص اپنے بچے کو جس کی عمر ایک خاص حد سے تجاوز کر چکی ہو، مدرسہ نہ بھیجے تو اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں حکومت کسی شخص کو جبراً اپنے بچے کو مدرسہ بھیجنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

انفرادیت اور اشتراکیت۔ اگر انفرادیت اور اشتراکیت کو اجمالی طور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کی مداخلت کو فرد کے حق میں برائے تصور کرتے ہیں اور اُن کا یہ خیال ہے کہ اُس کی غیر ضروری دست اندازی سے انسان کی آزادی میں رخنہ پڑتا ہے؛ تاہم اُن کے نزدیک چونکہ معاشرۃ انسانی ہنوز اُس پایہ کمال کو نہیں پہنچا کہ بغیر بیرونی دباؤ کے انسان کی زندگی، حقوق اور مملو کات مامون و محفوظ رہ سکیں اس لئے حکومت کے بغیر جارہ کار بھی نہیں۔ بدین سبب اس کی ضرورت ہے کہ جس وقت ان عناصر حیات میں سے کوئی بھی معرضِ خطر میں آئے تو حکومت مداخلت کر کے نقصانِ رسال کو کثیر کردار کو پہنچائے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بھی دست اندازی کرے جو صرف اُچا خود فرد کے جیلۂ اقتدار میں ہوں، جیسے تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ، اس لئے کہ انفرادیوں کی دست میں ہر شخص کو ان کے طے کرنے کا کھیتۂ حق حاصل ہے، چنانچہ ایسی حالت میں بیرونی مداخلت بے کار بلکہ شاید نقصان رسال ثابت ہوگی۔

اس کے برعکس اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ انسان ہرگز اپنے مفاد سے کما حقہ واقف نہیں ہوتا اور اس کے اور مملکت کے اغراض میں بعض مرتبہ جو تضاد پایا جاتا ہے اُس کے نتیجے بد کے انداد کے لئے مملکت کی مداخلت لازمی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انفرادی معاشرہ میں اصولِ مقابلہ کی ترویج کے باعث انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے، اور چونکہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ بیک وقت انجام دیتے ہیں اس لئے کوئی بات بھی خاطر خواہ انجام کو نہیں پہنچتی۔ اُن کی دانست میں بہترین مملکت وہی ہے جس میں اپنے پرانے کا سوال باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں مملکت ہی کی سمجھی جائیں اور محنت پر اُسی کی کھیتۂ دسترس ہو۔ مکمل اشتراکی مملکت میں نہ خانگی زمینداریاں ہوں گی نہ خانگی گرنیاں اور میں، نہ خانگی مدارس و کارخانجات، بلکہ جس قدر بھی عالمین پیداوار میں سب کے سب حکومت ہی کے

دست نگر ہونگے، ہر ایک فرد کو یا مملکت ہی کی طرف سے کام کرے گا اور حکومت ہی کے مقرر کردہ معیار و ضوابط پر اس کی فوت بسر ہی ہوگی۔

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ انسانی معاشرہ میں نہ تو مکمل اشتراکیت کا راج ہو سکتا ہے نہ مکمل انفرادیت کا، چنانچہ جس اصول پر آج کل عام طور سے اکثر ممالک میں عمل کیا جاتا ہے وہ خذ ما صنفی ودع ما کد رکا اصول ہے۔ محض عقیدہ پرستی سے علوم عمرانی میں کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ مختلف ممالک دراصل افراد ہی کے مجموعے ہیں اور افراد میں بے حد تنوع پایا جاتا ہے اور ملک کی معاشی، جغرافی و سیاسی کیفیات بھی جدا گانہ ہوتی ہیں۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ کسی ملک میں فرد کی باگ بالکل چھوڑ دی جائے نہ یہ کہ فرد کے ہر ایک معاملے میں حکومت متعلق طور پر مداخلت کرتی رہے۔ انفرادی ممالک میں آسانی اسی میں تصور کی گئی ہے کہ تار، ڈاک اور ایک بڑی حد تک تعلیم و حفظانِ صحت کا کام حکومت اپنے ذمہ لے لے اور کارخانوں وغیرہ کی نگرانی کرتی ہے، اُدھو دوس جیسے اشتراکیت پسند ملک میں یہ نامکن ہو گیا ہے کہ بلا شرکت غیر سے حکومت ہی براہ راست زمیندار، سرمایہ دار اور کارخانہ دار بنی ہے۔ گویا فی الجملہ آج کل کے زمانے میں اکثر ممالک کا مطمح نظر یہی ہو گیا ہے کہ محض عقیدہ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر ایک طرف تو افراد کی ذاتی و خانگی آزادی کے دائرہ کو حتی الامکان وسیع کر کیا جائے لیکن ساتھ ہی حسب ضرورت ملک کی بہبود و مفاد کی خاطر حکومت مداخلت کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔

انفرادیت۔ اب ان اصول پر ذرا غائر نظر ڈالئے۔ انفرادیت کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب قدیم تجارت کے ساتھ ساتھ حکومت کی مداخلت و نگرانی کے خیالات زائل ہو رہے تھے۔ آدم سمٹھ، فون ہمبولٹ اور ہربرٹ اسپنسر نے اس اصول کو پیش کر کے اس سے مختلف النوع استدلال کئے۔ انفرادیت کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر ایک فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اُس وقت تک پوری آزادی ہونی چاہئے جب تک یہ عیاں نہ ہو جائے کہ اس کی آزادی کسی دوسرے کو گزند پہنچتا ہے۔ معاشرہ انسانی کی بنیاد خود غرضی پر ہے، اور ہر ایک شخص اپنی غرض کو دوسروں کی بنسبت بہتر پہچان سکتا ہے، چنانچہ جس قدر بیرونی اور مصنوعی روکاوٹیں کم ہونگی اتنا ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب

۵۲ ”جو اچھا ہو اسے رکھ اور جو برا ہو اسے چھوڑ“

۵۳ دیکھو باب ۵، رسالہ ہمایوں، جون ۱۹۲۸ء

۵۴ آدم سمٹھ، ”دولت اقوام“ Adam Smith: Wealth of the Nations

۵۵ فون ہمبولٹ، خیالات متعلق تحدید دائرہ حکومت Humboldt: Greunzer der Wirksamkeit des Staats

۵۶ ہربرٹ اسپنسر، ”فرد بمقابلہ مملکت“ Herbert Spenser: Man versus the State

ہوگا۔ یہی نہیں، بلکہ ہر فرد کے حصول مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی بہبود مد نظر ہوتی ہے اس لئے کہ آخر افراد ہی سے تو معاشرہ ترکیب پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبود کے لئے کوشش کرے گا تو مختلف افراد کے مابین مقابلہ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کی اعلیٰ ترین قابلیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور اس میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے گی۔ نیز اس مقابلے کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جو افراد فطرتاً قابل ہیں یا ماحول کے باعث ان کی فطری اہلیت زائل ہو چکی ہے وہ یا تو پس پشت چلے جائیں گے ورنہ فنا ہو جائیں گے جس کی وجہ سے معاشرہ کو بقائے اصلح سے فائدہ پہنچے گا۔ الغرض افراد یوں کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ افراد کے کاموں میں حکومت بے ضرورت مداخلت کرنے سے باز رہے اور صرف انہیں کاموں کی نگرانی رکھے جو افراد کی جان، مال اور آزادی کے لئے ضروری ہیں۔

اگر نظریۂ انفرادیت پر تنقیدی نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں بہت جلد اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت مل جائیگا۔ سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی گویا بنیاد ہے یہ ہے کہ نہ صرف ہر ایک فرد کو اپنی بہبود مد نظر ہوتی ہے اور وہ اس کے لئے کما حقہ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس کا اہل بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد یوں کا یہ خیال بالکل خام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عقل انسانی مکمل نہیں، اور روزمرہ اس قسم کے سینکڑوں اوقات پیش آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کھلے اپنے پاؤں میں جان بوجھ کر کلہاڑی مار لینا بالکل معمولی بات ہے۔ اگر وہ اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہوتا اور اس کے حصول کے ذرائع سے بھی واقف ہوتا تو پھر ہم کسی کو ناکامی یا عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نہ دیکھتے پھر بات غلط ہے کہ افراد اور مملکت کے اغراض ایک ہی ہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بعض مرتبہ جس چیز میں بظاہر افراد کا مفاد نظر آتا ہے اس میں ان کی اجتماعی کینڈیت یا مملکت کا مفاد مضمر نہیں ہوتا۔ اگر یہ اجتماعی کیفیت قائم رکھنی ہے (اور اس سے مغر بھی نہیں) تو پھر دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھنا پڑے گا۔ اور مملکت کو بھی اس کے ارتقا اور اس کے اغراض کے حصول کے لئے اسی طرح سے آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچانی پڑیں گی جیسے خود افراد کو۔ نظریۂ انفرادیت پر تیسری تنقید یہ کی جاسکتی ہے کہ انفرادی جس ”آزادی“ کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا تعین مملکت کی اثباتی مداخلت کے بدون ناممکن ہے اور فطری آزادی و حقوق کیسے ہی دل خوش کن

عَلَىٰ أَنْ تَكُوْهُنَّ أَوْ يَخْتَارُوا حَتَّىٰ أَنْ تَبْغُوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (قرآن مجید، سورہ بقرہ، کوع ۱۰)

۵۵ باب ۱۰ (ہمایوں، فروری ۱۹۲۹ء)

۵۶ باب ۱۳ (ہمایوں، اپریل ۱۹۲۹ء)

خیالات کیوں نہ ہوں، بغیر اس اثباتی مداخلت کے اُن کی بنیاد محض ہوا پر ہے۔ آخری دلیل جو انفرادیت کے موافق پیش کی جاتی ہے وہ بقائے اصلح کی ہے، اور اس کا سب سے بڑا موید ہر برٹ پسند ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرہ انسانی کی حقیقی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلے کے ذریعے سے پیش پیش ہو جائیں اور بدترین فنا ہو جائیں۔ نظا ہر یہ خیال بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے کار فرد باقی نہ رہے جو ماتھے پاؤں ہلکا بغیر دوسروں کا گویا پیٹ کا ٹکڑا کھاتا ہو، لیکن ذرا غور کرنے سے یہ نظریہ بالکل بے اصل معلوم ہونے لگتا ہے۔ لول تو پسند کا یہ خیال ایسے جانوروں سے اخذ کیا گیا ہے جن میں اپنی اسلحہ کی اہلیت نہیں، دراصل لیکہ انسان ان جانوروں سے متنازع ہے۔ اور وہ ہر آن اپنی حالت کو بہتر کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی بہرے، اندھے، گنگے، لولے اور اپانچ، جنہیں شاید پسند دریا برد کر دیتا، معاشرہ کے مفید عناصر بن گئے ہیں، اور وہ جنہیں فطرت کی طرف سے جملہ قوائے جسمانی عطا ہوئے ہیں ہر لحاظ اپنی اور اپنے ماحول کی حالت کو سدھارنے میں مشغول ہیں۔ جب واقعی صورت حال یہ ہے تو پھر جانوروں کی عادات و خصائل سے استلال کرنا اور بنی نوع انسان کو گردن زدنی قرار دینا کہاں تک مناسب ہے۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مقابلے کی ترویج سے بد فنا ہو جاتے ہیں اور نیک باقی رہتے ہیں، دراصل لیکہ حقیقت اس سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو مزید معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، اور پھر جو شخص مقابلے کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے وہ اگرچہ انسانی اعتبار سے قابل ترین ہو، لازماً بہترین نہیں ہوتا، اس کے وسائل اور اس کا دائرہ نظر نسبتاً تنگ ہوتا ہے دراصل لیکہ اجتماعی انتظامات کی شکل میں یہ دائرہ وسائل کی فراوانی، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کے باعث وسیع تر ہو جائے گا۔

انفرادیت جدیدہ۔ حال کے زمانے میں دوسرے سیاسی نظریوں کی طرح انفرادی نظریہ نے بھی چولہا بدلا ہے اور بالخصوص پچھلی جنگ عظیم کے بعد اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلی ظہور میں آئی ہے۔ دوران جنگ میں اور اس کے بعد تقریباً ہر ملک میں دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت اور دوسرے حکومت کے علاوہ دیگر ادارات کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش آئی کہ مرکز گزیر قوتوں کا یا تو خاتمہ کر دیا جائے ورنہ حکومت کسی نہ کسی طرح سے ان پر حاوی ہو جائے، چنانچہ نئے نئے محاصل جاری ہوئے، قوانین

تعمیق قومی نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ممالک میں ہر ایسے شخص کو جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھا، بھرتی ہونے پر مجبور کیا گیا، خانگی کارخانوں اور گریو میں، جن میں پہلے روزانہ استعمال کی اشیاء بنائی جاتی تھیں، سامان جنگ اور گولا بارود بننے لگا۔ الغرض ہر جگہ حکومت کی نگرانی ہونے لگی اور حکومت کے عامل ہر موقع محل پر نظر آنے لگے۔ اس صورت حال کے خلاف رد عمل ہونا لازمی تھا، چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی دست برد اور مداخلت سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی اور بڑی بڑی قومی انجمنوں اور ادارات نے خود اپنے مضابطوں اور قاعدوں کا نفاذ کر کے یہ دکھا دیا کہ ترتیب اور تنظیم محض حکومت کے جبر ہی سے برقرار نہیں رہتی بلکہ اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انہیں معاشی کینیات سے انفرادیت جدیدہ جنم لیتی ہے۔ اول تو اکثر ملکوں کے باشندوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ عقیدہ پرستی اور علی سیاسیات دو مختلف النوع باتیں ہیں، اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ انفرادی اور اشتراکی عقیدہ پرست کچھ ہی کہتے ہیں، ہر ملک کا سیاسی ارتقا اس ملک کی سیاسی کیفیات کے مطابق ہوتا ہے گا۔ ایک مسلک یہ بھی قائم ہو گیا کہ مملکت کو محض افراد کی بجائے ان کے مجموعوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور جس طرح ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وقت آنے پر ہم اپنے ملک (یعنی اپنے مخصوص جغرافیائی رقبہ پر اپنی جان تک قربان کر دیں، اسی طرح دوسرے ایسے ادارات بھی ہیں جن کے واسطے ممکن ہے کہ ہمیں قربانی کرنی پڑے؛ وہ ادارات ہمارا مذہب، ہمارا مدرسہ، ہمارا ”دائرہ“، ہمارا اتحاد و تجارتی وغیرہ ہیں۔ جدید افراد کیوں کا یہ قول ہے کہ اگر مملکت اور ان قومی یا مذہبی عالمگیر ادارات کے مابین تصادم ہو جائے تو استقرائی اعتبار سے کوئی وجہ نہیں کہ مملکت ہی کو فوقیت حاصل ہو، اور موجودہ صورت حال میں ان ادارات کو نظر انداز کر دینا کسی طرح سے مناسب نہیں ہے۔ جدید افراد کیوں کے نزدیک مملکت کی بابت زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ جملہ مجموعہ جات انسانی کی ایک عمدت یا وفاقت ہے، جس کے ذریعے سے ان ادارات کے مابین ایک قسم کی ترتیب و تنظیم پیدا ہو جاتی ہے، لیکن ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مملکت کو فی نفسہ کسی قسم کا ایسا تفوق حاصل ہے جس کے باعث اسے ان ادارات کو فنا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

۱۱۱ جدید نظریوں کے متعلق جو ڈک کی کتاب ”زمانہ حالیہ کے نظریات سیاسی“ Joad: Modern Political Theory نہایت بسیط اور پرمعلومات ہے۔

۱۱۲ اس خیال اور اس کا نظریہ اقتدار اعلیٰ سے جو تعلق ہے اس کے لئے دیکھو لاسکی: ”مسئلہ اقتدار اعلیٰ“ Laski: The Problem of Sovereignty باب ۱۔

نراج - اب انفرادیت کی انتہائی شکل یعنی نراج کے اصول پر نظر ڈالئے۔ عام طور پر نراج کے معنی اعدائیت کے لئے جاتے ہیں، اور ان دونوں لفظوں سے شنشائیت پسندوں نے اپنا جو کام نکالا ہے۔ اس کے باعث ہم نہیں بالالتزام انقلابی سمجھنے لگے ہیں۔ جہاں کہیں کسی بدبخت نے کوئی ہم پھینکا، جہاں کسی سیاسی جرم کا ارتکاب کیا گیا، بس "نراج"۔ "نراج" کی صدائیں ہوا میں چکر لگانے لگیں، اور چونکہ عام طور پر اس قسم کے حالات سے کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی کہ آخر نراج کے معنی کیا ہیں اور یہ ہم واقعی کئی اجی نے پھینکا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ "نراج" کے معنی عدم حکومت کے ہیں، اور اس کے موید یہ چاہتے ہیں کہ انسانی قوائے ذہنیہ و جسمانیہ میں کچھ اس قسم کا ارتقا ہو جائے کہ جبر و اکراہ بالکل غیر ضروری ہو جائے اور افراد و مجموعہ جات افراد بدون کسی بیرونی دباؤ کے جملہ کاروبار زندگی انجام دے سکیں۔ ان کے نزدیک نیابتی حکومت ایک بڑے بھاری مغالطے پر مبنی ہے، وہ یہ کہ سیاسیات میں اصول نیابت کا انطباق ممکن ہے، یا کوئی شخص کسی مصلحتی رقبے کی آبادی کا نائب بن سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی دانا و بینا کیوں نہ ہو، ہر ایک امر میں رائے دینے کا اہل نہیں ہو سکتا، نہ یہ ممکن ہے کہ "مختار" اپنے "اصل" سے ہر ایک معاملے میں استفسار کیا کرے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ حکومت بے کار بھی ہے، اس لئے کہ تعلیم اور حفظانِ صحت ہی نہیں، بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں اور مجموعوں کے ذریعے سے کی جاسکتی ہے؛ مثلاً ان کا یہ قول ہے کہ تاسیخِ دنیا پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی حملہ آور اکثر ملک کی منظم فوجوں کے مقابلے میں ان پر سبقت لے جاتے ہیں اور انہیں آخر کار شہر لوں کے ایسے اختیاری مسلح گروہوں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ چھپ کر ان پر گولے برساتے ہیں۔ بہر حال نراجیوں کے نزدیک اگر مملکت اور حکومت کا ہاتھ اٹھا لیا جائے تو کاروبار و مختلف امور کی کارفرمائی بالکل موجودہ زمانے کی طرح سے ہوتی ہے۔ صرف فرق یہ ہوگا کہ ملک میں بجائے مقابلہ عناد اور دشمنی کے محبت اور اتحاد و اتفاق کا راج ہو جائے گا۔ ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم باقی رہے گی لیکن جبر کا عنصر بالکل اٹھ جائے گا۔ ان کا سب سے بڑا گروہ و پوئلکھن کتنا ہے کہ تم اگر مجھ سے موسکو جاؤ تو تمہیں بیسیوں ملکوں اور شرکتوں کی دلیوں میں سفر کرنا پڑے گا جنہیں لاکھوں کروڑوں روپے نے بنایا ہوگا، لیکن جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسرِ اقتدار واحد قوت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی ان کے نزدیک فرد صرف اسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتا ہے جب بساطِ سیاسی سے مملکت اور حکومتوں

ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں فرد کو ملکیت اور سرمایہ دار دونوں کے جوئے سے آزادی حاصل ہو جائے گی اور امریکی ان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ سے انجام پایا کریں گے۔

اتحادیت۔ اشتراکیت کی طرف رجوع ہونے سے پیشتر ہمیں ایک اور تحریک کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے اور وہ اتحادیت ہے۔ اتحادیت کی ابتدا فرانس میں ہوئی، اس کا بانی مبانی پرودھوں تھا جس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دنیا کی جملہ حکومتوں میں دراصل طبقہ اوسط یا طبقہ اعلیٰ برسرِ اقتدار ہے، اور یہی دو طبقے ملک کی افراطی دولت میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں۔ اس کے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ وہی طبقہ جو پیداوار دولت کے لئے اپنا عزیز وقت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے (یعنی مزدور) سیاسی حقوق سے ایک بڑی حد تک محروم ہے۔ اتحادی کہتے ہیں کہ حکومت کے تشکیل کو بالکل غائب کر دیا جائے اور اس کی جگہ تمام سیاسی قوت اتحادات تجارتی کے ساتھ وابستہ ہوتا کہ مزدور ہی معاشرہ سیاسی کے رہبر اور روح رواں ہو جائیں۔ معاشی اعتبار سے اتحادیت اشتراکیت کا عکس ہے، اس لئے کہ جہاں اشتراکیت میں "مصارف کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے وہاں اتحادیت "آجر" کو معاشرہ کا اہم ترین عنصر قرار دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مرکزی روایات کے باعث ضرورت سے زیادہ یکسانی، روزمرہ کا بے جان چکر، جدت کا فقدان اور بے اعتباری کے احساسات نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو صریح نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں پارلیمنٹیں قائم ہیں وہاں مزدور فریق کے ارکان ورسٹل اپنے ہم خیالوں کے قائم مقام نہیں بلکہ اپنے اپنے حلقہ جات انتخابات کے قائم مقام ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بالکل دست و پا بستہ ہوتے ہیں اور مزدوروں اور آجروں کی بہبود کے لئے چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے اتحادی جانتے ہیں کہ کسی ملک میں نسبتاً کم ایسے لوگ ہونگے جو اتحادیوں کے ہم خیال ہوں، لیکن اتحادی کہتے ہیں کہ عہد ارتقا میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کو راہِ راست پر لایا جائے جس کے لئے کسی کثرت رائے کی ضرورت نہیں بلکہ حکومت اور اصل داروں کو با "عجل براہ راست" یعنی ہڑتال، مقاطعہ، غیر ضروری تعویق کا وغیرہ کے ذریعے سے دباؤ ڈال کر اپنا کہا منوایا جائے۔

نراج کے نظریہ کو کسی نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا، اور اس کا سب سے بڑا سقم یہ معلوم ہوتا ہے کہ (جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے) بلاشبہ انسان خود غرض ہے، افراد اور مجموعوں کے باہمی اغراض میں یقیناً تضاد ہوتا رہتا ہے، اور اس تضاد کو رد کرنے کے لئے محض اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات ہرگز موثر نہیں ہو سکتے

اگر چوری کے انسداد کے لئے ایک انجمن، قاتل کو سزا دینے کے لئے دوسری انجمن، اور قرضہ کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے تیسری انجمن قائم کی گئی تو پھر جس انجمن کی قوت دوسری انجمنوں سے بڑھی ہوئی ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لے گی اور دوسری "اختیاری انجمنوں اور ادارات کو اپنا مطیع کر لے گی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حاکمیت و حکومت کے اصول بھرے ہوئے ہیں اور کسی نظریہ ساز کی تحریر یا محض عقیدہ پرستی کی وجہ سے اُس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت اتحاد دیت کی بھی ہے۔ اتحادی چاہتے ہیں کہ تمام اتحادات تجارتی، باہم متفق ہو جائیں اور یہ جدید "وفاقیت" حکومت کی جگہ حاصل کر لے۔ ظاہر ہے کہ جب اس وفاقیت کو حکومت کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور وہ شہریوں سے اپنے احکام جبراً منوانے لگے گی تو پھر موجودہ حکومت میں اور اس میں کونسا ایسا بڑا فرق رہ جائے گا جس کی وجہ سے موجودہ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش ضروری سمجھی گئی ہے۔

اشتراکیت۔ افرادیت کا مفہوم سمجھنے کے بعد اشتراکیت کی طرف آئیے اور سب سے پہلے اشتراکیت کے ابتدائی نظریہ کو لیجئے۔ اشتراکیوں کا سب سے بڑا گرو اور اشتراکی نظریے کا موجود کارل مارکس ہے جس نے اپنی کتاب "موسمہ دراصل داری" کو ۱۸۴۷ء میں جرمنی میں شائع کرایا۔ صنعتی و سیکانیک انقلاب کی وجہ سے ایک طرف تو دولت و زور و نسبتاً کم تعداد لوگوں کے قبضے میں چلی جا رہی تھی اور بڑی بڑی شرکتوں اور عظیم الشان کارخانوں کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا، اور دوسری جانب اسی دولت کی وجہ سے اصل داروں کی پیٹھ بھاری اور بچائے مزدوروں کی کم بائگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارل مارکس نے انہیں اثرات کے تحت اپنی کتاب لکھی جس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و نقائص کا انسداد صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ موجودہ معاشرہ کی ابتدائی بنیاد یعنی خانگی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی بجائے مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ بلاشبہ ہر قسم کے کاروبار کے لئے اصل کی ضرورت ہے، لیکن اصل کی ملکیت افراد کی بجائے مملکت کے ساتھ وابستہ ہونی چاہئے، جو افراد کی اجتماعی کیفیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ مملکت کا مقصد عظیم یہ ہونا چاہئے کہ اصل کو محض کسی چھوٹی سی جماعت کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ تمام معاشرہ کی فلاح کی غرض سے استعمال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ مملکت کے قبضے میں آجائے گا تو مملکت ہی اُسے کام میں لائے گی جس کی وجہ سے مقابلہ جیسے نقصان رساں عنصر کا سد باب ہو جائے گا، اور بجائے چند چنے ہوئے لوگوں کے تمام معاشرہ ملکی کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہونگے نہ صرف یہ بلکہ اشتراکیت کے رولج سے خود افراد

کی عام اخلاقی حالت بھی سدھ جائے گی اس لئے کہ وہ محض اپنی ذاتی اغراض کو ملحوظ رکھنے کی بجائے ملک کے معاشری مفاد کے حصول میں کوشاں ہونگے۔ ان تمام انتظامات کے واسطے مملکت کی دست اندازی لازمی ہے، اس لئے کہ وہ افراد کی فلاح و بہبود سے خود ان سے کمیں زیادہ واقف ہوتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے حکومت کو جلد عالمی پیدوار پر خاص نگرانی رکھنی پڑے گی، کارخانوں کا انتظام کرنا پڑے گا اور ہر شخص کے واسطے اس کے کام کے مطابق آرام و آسائش کا انتظام کرنا پڑے گا۔

اجتماعیت یہ تو ابتدائی اشتراکی نظریہ ہوا، لیکن پچھلے اسی برس میں دبا لخصوص جنگ عظیم کے بعد اس میں بہت کچھ تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں گو اب بھی ان سب کا دار و مدار کارل مارکس کے خیالات ہی پر ہے جس خیال کا سب سے زیادہ تعلق ابتدائی اصول کے ساتھ ہے وہ اجتماعیت ہے، اور اس کے موید صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر ہر ملک میں بتدریج پیدا کیا جائے تا آنکہ حکومت کی کل اشتراکیوں کے قبضے میں آجائے۔ اس کے لئے مغربی یورپ کے ہر ملک میں باضابطہ اجتماعی سیاسی گروہوں کو منظم کیا گیا جن میں سے شاید سب سے پہلا گروہ جرمنی کی ”انجمن مزدوروں“ کی شکل میں نمودار ہوا جسے فرنینڈ لاسال نے چند سال پیشتر قائم کیا تھا، اور ۱۸۴۷ء میں آخر کار جرمانی دستوری اشتراکی گروہ کی بنیاد پڑی جس نے سولہ سال بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کیا۔ اس پیش نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریق انقلاب پسند نہیں بلکہ حکومت میں اس وقت تک ارتقا کا خواہاں ہے جب تک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں۔ اسی طرح انگلستان میں اشتراکی خیالات کی رہبری جارج برنارڈ شا اور نے بین سوسائٹی نے کی جس کے روح رواں سٹر اور سنر سٹنی ویب ہیں۔ ان کا مطمح نظر یہی رہا ہے کہ ایک طرف تو حتی الامکان لامرکزیت کے اصول کی ترویج کریں اور دوسری جانب جبری ہمہ دخلت معمرین، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچائت اور نگرانی کا رخانہ جات کے اصول کے ذریعے سے عدالت حکومت کے دائرے کو وسیع کریں۔ یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے سے اجتماعیوں کو مختلف ممالک میں لٹانی کا کام حاصل ہوئی ہے اور ایک طرف تو ۱۹۱۹ء میں جمہوری جرمنی کا سب سے پہلا صدر وٹاں کے اشتراکی گروہ کا رجب فرڈریش ایبرٹ مقرر ہوتا ہے دوسری جانب ۱۹۲۲ء میں انگلستان کے مزدور فریق کا صدر ریزے میکڈونلڈ

کلیہ دیکھو کرکپ ”تاریخ اشتراکیت“ Kircup: A History of Socialism

۱۹۲۹ء کے وسط میں مزدور جماعت کی جو نارت ترقیب دی گئی اس میں سٹنی ویب کو وزیر نوآبادیات بنایا گیا اور ملک معظم نے انہیں بیرونی کار تہ اور لاٹو پاس نمائند کا خطاب مرحمت کیا۔

خود شاہ جارج پنجم کے ہاتھ سے قلمدان وزارت حاصل کرتا ہے۔

اشتمالیت۔ اشتراکیت کا آخری اور سب سے اہم پیرویہ وہ ہے جسے اشتمالیت کا لقب دیا جاتا ہے، اور جس نے روس میں بولشویت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بولشویت پر اس وقت بحث نہیں کی جائے گی بلکہ اس مخصوص طرز حکومت پر سیاسی فریق بندی کے سلسلے میں آئندہ غور کیا جائے گا؛ اس وقت صرف اس کے بنیادی اصول یعنی اشتمالیت کو نظر غائر دیکھنا ہے۔ اجتماعیت کی طرح اشتمالیت کے پیرو بھی ایک مخصوص طرز کار کے ذریعہ سے اپنے مقصد کے حصول کے خواہاں ہیں جس طرح اجتماعیت پسند محض ارتقا کے ذریعہ سے اشتراکی کیفیت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اشتراکیوں کے نزدیک اشتراکی مقاصد کا حصول انقلاب اور طبقہ واری جنگ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے آج دنیا کے اصل دپاروں اور سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد کو اس درجہ مضبوط کر لیا ہے کہ وہ کسی حالت میں ملامت سے راہ راست پر نہیں آسکتے۔ ابتدائی اشتمالیوں میں جرمانی سیاسی فلسفی اینگلس کا نام نہایت ممتاز ہے، لیکن جتنے بھی اشتمالی گزرے ہیں ان سب میں ممتاز ترین شخص جس نے اصول اشتمالیت کی عملی ترویج

۱۹۱۵ء انگلستان کی مزدور جماعت کی حیرت انگیز سیاسی کامیابی کا اندازہ مفصلہ ذیل جدول سے ہو جائے گا۔

انتخابی پارلیمنٹ سنوار دارالعلوم میں مزدور فریق کے ارکان دارالعوام کے انتخاب میں نمود فریق کے لئے دہندوں کی جملہ تعداد

۱۹۰۰ء	۲	۶۲،۷۰۰
۱۹۰۶ء	۲۹	۳،۲۳،۲۰۰
جنوری ۱۹۱۰ء	۳۰	۵،۱۰،۵۰۰
دسمبر ۱۹۱۰ء	۴۲	۳،۷۰،۸۰۰
۱۹۱۵ء	۵۷	۲۲،۴۵،۰۰۰
۱۹۲۲ء	۱۴۲ (وزارت مزدور)	۴۲،۳۶،۸۰۰
۱۹۲۳ء	۱۹۱	۴۳،۴۸،۲۰۰
۱۹۲۹ء	۲۸۸ (وزارت مزدور)	۸۳،۷۴،۲۰۰

۱۹۲۵ء دیکھو مارکس و اینگلس، "اعلان اشتمالین" Marks and Engels: The Communist Manifesto (Eng. Transl., Ch- Kerr, N.Y.)

رکے اُس کی تاریخ میں گویا چار چاند لگا دیئے ہیں۔ لیننؒ تھا، جو ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک مسلسل روس کا آمر اعظم رہا اور جو زمانہ جدید کے عظیم ترین انسانی قائدوں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ لینن کتنا ہے کہ یہ خیال محض خام ہے کہ جس طبقے کے قبضے میں صدیوں سے قوت و اقتدار رہا ہو وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کی ضرورت ہے کہ جس طرح سے ہو سکے مزدور اور ملک کا محنتی طبقہ، جو اس وقت تک نہایت کس پر سہی کے عالم میں رہا ہے، جبراً و قہراً موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضے میں کر لے اور انہیں خود اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے کام میں لائے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ حکومت بلاشبہ محض ایک طبقہ داری جماعت پر مشتمل ہوگی اور صحیح معنی میں ملک کی قائم مقام نہیں ہوگی لیکن یہ طریقہ صرف اس لئے استعمال کیا جانا ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اصل داروں کا سیاسی و معاشی اجارہ منسوخ کر دیا جائے۔ زمانہ موجودہ میں جتنی بھی بے اعتباری اور نقص اس نظر آتا ہے وہ سب عدم مساوات کی وجہ سے ہے، چنانچہ جب مکمل مساوات ہو جائے گی اور حق بحق دار رسید کے اصول کے تحت محنتیوں اور مزدوروں کو، جو اپنے پسینے کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں، جملہ گم شدہ حقوق مل جائیں گے، تو پھر ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ ہوگی اور اس طرح گویا اپنی نوع انسان کو سیاسی نجات حاصل ہو جائے گی۔ جبر و اکراہ کے فقدان کے ساتھ ہی معاشرہ سیاسی یعنی مملکت کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس لئے کہ اس کا اصل اصول اقتدارِ اعلیٰ ہے اور اُس کی ضرورت صرف اس لئے داعی ہوتی ہے کہ مختلف طبقات آبادی کے مابین توازن پیدا کیا جائے؛ جب طبقہ جات آبادی ہی کا خاتمہ ہو گیا تو پھر مملکت یا معاشرہ سیاسی کی کیا ضرورت باقی رہی۔ الغرض گواشتراکیت اور انفرادیت کے بین بعد الشرفین معلوم ہوتا ہے لیکن ان دونوں کا انتہائی لغصہ العین یہی ہے کہ ایسا زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی حاصل ہو اور کسی قسم کی بیرونی قوت یا اقتدار کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اصول اشتراکیت کا تعین اور ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے اس میں تغیر و تبدل ایک بین الاقوامی اشتمالی کانگریس کے ذریعے سے ہوتا رہا ہے جسے اصطلاح میں "بین الاقوامیہ" کہتے ہیں۔ اس بین الاقوامیہ نے اس وقت تک تین چارے بدلے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا جلسہ سویٹزرلینڈ کے شہر بازل میں ۱۸۷۳ء میں ہوا جس میں اٹھالیس نے بکون اور اُس کے نراجی پیروں کو اپنی جماعت سے نکال دیا اور اس طرح گویا یہ اعلان کر دیا کہ مداخلت حکومت کے متعلق ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک اصولی فرق ہے، وہ یہ کہ جہاں نراجی گروہ حکومت کے وجود ہی کا مخالف ہے وہاں دوسری اشتمالیوں کا فرق حکومت کی مشین کو اپنے قبضے میں ناکرا کر کے ذریعے سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے دوسری بین الاقوامیہ

کا انعقاد بلجیم کے شہر اینٹ ورپ میں ۱۸۸۹ء میں ہوا، اور اس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب بھی کارل مارکس کے اصول کی لفظی و معنوی پابندی پہلے ہی کی طرح ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس بین الاقوامیہ کا مسلک بالکل ارتقائی تھا، اور اس میں انقلاب کو بہت ہی کم دخل تھا، لیکن اس کے انعقاد کی وجہ سے اشتراکی گروہ میں ایک قسم کا میحان پیدا ہو گیا اور مزدوروں کی انجمنوں میں تنظیم کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ برابر جنگ عظیم تک جاری رہی۔ اس تنظیم کی وجہ سے اصل داروں اور سرمایہ داروں سے طرح طرح کی مراعات حاصل کی گئیں اور جنگ عظیم کی ابتدا پر یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید کارل مارکس کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی اور اشتراکیوں کے مفاد محض ارتقائی اور آئینی طریقوں سے حاصل ہو جائیں گے لیکن جنگ نے اشتمالیوں میں ایک خاص تیج پیدا کر دیا اور اس کے بعد ہی ارتقائی اور انقلابی اشتراکیوں کے مابین گویا دیوار آہنی حائل ہو گئی: ارتقائی گروہ تو قومی حکومتوں کے ساتھ مل گیا اور انقلابی گروہ کے افراد مختلف ممالک کے مزدوروں اور منتہیوں کو اپنا بھائی بنا سمجھ کر فی نفسہ جنگ اور اصول جنگ سے متفرق ہو گئے۔ ان کے اس میلان کے باعث، ایک طرف تو ہر ملک میں ان پر تشدد ہونے لگا۔ اور دوسری جانب انہوں نے قومی حکومتوں کا ساتھ دینے سے منہ موڑ لیا۔ انہی اثرات کے ماتحت ۱۹۱۹ء میں (یعنی روس کے بولشوی انقلاب کے بعد) روس کے مرکز موسکو میں تیسری بین الاقوامیہ کا انعقاد ہوا، اور اس نے وہ اعلان شائع کیا جو تمام اشتمالیوں کا نصب العین ہے، یعنی مارکس اور اینگلس کے اصول کے ساتھ ہی ساتھ اس نے آخر کار اپنے قطعی طور پر انقلاب پسند ہونے کی قرارداد منظور کر لی۔

اگر اشتراکیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام دوسری غالی تحریکات کی طرح یہ بھی مغالطوں سے بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں تین عالمیوں پیداوار یعنی زمین، "محنت" اور "اصل" میں سے ایک یعنی "محنت" پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انفرادی حالات میں تو قیمت، نوعیت و مقدار پیداوار تقسیم دولت اور دوسرے معاشی امور کا تعین خود بخود طلب رسد کے قانون کی بنا پر ہوتا ہے لیکن جب مقابلہ ہی غائب ہو جائے گا تو پھر ان کا تعین بغایت دشوار ہو جائے گا تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم ہے جگہ وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہے گا تو افراد اپنے پروا ہو جائیں گے۔ اسطرح طایس اپنے استبداد کے مظاہر کی نظر پر اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو اس میں وہ شرکت اور ساتھ کے کام سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ زمانہ حال کے اشتراکیوں

کے پیرو طبقہ واری حکومت کو محض ایک منزل ارتقا تصور کرتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ اچھی طرح یا بری طرح کسی طرز پر ناہمواری اور عدم مساوات کو مٹا کر ایسا مکمل آزاد معاشرہ قائم کیا جائے جس میں مملکت یا حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو؛ اس میں اور نراج میں مطلق کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ نراجی آج ہی سے مملکت اور حکومت کے خاتمے کے درپے ہیں اور اشتمالی بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا جاتے ہیں۔ اس ضمن میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ روس میں اشتمالیت کی ترویج کو اب دس سال سے زیادہ گزر گئے، لیکن بجائے اس کے کہ فرد کو مملکت کے خلاف آزادی حاصل ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ مملکت کا پنچہ تقریباً اتنا ہی بلکہ شاید اس سے زیادہ مضبوط اور دور رس ہے جتنا نارینٹ کے عہد میں تھا اور اشتمالیت کے مقصدِ اعلیٰ کا حصول پہلے سے بھی بعید تر ہوتا جاتا ہے۔

اعتدال پسندی - یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی اصول محض مجرد شکل اختیار نہ کرتا ہے اس وقت تک اس میں غالییت کا عنصر نمایاں رہتا ہے، لیکن جب وہ عمل میں لایا جاتا ہے تو ایک قسم کے اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حالت انفرادیت اور اشتراکیت کی ہے۔ کاغذی دلیل و استدلال اور بحث و تمحیص کے لئے ایک طرف ہر برٹ سپنسر اور کروپٹکن اور دوسری جانب کارل مارکس اور اینگلس کے نظریے نہایت دل خوش کن ہیں، لیکن واقعات و حالات پر انطباق کرتے ہی ان کے پیروؤں کی غالییت کا کائنات نکال کر پھینک دینا پڑتا ہے۔ جن ممالک میں انفرادی حکومت رائج ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہبود عامہ و ضروریاتِ زمانہ کی خاطر مختلف شعبہ جاتِ حکومت میں اشتراکی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے اور روز بروز حکومت کا دائرہ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے؛ دوسری جانب روس میں، جہاں ۱۹۱۷ء سے اشتمالیت کا دور دورہ ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل اشتمالیت کے ذریعے سے ارتقا کی موجودہ منزل بھی اُس وقت تک طے نہیں کی جاسکتی جب تک افراد کو خصوصی بہت آزادی نہ ملے دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادی ہو یا اشتراکی، دونوں کے مابین جو فرق ہے وہ محض طرزِ کار کا ہے، اور اگر وہ اپنے وطن کی بہبود چاہتے ہیں تو موقع و محل کے اعتبار سے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی غرض سے انہیں اپنے اصول میں کمی بیشی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد متمدن ممالک کی حکومتوں نے اپنے سرِ فرض لے لیا ہے کہ نہ صرف اسی قسم کے کاموں کو اپنے ذمہ رکھیں جیسے ڈاک اور تار، بلکہ اُن میں سے اکثر میں ریلوں کو یا تو حکومت براہِ راست چلاتی ہے، ورنہ اگر وہ خانگی شرکتوں کے ماتحت ہیں تو ان پر نگرانی رکھتی ہے۔ پھر ملک کی معاشی بہبود بھی

نظر انداز نہیں کی جاسکتی جس کے لئے بیرونی مال پر طرح طرح سے محصول لگا کر ملکی صنعت و حرفت کو مامون کیا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعے سے دنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ زمانہ حال کی "انفرادی" حکومت کی دلچسپی ہمیں نہیں رکھتی، بلکہ خانگی امور اور خاندان تک کے معاملات میں وہ مداخلت کرتی ہے، مثلاً بعض ممالک میں لوگوں کو جبراً اپنی زندگی کا بیمہ کرانے پر مجبور کرتی ہے، غریب کو ایک خاص عمر سے تجاوز کرنے پر افلاس سے بچانے کی غرض سے ان کا وظیفہ مقرر کرتی ہے، اور مختلف کارخانوں میں ایک خاص مقدار سے زیادہ کسی کو کام نہیں کرنے دیتی محنت اور مزدوری کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا اصول اس قدر مسلّم ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں انجمن اقوام کی ابتدا ہوئی تو اُس کے عہد نامے میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ "جہاں کہیں روزانہ آٹھ گھنٹے یا ہفتہ وار ۴۸ گھنٹے کی محنت کا قاعدہ مقرر نہیں ہے وہاں کی حکومت کو اس قسم کے طرز کار کو رواج دینا چاہئے، اور اسی طرح بعض جدید وسائیر مثلاً جراثیم کے دستور میں مزدوروں کی بہبود کا خیال بہت کچھ پیش پیش نظر آتا ہے۔"

اُدھر روس کے بولشویکوں کو بھی محض مطمحی اشتہائیت کی سطح سے اترنا پڑا ہے، اور جدید معاشی طرز عمل کی ترویج کے بعد بہت سے انفرادی اصول کو روس میں رائج کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لینن کی حیات ہی میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مجرد اشتہائیت میں جو نقصان ہیں ان کے باعث روز بروز انتہری پیدا ہونا لازمی اور لا بدی ہے، چنانچہ اوائل ۱۹۲۱ء ہی میں کاشتکاروں سے غلہ کی بجائے لگان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اور مئی ۱۹۲۱ء میں لینن نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے ملکتی اصل داری کے رستے پر لگا سکتے ہیں۔ دو ماہ بعد کارخانے اور گرنیاں کرایہ پردی جانے لگیں اور رفتہ رفتہ باضابطہ دکانیں بھی کھلنے لگیں۔ انفرادی اصول نے بالآخر اس قدر ترقی کی کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد اراضی باضابطہ بارہ سال کے لئے پٹے پردی جانے لگی اور بعض سونے کی کانیں بھی قدیم شرکتوں کو پٹے پردے دی گئیں۔

الغرض اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی ملک میں وہی حکومت کامیاب ہو سکتی ہے جو اس کے حسبِ حال ہو، اور محض عقیدہ پرستی اور علی سیاست میں بہت بڑا فرق ہے۔ آئینہ باب میں انفرادی حکومتوں کے معمولی فرائض و اختیارات پر تبصرہ کیا جائے گا۔

ہارون خاں شروانی

۱۹۲۵ء عہد نامہ انجمن اقوام میں محنت کے متعلق دفعہ ۲۳ ملاحظہ کی جائے ۱۹۲۴ء دستور جرمنی ۱۹۱۹ء باب ۱۵۷۔

۱۹۲۵ء دیکھو سالانہ رجسٹر "۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء" ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء Vide Annual Register ۱۹۲۰ & ۱۹۲۱

اصطلاحات وغیرہ

Wealth	دولت	Producer	آجر
Czarism	زاریت	Director	آمر
Land	زمین	Trade Unions.	اتحادیات تجارتی
Switzerland	سوئٹزرستان	Syndicalist	اتحادی
Political Equilibrium	سیاسی توازن	Syndicalism	اتحادیت
Political Party	سیاسی فریق	Monopoly	اجارہ
Company	شرکت	Collectivism	اجتماعیت
Consumer	صارف	Voluntary	وختیاری
Class	طبقہ	Institutions	ادارات
Proletariat	طبقہ اسفل	Inductive	استقرائی
Class War	طبقہ واری جنگ	Socialism	اشتراکیت
Agents of Production	عاملین سپید اور	Communism	اشتمالیت
Dogmatism	عتیدہ پرستی	Capital	اصل
Direct Action	عمل براہ راست	Capitalist	اصل دار
Confederation	عہدیت	Relative	اضافی
Madrid	مہرلیط	League of Nations.	انجمن اقوام
Group	مجموعہ	Individualist	انفرادی
Labour	محنت	Individualism	انفرادیت
Agent	مختار	Bolshevism	بولشویت
Human Society	معاشرۃ انسانی	"The Internationale"	بین الاقوامیہ
Economic	معاشرتی	Mercantilism	تجارت پرست
Competition	مقابلہ	Distribution of Wealth	تقسیم دولت
Boycott	مقاطعہ	Conscription	جبری بھرتی
Anarchism	انارح	Compulsary Insurance	جبری بیمہ
Old Age Pensions	وظائف معمرین	Electoral Districts	حلقہ جات انتخاب
Strike	ہڑتال	Private Property	خاص ملکیت
		Club	دارہ

نواہائے راز

تم ہونے و غنوارِ دل و جانِ جـنـزِی ہوں ہوتا ہے فلک مجھ سے اگر برسرِ کس، ہو
 اُس رُخ کے تصوّر سے فراغت نہیں اک دم تم دُور ہوا آنکھوں سے مگر دل کے قمری ہو
 ہر حنیہ نہیں ربطِ مرے جسم کو جاں سے تم ہی ہو مری جان، مری جان تمہیں ہو
 بستے ہو مرے دل میں کم آ میرزا ہو پھر بھی رہتے ہو مری آنکھیں اور پردہ نشیں ہو
 الفت ہے مرادین، وفا ہے مرا ایماں تم ہی ہو مرادیں، مرا ایماں تمہیں ہو
 تم زینتِ گیتی ہو، تم آرائشِ حقیقت بے شبہ تمہیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہو

گھر گھر میں ہے چرچا مری وارفتہ کی کا

اے کاش تمہیں بھی مری الفت کا یقین ہو

حامد علی خاں

ڈارون

ساحل افتادہ گفت گرج بے زینتم ہیچ نہ معلوم شد آہ اکہ من چہیتم
موج زخود رختہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم گرنہ روم نیستم

یوں تو جس کے بدن میں روح ہے زندہ کہلاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی عمل کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ اگر کالبہرِ خاکی اور روح کی عارضی مصاحبت ہی کا نام زندگی ہو، تو ایسی زندگی کو دور سے ہمارا اسلام! عمل ہی کی جاودانی ضیاء پاشی ہے جس نے صد ہاستیوں کو موت کی بد تار کی غفیر میں بھی روشن سے روشن تر بنا دیا ہے! اور آج ہم نہایت اخرام کے ساتھ اُن کا نام لیتے ہیں اور اُن کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ جو لوگ مستقل مزاجی سے جادہ جدوجہد پر گامزن رہتے ہیں، یقیناً کامیابی و فتح انہیں کا حق ہے۔ مومن جدوجہد پر دل سے یقین رکھنے والے ہمیشہ شادمانی و کامرانی سے دوچار ہوتے ہیں اور اپنی مساعی پیہم سے منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ عمل ہی کے خوشگوار نتائج ہیں کہ نپلین، شیکسپیر، فردوسی، غزالی، فاروق، نیوٹن، سرسید، کالیداس وغیرہ ہزاروں بہتیاں حیاتِ جاوید حاصل کر چکی ہیں۔ فی الواقع کوشش، گواہی کے نتیجے تیر بہدف نہ ہوں، ایک مستحسن مشغلہ ہے۔ ڈارون نے اپنی تمام عمر علمی تحقیقات میں صرف کر دی، اپنے جدید نظریہ سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور گوسائٹس کے ماہرین اس کے نظریہ ارتقا کو غلط ثابت کر رہے ہیں تاہم وہ قابلِ وقت ہے کہ اُس نے اپنی ان تھمک کوششوں کی ایک درخشاں مثال قائم کر دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ عمل کے ذریعہ سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ انگریزی مدارس کے طلبہ ڈارون اور اس کے نظریہ ارتقا سے ضرور آشنا ہونگے آج ہم برسبیل اختصار ڈارون کے حالاتِ زندگی بدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

ڈارون ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو بمقام شروزربری پیدا ہوا تھا۔ اس حساب سے ڈارون کو پیدا ہونے ایک سو بیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا باپ مقامِ مذکور میں طبابت کیا کرتا تھا۔ ڈارون میں جو قابلِ توصیف ذہانت اور اشتیاقِ تحصیل تھا، وہ دراصل اسے میراث میں ملا تھا۔ والد کی جانب سے وہ شہرہ آفاق عالم اریزمٹلارون کی اولاد میں سے تھا اور والدہ کی طرف سے اُسے جو شیا و جوڈ کی ذریات میں ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یوں تو علم و فن کے ہر شیدائی کو صدقِ شوق کی وجہ سے مقصد برآری میں سہولت بہم پہنچ جاتی ہے مگر قلیل وقت میں بہت کچھ



خالد اس 3120

CALCUTTA
ART & WORK
LAHORE

حاصل کر لینا بسا اوقات گرو سپیش کے ماحول کا مہزون منت ہو کر تا ہے۔ اسی شاندار ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اُسے اپنے علمی کارناموں کے اظہار کے لئے اور تحقیق و تفتیش کے شوق کو پروان چڑھانے کے لئے کافی مواقع بہم پہنچ گئے تھے۔ پس اس کے فطری شوق نے فطری ماحول کے زیر اثر وہ کرد کھایا کہ باید و شاید۔

اُس نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی قصبے میں حاصل کی۔ خوش نصیبی سے ڈارون کو قابل مصنف و لائق عالم بشپ بلر کا سایہ نصیب ہو گیا، بدیں سبب وہ اپنی جوانی کے تشویشناک و تغیر خیز زمانہ میں بھی جادۂ اخلاق سے نہ ہٹا۔ اس کے علاوہ بری صحبت کے زہریلے اثر سے بھی وہ مامون رہا۔ ۱۸۲۵ء میں ڈارون مزید تعلیم کے حصول کی خاطر جامعۂ ایڈنبرا میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں اس کے فاضل دادا اریوٹس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈارون یہاں ۱۸۲۶ء کے آخر تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں ڈارون نے اپنے فطری کمالات کا بدرجہ اتم اظہار کر کے بہت بڑی ناموری حاصل کر لی، ۱۸۳۱ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۳۲ء میں ایم۔ اے کا ڈپلوما منابت سرفرازی کے ساتھ حاصل کر لیا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے درمیان جو مدت مدید حائل نظر آتی ہے، اسے ڈارون نے رائگاں نہیں جانے دیا، بلکہ اسی عرصہ میں غم سے وہ اہلیت و مہارت نامہ بہم پہنچائی جس پر اس کی آئندہ کی حیرت انگیز و انقلاب زا شہرت و ناموری کی مستحکم عمارت بشان و جلال قائم ہوئی۔ اسی زریں وقت میں اُس نے علمی تحقیقات میں ایسی نمایاں جدوجہد کی کہ علمی مسائل کے عقد مائے لائیل اس کے سامنے کھل گئے اور وہ مسرت آگین و امید افزا کو شعشعوں کے ساتھ اپنے علمی کارناموں کی جلا میں منہمک ہو گیا۔

ڈارون کو لومطری کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ بعض کا قول ہے کہ انہیں شکار گاہوں نے اس کی قوت مشاہدہ میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ پیش آیا: اس سال آنجنابی ملکہ وکٹوریا کا جہاز ”بیگل“ کپتان فنز رائے کی زیر نگرانی ساری دنیا کی سیاحت کے لئے تیار ہوا۔ کپتان موصوف نے جہاز کا ایک کمرہ اس شخص کے لئے معقولہ دیاتھا جہاں فطرت ہو بھلا ایسے موقع پر ڈارون کے سوا کون سی ہستی میدانِ مقابلہ میں آسکتی تھی؟ جہاز مذکور ۲۴ دسمبر ۱۸۳۱ء کو انگلستان سے روانہ ہوا اور ۲۸ اکتوبر ۱۸۳۲ء میں واپس آہنچا۔ اس عرصہ میں ڈارون نے تحقیق فطرت و مشاہدہ قدرت کے شعبوں میں جو جو تحیر خیز کارنامے انجام دیئے وہی درحقیقت اُسے حیات جاوید بخشنے کے ذمہ دار ہوئے۔ ڈارون سے پہلے اسی فرض کی تکمیل کے لئے بہت سی سیاحتیں ہوئی، مگر ڈارون کی انفرادی مساعی سب پر سبقت لے گئیں۔

انٹرنیشنل تجربات حاصل کرنے کے بعد ڈارون نے ایک نہایت مفید کتاب Nationalist's Voy-
age Round the World لکھ کر سائنس کی دنیا میں ایک زبردست گھماٹھی پیدا کر دی۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے
کتاب مذکور کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں سائنس ایسے ایسے مضمون کو ایسا دلکش و دلچسپ جامہ پہنایا ہے
کہ ایک شوقین طالب علم ڈارون کے کمالات کی داد دیتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈارون نے اپنی کتاب میں سائنس
کی اصطلاحات سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے اور یہی خوبی اس کی دوسری کتابوں میں جلوہ گر ہے۔
مذکورہ صدر سفر کے اہم ترین نتائج میں اول نمبر اس کے نظریہ ارتقا کا ہے۔ پہلے پہل یہ نظریہ ڈارون کے
دادا کے حاشیہ دماغ میں رونما ہوا تھا، مگر یہ ڈارون ہی لکھا جس نے اسے حتمی شکل پر پہنچا کر سائنس کے کیمپ میں
بجلی ڈال دی۔

۱۸۳۹ء میں اُس نے اپنی ماموں زاد بہن ایما و جوڈ سے شادی کر لی اور ۱۸۶۲ء میں کینیڈا میں بودو باش
اختیار کی اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔

اس کے اخلاق و عادات نہایت معصومانہ سادگی پر مشتمل تھے۔ ان میں ایسا جادو بھرا تھا کہ ہر کس و نا کس اس
کا گرویدہ نظر آتا تھا۔ اس کی رفتار، خیالات اور گفتگو میں لطافت، نفاست، حیا اور پاکیزگی بدرجہ اتم موجود تھی۔
باوجودیکہ وہ عالم متبع تھا، اسے اپنے فضل و کمال کا ذرہ برابر بھی گھمنڈ نہ تھا اور نہ اصل انہیں خوبیوں کی وجہ سے اس
نے ہر شخص کا دل موہ لیا تھا۔ ڈارون ہر ایک کی بات بے سنجیدہ پیشانی سمجھتا اور ہر ایک کی امداد کے لئے تیار ہو جاتا تھا
باوجودیکہ ڈارون کا نظریہ غلط ثابت کیا جا رہا ہے، اس کے نظریہ نے تحقیقات و تفتیشات کا راستہ
کر دیا ہے اور سائنس کے متعدد اہم اور دقیق مسائل کو حل کر کے صدائے عواقب کا سد باب کر دیا ہے۔ انسانی زندگی
کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس پر ڈارون کی تحقیقات کا اثر نہ پڑا ہو: مذہب، اخلاق، تعلیم، قانون وغیرہ۔ ڈارون
کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا ہے، جہاں اس کے نام لیواؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

ڈارون آج دنیا میں نہیں ہے، مگر اس کے کارنامے زندہ ہیں اور ایک رعب پاش صدا کے ساتھ
نغمہ سرا ہیں کہ

ثبت است جبر سربیدہ عالم دوام ما

وَحِيد
اکبر آبادی

تم میرے دل میں ہو

وہ پہاڑوں پر زعفران کے مہکتے ہوئے کھیتوں کے پاس رہا کرتی تھی۔ اُس کی جھونپڑی کے نزدیک ایک چھٹی منڈی متبسم نغمہ پیدا کرتی، اور قدیم درختوں کے سایہ میں سے گزرا کر سستی تھی، عورتیں وہاں اپنے شکے پانی سے بھرنے آتیں، اور مسافروں کو بیٹھ کر سستاتے۔ وہ منڈی کے نعروں کے ساتھ سر ملاتی، اور اس کی ہم آہنگی میں محو خواب ہو جاتی، ایک شام اجنبی برف آلود چوٹیوں میں سے گزرا کر آیا۔ اس کے لمبے لمبے بال مست ساہنوں کی طرح بل کھاتے ہوئے تھے۔ ہم نے تعجب سے پوچھا تم کون ہو؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پُر شور منڈی کے کنارے بیٹھ گیا اور خاموشی سے اُس کی جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے دل خوف و ہراس سے کانپ اُٹھے۔ اور جب رات کی تاریکی نے چمکدار برف کے تودوں کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا، تو ہم اپنے اپنے گھر واپس آ گئے۔

دوسرے دن جب علی الصباح عورتیں دیو دار کے درختوں میں سے بننے والی منڈی پر پانی بھرنے آئیں، تو اس کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اس کی قمی کی مانند شیریں آواز جا چکی تھی اور اس کا روشن چہرہ کہیں بھی نہ تھا۔ اُس کی خالی بالٹی ایک کونے میں رکھی تھی، اور اس کا چراغ ایک طاقی میں پڑا دم نوٹرا ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ صبح ہونے سے قبل وہ اجنبی کے ساتھ کہاں جا چکی تھی۔

جیٹھ کا مہینہ آ گیا۔ سورج تیز ہو گیا اور برف پگھلنے لگی۔ ہم چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور روتے رہے، ہم نے کہا ”آہ! کیا کوئی ایسا ہی چشمہ اُس سرزمین میں بھی ہے جہاں وہ چلی گئی ہے اور جہاں وہ اپنے خالی برتن سرد اور پاک پانی سے بھر سکتی ہے؟“ ہم نے ایک دوسرے سے باہری کے لہجہ میں پوچھا ”کیا ان پہاڑوں سے پرے بھی کوئی دنیا ہے؟“

گرمی کی رات تھی، ٹھنڈی ہوا جنوب کی طرف سے آرہی تھی، میں اس کی گلیاں میں بیٹھا اس کے بے جلی چراغ کو دیکھ رہا تھا۔ یکا یک میرے سامنے سے پہاڑ کپڑے کے پردوں کی طرح اٹھ گئے۔ آہ یہ تو وہی چلی آ رہی ہے۔ ”میرے بچے تم اچھی تو ہو؟“۔ مگر تم اس کھلے ہوئے آسمان کے نیچے سوئی کہاں ہو گی؟ اور آہ! ہماری منڈی اب تمہاری پیاس نہیں بجھا سکتی۔“

”یہاں وہی آسمان ہے“ اُس نے کہا۔ ”صرف یہاں اس کو مجھوس کرنے کے لئے پہاڑوں کے سلسلے نہیں ہیں۔ یہاں ہی منڈی ہے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جڑھ کر دریا بن گئی ہے۔ زمین بھی وہی ہے صرف پھیل کر میدان ہو گئی ہے۔“ وہاں سب کچھ ہے بس ہم نہیں ہیں، میں نے آہ بھر کر کہا۔ وہ ایک غمزہ طرز سے مسکرائی، ”تم میرے دل میں ہو“۔ میں چونک کر جاگ اٹھا منڈی کی آواز اور دیو دار کے درختوں کی سرسراہٹ میرے کانوں میں آرہی تھی۔

معین الحق حقی

(ترجمہ)

پیران سالوس

(۱)
کیا کھنکھاتی ہے فکروانی ہے
نقاباں شمع دل کو چھپاتی ہے
نہتے ہیں گندے دُورستے تھے شہنشاہ
نزدِ بھیجا اور دُور بھیجی انسانیت ہے

(۳)
نہ پڑھوں شکم پر غصے مینے والو!
خون قوم پرستی دست کاٹنے والو
مٹم اہل غر کے کیوں رکھو گے غناد
امداد پر احمقوں کی جینے والو!

(۲)
عشاق کریں ضعف کے یہ کیا کہیں
بیجا موجود انھیں گامی کیوں کہیں
چرت ہے مگر کہ عاشق ان قی پر
کس جانی پر نہیں سہی کی اپنی پوجہ

(۴)
مدم کچھ کے مدم دشمنوں کی کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس صل علی کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زرباں ریشہ دار
موقع ہو تو ہر بات کو خدائے ہیں
جوشِ ملیح آبادی

جامِ صہبائی

(۱) مجھ پر ہیں جب غنائی لکھیے
زندگانی لکھیے
اندیشہ زمر
زندہ ہے تو کا زارِ ہستی میں
پہاؤِ فدا کیست و کامرانی لکھیے

(۳) ناکامی زندگی سے ڈرنا کیسا
ہنگامِ شکستِ آہستہ کیسا
زندہ ہے اگر تو گناہِ مستحکم کیوں ہے
پہوت کے پیشِ شہر کی ناک کیسا

(۲) غمِ چوں سب عجیب و غریب ہوئی ہے
اک غمِ غریبِ فنا میں کہ کوئی ہے
بہاؤِ ایکسپنشنِ غم کا دریاں
دریاں کوئی کے غم کا ہو کوئی ہے

(۴) کچھ دیر سلاسلِ مکافات بھی ہیں
کچھ دیر شکستِ فتحِ حالات بھی ہیں
تیرے غم بھی، غمِ غمست بھی دریاں
نہاں ہیں لکھیے اتفاقات بھی ہیں

اثر صہبائی

زیتا

زندگی کی ناقابل ملامت جھاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ چار بیوی، ایک کھاؤ اور ہاں میں ہاں ملاؤ۔ یہ ایک مذہب ہے اور اس کی نمازیہ ہے کہ چار گول کمرے میں (چاہے وہ چوکھونٹا ہی کیوں نہ ہو) پی جائے اور اُس وقت کا بے تابی سے انتظار کیا جائے جب اس نماز کی امام مسکرا کر پوچھے کہ مصری کی ڈلیاں ایک کہ دو؟ جو لوگ اس مذہب کے بچے نمازی ہیں انہیں شاید ایک جماعت کی سوانح عمری کے ایک جزو میں کچھ دلچسپی ہو۔ وہ سوانح عمری یہ ہے۔

ایک کمرے میں چار تھی، میزین تھیں، سامان آرائش بہتر سے بہتر، چند لیڈیز، ایک پرکالہ لیاقت زیتا اور کچھ غیر ضروری بھتنے۔ بھتنوں کو معاشرتی اصطلاح میں خنٹلین کہا جاتا ہے مگر ایک کی کٹھالی گریزاں تھی اور آپ ان کے مداخلوں میں سے تھے ایک حضرت کے استرے اور ٹھوڑی میں روزانہ ناتمام بحث کے آثار نمایاں تھے ایک نوخیز شباب کے نشے سے لوکھڑا ہے تھے۔ ایک کا ہل الوجہ کو سفید بانوں کے لئے سیاہ بوٹ پالش میسٹر نہ ہوا تھا۔ غرض یہ کہ ان بھتنوں کو خنٹلین کہنا اس لفظ کی آبرو کھونا ہے مگر چونکہ خنٹلینوں کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہو سکتی یہ تھے اور ضرور تھے۔ یہ تھا وہ مجمع یا جماعت جس میں ایک شخص نے زیتا کی لیاقت سے تنگ آکر اُسے دیہمکی دی تھی کہ ”کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا“

زیتا نے اُس وقت تو کچھ نہ کہا مگر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ آخر یہ شخص کیا لکھ سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ میری زبان ماسکو کو سبق آموز ہے یا یہ کہ میرے جذبات میرے ماحول سے ایک صدی مستقبلانہ ہیں یا یہ کہ میں اسی کم سنی میں زندگی کے بہترین انعاموں کو پرکھ کر ردی کر چکی ہوں! لکھ دے، ایک دفعہ نہیں بلا سے سو دفعہ لکھ دے۔ اول تو کوئی شائع نہیں کرے گا اور کرے گا تو پڑھنے والے کیا خاک سمجھیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے زیتا نے اس گفتگو کو دل سے محو کر دیا۔

(۲)

جس شخص نے زیتا کو مذاق مذاق میں یوں دھمکایا تھا اُس کا اس وقت تک تو خیال صرف یہ تھا کہ گول کمرے کی چلتی چلاتی باتوں میں زیتا کے علمی تیر و تفنگ بے محل ہیں۔ اس لیاقت کی تپلی کو چاہئے کہ اپنے ہم پلہ

کسی پروفیسر سے بحث کرے۔ خواہ مخواہ ہم واجبی واجبی پڑھے لکھوں سے نہ پل پڑا کرے مگر بعد میں جب اس نے غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ معجزہ جس کا نام زیتا ہے تنقید سے بالاتر ہے۔ اگر ہندوستان کے نصیب نیک ہیں تو یہ کراماتی شعلہ بھجھو کا ہزاروں دقیقانوسی اولام کو خاک سیاہ کر دے گا۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر یہ شخص بھی اس گفتگو کو بھول گیا۔

(۳)

..... نے بھی یہ دھمکی سنی۔ اس کا لطف بھی اٹھایا مگر عمیق ندیوں میں زمانہ کی ہوائیں شور نہیں پیدا

کر سکتیں۔

اوس کو زیتا سے صرف محبت ہے۔۔۔۔۔ کو زیتا سے عشق ہے اور ان کی دنیا بھر کی اچھی خواہشیں زیتا کے لئے وقف ہیں۔ وہ زیتا کی لیاقت پر نازاں بھی ہیں اور اس سے ترساں بھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتے لگیں کہ کاش زیتا کی لیاقت بجائے شعلہ بن کر بھڑکنے کے پھول بن کر کھلے۔ یہ دعا مانگ کر وہ بھی اس بات کو بھول گئیں۔

(۴)

گول کرے میں رجسٹرا گول کمروں کی زندگی کا تقاضا ہے، دھیمی دھیمی سے آوازیں سنائی دیں کہ آؤ تاش کھلیں میز کھٹکنے لگے، کرریاں وقار سے جھنے لگیں، بکس میں سے تاش نکلتے۔ ادھر ادھر سے پتے تراشنے کے لئے ہاتھ بڑھے اور جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ کون کس کا آڑی ہو تو پتوں کی تقسیم کی طیاری ہوئی۔

(۵)

پتوں کی سرسراہٹ کی آوازیں سن کر تین فرشتے (وہ سماوی نمان جو مسلمان گھروں میں اب تک آتے جاتے رہتے ہیں) گول کرے سے نکل کر باہر چن چن گلگشت کرنے لگے (مسلمان فرشتوں کو اب تک تاش کے پتوں سے نفرت ہے) اور یوں باتیں کرنے لگے۔
ایک فرشتہ۔ تم نے زیتا کی بے نیازی ملاحظہ کی؟ یوں سمجھتی ہے گویا زندگی کی تمام طاقتوں پر حکمران ہونا اور رہنا اس کے اپنے بس کی بات ہے۔
دوسرا فرشتہ۔ ہاں اور۔۔۔ کی زیر لب دعا سنی؟ بچاری یہ تصور کتے بیٹھی ہیں نیک ہونا، ہمدرد خدمت گزار ہونا گویا قسمت کو خرید لینا ہے۔

تیسرا۔ اور اس خود پرست کو نہ دیکھا؟ عجب انسان ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ کسی بات کی ماہیت کو سمجھ لینا گویا افعال پر حاوی ہونا ہے۔

دوسرا۔ سچ پوچھو تو وہ بچار اسب سے زیادہ قابل رحم ہے سمجھ اس میں ہے مگر قدرت نہیں۔ اس کے سائے جسم میں صرف آنکھیں تعلیم یافتہ ہیں اور جدھر وہ چل نکلیں وہیں حضرت کا دل و دماغ بھی حاضر ہے۔ ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں ماہر جن ہوں۔

پہلا۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم زینا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیا ہمیں مدد کرنی چاہئے؟
دوسرا۔ ہاں ضرور کرنی چاہئے۔

تیسرا۔ اچھا میں یہ کروں گا کہ وہ سو رہی ہوگی تو میں چپکے سے اس کی روح کو شفق کی ندی میں دھولاؤں گا۔ بہتر سے بہتر کلنگ روح میں اُسے لپیٹ دوں گا۔

پہلا۔ شاباش، مگر دوست کیا تمہیں بنی آدم کی اس حماقت پر ہنسی نہیں آتی کہ سب کے سب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ روح انسان کے اندر ہوتی ہے عجب التوہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جسم روح کا جادہ نہیں بلکہ روح جسم کا جادہ ہے۔ میلے ہاتھوں، ناپاک نگاہوں سے اس لباس کو چاک کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ روح تو اندر ہی اور مومن ہے۔ دوسرا۔ پھر تم نے وہی انسانوں پر تنقید شروع کی، یہ کہو کہ زینا کے لئے تم کیا کرو گے؟

پہلا۔ دوست کچھ سمجھ میں نہیں آتا کسی انسان کی مدد کرنا عذاب خریدنا ہے۔ انسان کو تو اگر خدائی دے دو تو اسے بھی خوار کر دے گا۔

تیسرا۔ اب تم باتیں نہ بناؤ۔ یا تو مجھے ساتھ نہ آنا تھا یا آئے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ خود ہی تو تم نے مدد کا سوال نکالا تھا۔

پہلا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری زینا کی نسبت اتنی بلند رائے ہے کہ میں اسے لیاقت اور نیکی کے زہر سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ میں اسے شک دے دوں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ، خوشی کے موقع پر بھی وہ شک سے آزاد نہ ہو۔ کبھی کبھی اپنے آپ پر شک کرنے لگے۔ اپنے شک پر شک کرنے لگے۔ اس قسم کے اضطراب اور کشمکش میں گرفتار رہے کہ یہی کشاکش اُس کا نغمہ ہو۔ موسیقی زندگی کا بہترین عکس ہے (دیکھ بعد دیگرے سروں کا پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرنا اس فوری زینت و موت کے سلسلہٴ ملامت کا نام راگ ہے) میں چاہتا ہوں کہ زینا کے شکوک کا ایک دوسرے کو قتل کر کے پھر پیدا ہوتے رہنا اس انداز سے ہو کہ میرا دیا ہوا شک وہ گز ہو جو زینا کی دربا سے ناز کے سر پیدا کرتا ہے۔

دوسرا۔ تم اسے شک دو گے تو میں اسے امید کی توں فرح دوں گا۔ اس میں جھول جھول کر وہ تمہارے تمام شکوک کو پھینک دے گی۔

(ایک افسر فرشتہ آتا ہے اور گہری آوازیں کہتا ہے کیا تم لونڈوں کا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا؟ کچھ کام بھی کرو گے یا یونہی دن عید رات شب برات اسب فرشتے چلنے لگتے ہیں)

(۶)

گول کرے میں تاش کا کھیل ختم ہوا۔ وہ شخص جس نے زیتا کو دھمکایا تھا کہ کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا عین اس وقت باہر نکلا جب کہ فرشتے چلنے پر تیار تھے۔ پھولوں میں عجب طرح کی خوشبو تھی۔ ان کا رنگ بھی کچھ نرالا تھا۔ یہ شخص کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا مگر ایک بڑے سے پھول کے پاس جا کر انتہائی آرزو سے کہنے لگا۔ ”زیتا کے لئے یہ کچھ، اور میرے لئے؟“ پھول نے مسکرا سا دیا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ مانگنے کے قابل تو بنو۔

فلک پیما

یادگار

نغمہ — جب ہم سر ختم ہو جاتے ہیں،
حافظہ کی گود میں جھولتا رہتا ہے۔
خوشبوئیں — جب کہ خوبصورت پھول مرجھا جاتے ہیں،
حیات میں پنہاں زندہ رہتی ہیں۔

گلاب کی پنکھڑیاں — جب کہ گلاب کملا جاتا ہے،
محبوب کی آرام گاہ پر بر سادی جاتی ہیں۔
اسی طرح — تیرے نقور میں جب کہ تو یہاں سے چلی جائے گی،
میری محبت ہمیشہ سوتی رہے گی۔

محسن علی اللہ

رشید،

یہ لغی میں؟

ساون میں ایک دن باہر جانے لگا تو ترشح ہو رہا تھا۔ کما چھتری لیتا چلوں۔ ساون کا کیا اعتبار نہ جائے یہ تقاطر کب موسلا دھار بارش بن جائے۔ لپک کر گیا، تو گو کھونٹی سے ایک چھوڑ پانچ لٹک رہی تھیں مگر سب کی سب مرست کے قابل۔ میں نے کہا لے چلوں گے ہاتھوں مرست ہو جائے۔ چنانچہ پانچوں کو بغل میں دب چل پڑا۔ ایک قدم ڈیوڑھی کے اندر اور ایک باہر تھا۔ آواز آئی، اور میں انہیں قدموں پر ٹھیر گیا۔

”اچھی! یہ کٹوری چھتریاں کہاں جا رہی ہیں آج“
”یونہی خیال آیا ذرا مرست ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ نہیں تو“

”خیر یہ تم جانو۔ مجھے شام کو چھتری چاہئے۔ یہ دھیان ہے۔“

اس گفتگو نے چھتریوں کے مضمون کو میرے دل پر نقش کر دیا۔ اس لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ میں انہیں مشت رکھ کر منفرداً حسبِ معمول کہیں بھول جاتا یا انہیں لوہار کی دوکان سے لانا کسی اور دن پر اٹھا رکھتا۔ میں نے لوہار سے مننا کہہ دیا کہ شام کو لوٹتے وقت میں چھتریاں ضرور لے جاؤں گا۔ اور جو اس میں تساہل ہوا تو مجھ سے ہوگا اس سے زیادہ کرگڑوں گا۔

پھر نے گھومتے دوپہر ہو گئی مگر بارش کا تار نہ ٹوٹا۔ ویسی ہی رم جہم برس رہی تھی۔ اور پھر مجھے چھتریوں کا خیال آیا۔ نزدیک ہی ایک قہوہ خانہ تھا وہاں گیا اور ایک میز پر بیٹھ گیا۔ یوں ہی سی دیر ہوئی تھی کہ ایک دد شیر و آئی اور میرے بالمقابل اسی میز پر بیٹھ گئی۔ وہ ہنوز کھا رہی تھی کہ میں بل ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ اُس نے مجھے آواز دی میں ٹھیر گیا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ جو چھتری میرے ہاتھ میں ہے وہ اُس کی ہے۔ نہ امت سی نہ امت۔ پسینہ چھوٹ گیا۔ باچھیں کھلانا، دانت نکالنا، آئیں بائیں شائیں کرنا، غرض غفلت آمیز معذرت کے جملہ لوازم بجا کر میں ہوٹل سے نکلا۔

اس حادثہ نے چھتریوں کے بارے میں ان کی تاکید کو تازہ کر دیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر پھرتا رہا، مگر چھتری شام سے پہلے پہنچانے کا کچھ ایسا دھوکا لگا تھا کہ باقی سب کام چھوڑ کر لوہار کی دوکان پر جا بیٹھا۔ اور اٹھ تو

چھتریاں لے کر اٹھا۔ ایک اخبار خریدا اور ٹریم میں بیٹھ کر ایسا محو ہوا کہ گرد و پیش کی خبر نہ رہی۔ مگر پھر بھی میرا ایک ہاتھ چھترپوں کے گٹھے پر پڑا تھا۔ بچا یک میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے اخبار سے اپنا سر نکال کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہوٹل والی نیک بخت میرے سامنے والی نشست پر حاضر و ناظر تھی۔ اس کے چہرے کے عرض و طول پر ایک بسیط نظم قص کر رہا تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال راز دارانہ انداز سے کہا ”آج کس کام نہ دیکھ کر مکمل تھے، خوب مال مارا ہے“ سو اس کے کہ ایک آنکھ سے چھترپوں کو دیکھتا اور دوسری سے اس کا فرو کو اور فرمایہ میں کیا کر سکتا تھا۔ کتنا جان کش خیال ہے۔
تو بہ تو بہ۔

یعنی میں ؟

ڈرامی

نغمہ محبت

(۱)

اور میں نے کہا — میرے اعضا ضعیف تھے
اور میں نے کہا — میرا خون سرد تھا
اور میں نے کہا — میرا دل افسردہ تھا
اور میں نے کہا — میرے جذبات خفتہ تھے
اور میں نغمہ محبت نہ چھیڑ سکتا تھا۔ اور میں محبت کا نام بھی نہ لے سکتا تھا
اور میں اپنے ہر بطن کے تاروں میں محبت کے رگ نہ تیرا سکتا تھا۔

(۲)

امن و صلح کے وقت محبت چرواہے کی بانسری میں سمائی رہتی ہے
جنگ کے وقت محبت دلیر اور بہادر سردار کے گھوڑے پر سوار ہوتی ہے
خوشیوں کے وقت محبت بغیر ہمالیہ و سوات اور زیورات میں آراستہ باغوں اور محلوں میں نظر آتی ہے
محبت عدالت، فوج اور قبرستان پر حکومت کرتی ہے
محبت نیچے انسانوں پر حکمران ہے اور اوپر اولیا اور انبیاء پر
کیونکہ محبت فردوس ہے اور فردوس محبت۔

محشر عابدی

(ترجمہ)

تجلیات

طبع نازک کسی کی ہونہ ملول شکوہ غم کو دے نہ اے دل طول
حُسن ہے اور تغافلِ بسیار عشق ہے اور جنونِ حُسنِ قبول
جانے لے جا کے کس جگہ مارے مجھ کو گم کردہ راہ شوقِ فضول
ہر دو عالم ہیں ایچ میرے لئے ہوں محبت میں اس قدر مشغول
ہے متاعِ وفا مری ناقص پھر بھی کر لے جو تیرا لطف قبول
واعظوں کی یہ ہرزہ گفتاری ناصحوں کی یہ پسندِ نامعقول
مجھ پہ کوئی اثر نہیں کرتی کہ محبت ہے میرا اصلِ اصول

نغمہ گل طرازِ اکبر سے

ہیں بساطِ سخن یہ پھول ہی پھول

اکبر
سروری لکھنوی

دم واپس

ایک جاؤں دونوں کی عمر ایک سو پچاس برس تھی ماں کی الگ الگ عمریں ہاں میں سے ایک کو بھی معلوم نہ تھیں۔ ہوئی انہوں نے اپنی عمروں کو علیحدہ علیحدہ شمار کرنا چھوڑ دیا تھا، اور اب وہ بلا تکلف ہر سال اپنی مشترکہ عمر میں دو برس بڑھا دیا کرتے تھے۔

اُس پستے دیہاتی مکان میں جس کی چھت کسی پرندے کے پروں کی طرح پھیلتی ہوئی دیواروں سے آگے بڑھ گئی تھی رہتے ہوئے کتنے ہی دن، کتنے ہی موسم اور کتنے ہی سال گزرتے تھے۔ اگر آج ان سے کوئی کہتا کہ تم ہمیشہ سے میاں بیوی نہیں تھے تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران رہ جاتے۔ ان کے چہروں پر ایام گزشتہ کی ایک ہلکی سی جھلک باقی تھی اور ان کی ٹسکلوں میں بہن بھائیوں بڑھ کر مشابہت تھی جب گاؤں کے لوگ ان کے اس درجہ ضعف کے باوجود ان کی اس قدر شدید الوہیت کو دیکھتے تھے تو وہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ عنقریب جب ان میں سے ایک اس دنیا سے چل بسا تو دوسرے کے لئے یہاں کی تنہائی ناقابل برداشت ہو جائے گی۔

دونوں بوڑھی جانوں کے لئے موسم سلوانا مہربان ثابت ہوا۔ اُس نے ان کے حلقوم پر زرا درشتی سے ہاتھ ڈالا، ان کی مکرکسی قدر تیز دیا اور ان کے گالوں میں گڑھے ڈال دیے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک ہندلا سا پردہ دیکھنے لگا اور وہ غنودگی کے حلق کا شکار ہونے لگی جب بہارا آئی تو چھاؤں کی فرحت انہیں کم محسوس ہونے لگی اور دھوپ کی کشفنگی انہیں بے کیف نظر آنے لگی۔ زندگی ان کے لئے ایک بارگراں ہو گئی۔ صبح سے شام کرنا ایک جاں کاہ مشقت سے کم نہ رہا۔

ایک دن جب وہ روز گزشتہ کی بنسبت زیادہ مضمحل ہو کر اپنے مکان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اُس کی بیوی خرگوشوں کے لئے گھاس لانے کے لئے باہر نکلی۔ جونہی اُس نے جنگل کے پھاٹک کو طے کیا اُس کے سانس کا آنا جانا بند ہو گیا۔ یہ سفر کی پہلی منزل تھی پھر وہ لگے بڑھی اُس مقام سے جہاں وہ ایک شریف بچے کی طرح بیٹھا تھا بڑھے کی دھندلی آنکھیں اپنی بیوی کو نہ دیکھ سکیں سگڑاں نے اُس کے قدموں کی آواز سن لی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ اپنے تصور میں اُسے جاتے ہوئے دیکھ لے۔

جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچی تو اُس نے اپنی آنکھیں ایک دفعہ زور سے کھولیں اور پھر یک لخت گر پڑی اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔

ایک اور آکر وہاں ٹھہر گیا، ایک لڑکی چھپتی کودتی پاس آکھڑی ہوئی۔ پہلے ایک اور پھر ایک اور عورت آئی لوگ ٹھاکر لکے

ن میں لے گئے انہوں نے دیکھا کہ وہ مر چکی ہے۔
گھر خالی ہو گئے۔ دوکان اور اُس کے اطراف پر سوادِ جوہم چھا گیا۔ تین کرسیاں جو بڑھیا کو ان پر لٹا دیا گیا۔ اُس کا زرداؤ
بے بجا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈر آ رہا تھا۔

کسی نے کہا ”بڈھے کو ضرور بتا دینا چاہئے“
ایک اور آواز آئی ”نہیں! اُسے نہیں، پہلے اُس کی بہو کو بتانا چاہئے۔ وہ سانسے کھڑی ہے۔ او مارگیرٹ!“
وہ انگلی، بصورت اور بالی سی۔ اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے اُس کا ڈھیلا لباس الٹک ہاتھ اور اس کے رُخسار
اور رکھی وٹی کی طرح بے روپ تھے۔ وہ دھوبن تھی اور پانی کے اثر سے اُس کے اچھے ہونے ہاتھ دو پنجوں کی طرح نکلتے تھے۔
جب اُس نے اپنے اُٹس ہر کی ماں کی لعش کو دیکھا جسے اب ایک نے مان کر چکا تھا اور جسے اب تقریباً بھول چکی تھی تو وہ سر
پاؤں تک کانپ گئی۔ اُس کے ہونٹ سفید ہو گئے اور اُس کے چوڑے چمکے چہرے میں اُس کی آنکھیں گردش کرنے لگیں اُس
ناک کو سکاڑتے ہوئے اپنی آستین سے اُسے پونچھا اور آہستہ سے کہا ”آہ! اس کا بیچارہ خاوند!“

کسی کی طرف دیکھے بغیر عجب بے ڈھنگے پن سے جوہم کی طرف مڑی اور کہنے لگی ”بڑھیا کی موت کی خبر سے کوئی نہ سناے
اُسے خود بتاؤں گی۔ اور اُس نے اپنے چہرے کو ایک ملتھجیانہ انداز سے حرکت دی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے لوگوں نے جانا شروع کیا یہاں تک کہ ذرا سی دیر میں سارا مجمع منتشر ہو گیا۔
مارگیرٹ نعش کو اٹھوا کر اپنے بستر پر لے گئی۔ پھر جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے بڈھے کے پاس پہنچی۔ اپنے گھر کے سامنے
صفت کی اُسی پر نما افزائش کے نیچے وہ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

لکڑی کا پچھاٹک کھلا تو اُس کی آواز سے چونک کر اُس نے اپنا سراوپر کو اٹھایا۔
مارگیرٹ نے کہا ”میں ہوں بابا۔“ وہ پھر ایک بت کی طرح بے حرکت ہو گیا ”آؤ اب گھر چلنے کا وقت ہے۔“
اُس نے ایک آہ کی اور اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ایک آہ کی۔ اُس نے ہاتھوں کو آگے کی طرف پھیلا کر ملانا شروع کیا۔ اُس کے
سر میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

مارگیرٹ نے کہا۔ ”کیوں کیا ہے بابا؟“

اُس نے جواب دیا ”مجھے نظر نہیں آتا، مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی!“

”آہ! مارگیرٹ نے کہا۔ اور بلاشبہ اُس کی روح کی سادگی تھی جس نے اُسے اتنے بڑے بڑے حادثوں کے لئے تیار کر دیا کہ اس
کی زبان سے اس ایک لفظ کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اُس نے اُس شخص کا ہاتھ تھام لیا جس کی آنکھیں اپنے انہی رفیق کے چھپ چکا
کے بعد اب دیکھنا ہی نہ چاہتی تھیں۔

اپنے پاؤں کو گھسیٹتا ہوا وہ نعمت خانے میں پہنچ گیا۔ اُس نے ایک کرسی کی پشت کو چھوا اور اس پر بیٹھ گیا، مگر اس کی نشتی سے چل رہی تھی۔ وہ آپس بھرتا کر اہٹتا اور جوتھی وہ اُسے بتانے کے لئے منہ کھولتی وہ چلانے لگتا۔

”یہ اب بس ہو چکی ہیں۔ میری آنکھیں! آہ ابھی یہ دکھ باقی تھا!“

گھنٹوں تک وہ غم و الم میں ڈوبا رہا۔

ایک لمحہ کے لئے جب اسے ذرا ہوش آیا تو اُس نے پوچھا: ”وہ کہاں گئی؟ خدا کے لئے، وہ کیا کر رہی ہے؟“ تاہم کے دواؤں کے درمیان مارگریٹ نے دیکھا کہ اُس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور وہ اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر وہ شکایتیں کرنے لگا۔ آٹھ میں پھر ایک حملہ ہوا۔

بہت سے لوگ آئے بعض اندر پہنچے اور بعض کھڑکیوں ہی میں سے دیکھ کر چلے گئے مگر کسی کو اس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سارا دن یوں ہی گزر گیا اور یہ جاں کاہ خبر اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اب کسی کو اُس کے قریب آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

ذقنا فوقتا مارگریٹ اُس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے آنسوؤں سے بھرے ہوئے چہرے کو صاف کرتی ہوئی اُٹھ دوڑتی۔ وہ بار بار بڑھیا کو دیکھنے کے لئے جاتی تھی جو باوجود دوشمنوں کی روشنی کے رات کی تاریکی میں نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ پھر وہ تجھیز و تکفین میں مصروف ہو گئی۔ ہر طرف اُس کا خیال تھا۔ وہ تھک کر چڑھ رہی تھی مگر بار بار بھاگ دوڑ میں مصروف تھی۔ وہ دیرانہ مصیبت کا مقابلہ کر رہی تھی اور اُس کی شدت سے مغلوب نہ ہوتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُسے کیا کیا کرنا چاہئے۔ وہ جو مجسم سوگ تھی۔ وہ جسے پس ماندگی کی اب عادت ہو چکی تھی!

شام اور رات کے درمیان وہ ایک مرتبہ پھر اُس کے پاس پہنچی۔ اب اُس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہو چلا تھا۔ مارگریٹ نے ایک چھوٹا سا لیمپ جلا کر اٹھ بیٹھی پر رکھا اور دل میں سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اسے بتا دیا جائے کہ وہ جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہتی تھی آج تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ نحیف و ناتواں کانپتی ہوئی وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کا سراسر طرح جھک رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی جرم پر نادم ہو۔ اُس نے اپنی ساری قوت کو یوں مجتمع کیا جیسے وہ چلانے لگی ہے مگر اُس کی زبان لڑکھرائی اور اُس نے کہا ”وہ اب کبھی۔۔۔۔۔ واپس نہ آئے گی۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ وہ چلی گئی۔“

بڑھا خاموش رہا۔ مارگریٹ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سکا رہا تھا۔ اور سو رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی اور نہایت احتیاط سے کمرے کی اشیاء کو درست کرنے لگی۔ یکایک بڑے سے حرکت کی اور اُس کو بلایا۔ وہ اُس کے اس قدر قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اُس کے ہاتھ کو چھو سکتا تھا۔

سنو میری بیٹی۔ اُس نے کہا ”یہاں آؤ اور سناؤ۔ وہ واپس آگئی ہے۔ وہ ہمیں ہے۔ میں نے اُسے ابھی وہاں دیکھا“
 جہاں اس وقت تم کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا اور یکا یک مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہمیں ہے۔ اُس نے کمرے کی چیزوں کو ترتیب
 دیا اور پھر چلی گئی۔ میں جان بوجھ کر بے حرکت اور خاموش ہو رہا۔ سنو، میں نہیں چاہتا اُسے معلوم ہو کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔
 میں نہیں چاہتا۔ اس سے اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ اُسے اُس وقت تک مجھ سے دور رکھو جب تک
 میں پھر اچھا نہ ہو جاؤں۔ کسی تدبیر سے، میری بیٹی“

اُس نے ذرا پہلو بدلاتو پرانی کرسی میں سے کراہنے کی سی آواز اٹھی۔
 ”اُسے لے جاؤ۔ ایک یا اگر ضرورت ہو تو ایک سے زیادہ دنوں کے لئے اسے کہیں لے جاؤ اُس سے کہو۔ اُسے لے جاؤ“
 ”اچھا بابا، میں اُسے لے جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں اُسے تمہاری بیماری کا علم نہ ہوگا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی
 ہوں اُسے علم نہ ہوگا“

بڑے آدمی پر قسم کا بڑا اثر ہوا اور اُس نے کہا ”تو بہت اچھی لڑکی ہے“ پھر وہ خاموش ہو گیا۔
 دوسرے دن مارگریٹ نے ایک جھوٹی کمانی بنا کر سنا دی کہ بڑھیا کو اُس کے رشتہ دار اپنے ساتھ گھر لے گئے ہیں پہلے
 وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح حیرت آمیز دلچسپی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ جب اُس نے بات ختم کر لی تو وہ کہنے لگا ”نگر
 وہ پھر واپس آگئی ہے۔ گزشتہ شب میں نے سوتے میں اُس کی آواز سنی تھی“
 مارگریٹ نے نرمی سے کہا ”ہاں ہاں وہ آگئی تھی“

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ بڑھیا کو دفن کرنے کے بعد دوسرے دن جب ڈاکٹر بوڈرے وکٹر کو دیکھنے آیا تو اُس نے
 خلاف توقع کہا کہ ”حالت بہت اچھی ہے۔ بجا تقریباً اتر چکا ہے اور گرمی کم ہو رہی ہے۔ کل وہ دیکھنے لگے گا۔“
 وہ مضبوط الحواس ہو کر ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔
 ”ہاں۔ کل۔ کل۔“

اپنی تاریک روح کی گہرائی میں مارگریٹ نے بھی ایک مرتبہ اس لفظ کو دہرایا ”کل“!
 کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا، اور پھر آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اُسے نہ دیکھ سکے گا۔ اکل مارگریٹ کے دل میں
 اپنی خاموشی پر اُس کے اُس بوجھ سے شے کو بھی ایک جھجکا لگے گا جو شاید اُس کے ہل اٹھنے پر بھی محفوظ نہ رہ سکتا۔ یہی
 زندگی کا قانون ہے۔ زندگی میں ہمیشہ ایک کل ایسی آتی ہے جس کا انجام بخیر نہیں ہوتا، اور امن اور امید کی وہ صبح جو کبھی
 کسی ایک کو حاصل ہوتی ہے ہمیشہ کسی دوسرے کے لئے شام کا پیغام لاتی ہے۔

غزل

مجھ سے حالِ دلِ فگار نہ پوچھ سختیِ جورِ روزگار نہ پوچھ
 غرق ہے کیف میں جہانِ وفا بیخودی تائے انتظار نہ پوچھ
 کیا ستم ڈھارہی ہر رندوں پر مستیِ ابرِ نوہار نہ پوچھ
 رنگِ ناکامیٰ مراد نہ دیکھ بے کسی تائے بے شمار نہ پوچھ
 دل میں اک حشرِ آرزو ہے بپا شوخیِ حسنِ فتنہ کار نہ پوچھ
 کیوں کسی کو کسی کی باتوں پر آہی جاتا ہے اعتبار نہ پوچھ

جی بھر آتا ہے حالِ دل کہتے

مجھ سے مضطر تو بار بار نہ پوچھ

رام رتن مضطر

پراسرار قیدی

(۱)

قیدی جس وقت کٹہرے کے پیچھے اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تو تمام عدالت میں سنا ملنا چھا گیا۔ اُس نے مقدمہ کی پیروی شروع کر دی۔

وہ ایک نحیف الجتہ آدمی تھا، جس کی بے رونق آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں اور زرد چہرہ اس کے جذباتِ غم کی پوری ترجمانی کر رہا تھا، مقدمہ کی سماعت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص کبھی صرفیوں کے مقدس گروہ میں شامل تھا مگر ایک سخت جرم کے ارتکاب کی وجہ سے اسے یہ زندگی ترک کرنی پڑی۔ قیدی پانچ دن سے اپنے مقدمہ کی پیروی کر رہا تھا اور اس دوران میں اُس نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ تعلیم کا کافی ثبوت دیا تھا۔ اُس کے لئے یہ معاملہ موت اور زبیت کا معاملہ تھا مگر اُس کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس کے خلاف ثبوت دے رہا تھا، اور عام عدالت میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جسے اُس کا خوفناک انجام نظر نہ آ رہا ہو، اُس نے ہر قسم کی قانونی امداد حاصل کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا، اور خود ہی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ جج، جیوری، سرکاری وکیل، تماشائی، عدالت کے ملازمین غرض سب اطمینان کے ساتھ قیدی کی تقریر سن رہے تھے، مگر شخص نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ قیدی کو بے عروقی اور بدنامی کی تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور وہ اپنے تحفظ کے متعلق کتنا بھی کہے وہ بالکل بے وقعت سمجھا جائے گا۔

”مائی لارڈ اور حضراتِ جیوری“

جو نہی کہ یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں پہنچے، تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی، اور تماشائیوں کی نگاہیں کٹہرے کے پیچھے قیدی کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس کی صورت سے ناامیدی اور ہراس کے آثار نظر آ رہے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا جرم کس قدر خوفناک تھا یا یہ کہ اس نے مقدمہ کی کارروائی کے دوران میں کتنو محک دلی کا ثبوت دیا تھا، انسانوں کے اس انہوہ کثیر میں قیدی کے ساتھ عام مہمردی اظہار کیا جا رہا تھا۔ اب شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور بیچ کے ایک قلیل وقفہ کے علاوہ عدالت کا اجلاس صبح۔ اس وقت تک برابر ہو رہا تھا۔

خود قیدی کے چہرے سے تھکان کے آثار نمایاں تھے، مگر اُس نے تمام ناامیدیوں اور بے چینیوں کو نظر انداز کر کے اپنا سراہنچا کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا، پھر کامل عزم و استقلال کے ساتھ تقریر شروع کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک قابل بیان واقعے کو نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کر رہا تھا۔ وہ تقریر کے دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رکا بلکہ مسلسل فرلے بھرتا چلا گیا۔

شروع شروع میں جج رحم آمیز حیرت کے ساتھ قیدی کی تقریر سنتا رہا۔ وہ افسوس کر رہا تھا کہ کتنا قابل اور تعلیم یافتہ آدمی ایک خوفناک جرم کے ارتکاب کی وجہ سے انسانیت کے ذلیل ترین گڑھے میں گر پڑا ہے اور

اب

اب سات بج چکے تھے مگر قیدی بغیر کسی تھکان یا دماغی اضطلال کے برابر بول رہا تھا اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس میں کہیں سے نئی طاقت برابر چلی آرہی ہے۔

”نہیں حضرات جیوری، اس کا کوئی علاج نہیں ہے، قیدی کو اپنی صفائی کے لئے بہت سے معاملات پر روشنی ڈالنی ہے، اُن پر زور دینا ہے، اور جب تک اُس کی تقریر معقول اور متعلق باتوں پر مشتمل ہے اُس کو دنیا کا کوئی قانون بند نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے۔“

عدالت دوسرے دن صبح گیارہ بجے تک کے لئے متوی کر دی گئی، اور جیوری کے آدمی اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف چل دیئے۔ قیدی کے دبلے پتلے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بھی اپنی کوٹھڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

صبح ہوئی مگر ناخوشگوار اور افسردہ۔ جج کے داخل ہونے سے پہلے ہی اجلاس کا کمرہ تماشاخیوں سے بھر گیا تھا۔ قیدی کو اندملا گیا جس نے گھستے ہی جیوری اور جج کی طرف جھک کر مودبانہ سلام کیا اور وگوں کی قطار پر ایک حیرت آمیز نظر ڈالی، مجمع کی بے قراری پر مسکرایا اور کل شب کی بقیہ تقریر پھر شروع کر دی۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ایک قلیل وقفہ ہوا جس میں قیدی نے نیچے جا کر کچھ شربت وغیرہ پیا اور جب عدالت کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو وہ بالکل تازہ دم اور مستعد نظر آ رہا تھا۔

جیوری کے ارکان اونگھ رہے تھے، اور ہل ہل کر بار بار جانیاں لے لے کر گھنٹے کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ جج بھی مبصر ہو چکا تھا، اور اس لئے اُس کے چہرہ سے ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا، جو نہی کہ پانچ بجے

جٹیش میں آکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ ہلا کر کہنے لگا خاموش!

قیدی نے تقریر بند کر دی۔

جج نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا ”مجھے تمہارے مقدر سے کوئی تعصب یا بغض نہیں ہے مگر عدالت کا

وقت بھی بے کار ضائع نہ کرنا چاہئے“

”مائی لارڈ۔۔۔۔۔“

جج نے ہاتھ ہلا کر اُسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

اُس نے پھر کہا ”میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں“

جج نے گھٹنے کی طرف دیکھ کر کہا ”بہت اچھا اب عدالت کا اجلاس اُس وقت تک ہوتا ہے گا جب

تک تمہاری تقریر ختم نہ ہو جائے۔ اس میں خواہ آدھی رات ہی کیوں نہ لگ جائے“

جیوری کی طرف سے اس فقرہ پر عجیب عجیب چہرے گویاں شروع ہو گئیں مگر قیدی کے چہرے

پر سرت کی ایک عجیب لہر دوڑ گئی۔

قیدی نے جھک کر مودبانہ عرض کیا ”مائی لارڈ! آپ جیسا بھی مناسب خیال فرمائیں“

دس بجے کے قریب جج نے دوستانہ لہجہ میں قیدی سے شکایت کی کہ وقت حد سے زیادہ گزر گیا ہے اور اب

اسے اپنی تقریر بند کرنی چاہئے مگر قیدی نے کہا ”مائی لارڈ! مجھے ان لوگوں کی تکلیفوں کا خوب احساس ہے

اور حد درجہ افسوس بھی مگر کیا کروں یہ معاملہ میری موت و حیات کا سوال ہے“ جیوری کے ارکان کی طرف مخاطب

ہو کر کہا ”حضرات آپ کو جو رحمت اٹھانی پڑی اُس کا مجھے مدد درجہ افسوس ہے مگر میرا یہ بھی ایک فرض ہے کہ اپنی

جان کی حفاظت کروں اور آپ جانتے ہیں جان سب چیزوں سے اعلیٰ و ارفع ہے اور اس کے آگے ہر چیز بیچ

ہے۔ چنانچہ میں آپ لوگوں کی اجازت سے پھر تقریر شروع کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

جج نے غصہ میں کھڑے ہو کر کہا ”عدالت کا اجلاس کل گیارہ بجے تک کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے۔“

(۳)

ساتویں دن کی صبح کو جیوری کی طرف سے ایک شکایت نامہ موصول ہوا جس میں مذکور تھا کہ وہ لوگ جنہیں

اپنے کاروبار اور اپنے بال بچوں کی فکر ہے چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس لائننا ہی تقریر کی مصیبت سے انہیں نجات

دلائی جائے۔

غرضی کا خلاصہ یہ تھا کہ قیدی کو پھانسی دے دو۔ بہت ممکن تھا کہ جج اس پر برضا و خوشی عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتا مگر اس نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور کہا کہ انہیں ابھی قدرے توقف کرنا چاہئے۔

قیدی پہلے سے زیادہ تازہ دم اور مستعد کٹڑے میں داخل ہوا، اور اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنی سابقہ تقریر کے بقیہ حصے کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس حرکت پر تمام عدالت میں ایک ہنسنے پڑا۔

جج نے کہا ”خاموش“ ملازموں نے بھی ایک زبان ہو کر کہا ”خاموش“ تمام مجمع اور چند بیرسٹروں کو اس

خاموش ”پر بڑبی ہنسی آئی“

لنچ کے بعد جج نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ”درمتمیں اپنا بیان مختصر کر دینا چاہئے کیونکہ تم دو دن سے برابر بول رہے ہو، اور میں اپنی ذمہ داری کو کافی طور پر محسوس کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ مواد کو دبے بہتر بنا رہا ہے۔“

قیدی نے گردن جھکالی اور کہا ”مائی لارڈ! میں آپ کی اس تکلیف کے لئے جا آپ نے میری تقریر اطمینان قلب کے ساتھ سننے میں اٹھائی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ چونکہ اب تک میں نے اپنی صفائی کے اصل معاملہ کو بار نہیں چھیڑا اور صرف چند تمہیدی باتوں پر زور دیا ہے اس لئے۔“

آخر کار جج بھی مجبور ہو کر کرسی میں لیٹ گیا۔

قیدی نے پھر کہنا شروع کیا ”مجھے پھانسی کیوں دینی چاہئے اس کے لئے صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے مگر پھانسی کیوں نہیں دینی چاہئے اس کے لئے میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں، چنانچہ میں ان دلیلوں کو ترتیب کے ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اور معزز حضرات جیوری کا قیمتی وقت صرف ہو گا خیر، اب میں شروع کرتا ہوں۔“

جج نے چلا کر کہا ”میں ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ عدالت کا قیمتی وقت اس طرح بے کا ضائع کیا جائے۔“

”مائی لارڈ“

قیدی کی آواز بہت درد انگیز اور شکستہ معلوم ہو رہی تھی، وہ آزدہ خاطر ہو کر اپنے کٹڑے میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا ”آپ مجھے پھانسی دے دیں یہ اور بات ہے مگر یہ یاد رہنا چاہئے کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا کافی موقع نہیں دیا گیا۔“

تمام عدالت میں خاموشی چھا گئی جو بالآخر کتابوں اور کاغذوں وغیرہ کے اٹھانے، رکھنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ سچ اور وہ کلام اعلیٰ سے مشورہ کر رہے تھے۔

بالآخر جج نے کھڑے ہو کر کلام عدالت کل صبح تک کے لئے ملتوی کی جاتی ہے“
یہ کہ کردہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ جو ایسے وقت مناسب تھی، کمرہ عدالت کی باہر چلا گیا، جیوری کے کئی طرف سے غصہ میں بھری ہوئی لعنت ملاست کی آوازیں آرہی تھیں مگر قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت اور لبوں پر تبسم تھا۔

(۴)
جب جج آٹھویں دن عدالت میں آیا تو بیٹھنے ہی بولا میں نے سرکاری انسٹرکشن قانون سے مشورہ کر لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قیدی کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کافی موقع دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس لئے انہیں واقعات سے سوکا رکھنا چاہئے جن کا مقدمہ سے براہ راست تعلق ہو وہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر خواہ مخواہ طوالت نہ پیدا کرے۔“

قیدی نے پھر اپنی لائننا ہی تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا، مگر اب اس نے اپنے طریقے میں کسی قدر تبدیلی کر دی تھی، چنانچہ روتے سخن میں بھی ایک خاص فرق نظر آ رہا تھا، — اب وہ نہایت آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور اس کی تقریر پہلے کی طرح غیظ آلود نہ تھی بلکہ اس سے نہایت متانت کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ بہت ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک بات پر زور ڈال رہا تھا، اور ہر مستند آدمیوں کے واقعات بیان کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت چرب زبانی کے ساتھ مختلف کتابوں، مقدمات کی کارروائیوں، شہادتوں کے قانون اور صحت واقعہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق سینکڑوں کتابوں کے حوالے دے دے کر اپنے مافی الضمیر کو واضح کر رہا تھا۔ متعدد مرتبہ اسے خاموش ہونے اور جوش کو قابو میں رکھنے کے لئے کہا گیا مگر ایسی ہیسیوں کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک بالکل غیر متعلق اور طویل بحث چھڑ جاتی تھی اور پھر انسروں کو بار بار مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ آج جج نے بھی تمام دن مقدمہ کی کارروائی اؤٹکھ اؤٹکھ کر سنی، جیوری کے لوگ مسکرا مسکرا کر قیدی کی طرف کسی قدر ترش روئی کے ساتھ گھورنے لگے تھے۔ تاہم انہوں نے مجمع میں بھی اس لائننا ہی اور تکلیف دہ تقریر کے سننے کی تاب نہ رہی تھی اور اب اس کی طرف بے اتفاقی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بہر حال اس طرح یہ دن بھی گزر گیا۔ اور سات بجے عدالت کا قدرتی التوا یقینی امر تھا

(۵)

دوسرا مہینہ بھی گزر گیا، مگر قیدی برابر بول رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں ایک دفع جج نے کچھ مداخلت کی

تو اس کے جواب میں قیدی نے کہا ”خواب عالی، یہاں تک میں نے صرف اُس معاملہ پر زور دیا ہے جو جسم کے قریب چاقو پڑا پانے کے متعلق ہے، حالانکہ ابھی مجھے بہت سی باتیں اس پر تمام عدالت میں کامل خاموشی چمپا گئی اور تمام لوگوں نے ایک تھر تھری سی محسوس کی (خود جسم کے متعلق عرض کرنی میں پھر اس کے بعد ٹوٹا ہوا گلاس، سفید سفوف، باہرین کیمیا کے تجزیے، اسکا بجرم کا وقت، ہوسم، اس رات کو چاند کی خاص ہدیت، پولیس اور ہوم آفس کی شہادتیں، اُن کی صحت و عدم صحت اور پھر سب سے بڑھ کر خود کشی کا مسئلہ، غرض ابھی تو سینکڑوں مسائل تشنہ ٹکھیں ہیں۔ مثلاً وقوعہ کی شب کو میں ایک نیم سرکاری جلسہ میں مدعو تھا، اور اب اس جلسے کے حاضرین کی فہرست مجھے مل گئی ہے۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ آٹھ سو سات گواہوں کو جو میری عدم موجودگی کا ثبوت دیں گے یکے بعد دیگرے عدالت میں پیش کروں، جن کے متعلق میں چند تعارفی الفاظ بھی کہتا جاؤں گا، اور پھر۔۔۔۔۔۔“

جج نے اس جملہ معترضہ کو روکتے ہوئے کہا ”اچھا حضرت آگے بیان کیجئے، خدا کے لئے کہو! آگے کیا کہنا چاہتے ہو“

قیدی نے وہ دن بھی اعتراضات کے جوابات میں گزار دیا جو چاقو کے متعلق کئے گئے تھے، اور آخر میں اس نے کہا کہ ”حضرات جیوری میں کل اُن اعتراضات کے جواب دوں گا جو پولیس کی اُس رپورٹ کے متعلق ہیں جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ میرا جسم بے حس پڑا ہوا پایا گیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بات۔۔۔۔۔۔“

جج نے قطع کلام کر کے غصہ میں بھری ہوئی آواز سے کہا ”اجلاس ملتوی کیا جاتا ہے“

(۶)

نویں ہفتہ کی صبح کو جب کہ قیدی نے کامل دو گھنٹے اپنے آٹھ سو سات گواہوں میں سے چند کو پیش کرنے میں گزار دیئے تھے ارکان جیوری نے جج سے چند منٹ کے لئے رخصت چاہی تاکہ اُس سوال کے متعلق جو جج نے اُن سے کیا تھا غور و فکر کر سکیں۔

چنانچہ انہیں تھوڑی دیر کے لئے چلے جانے کی اجازت فوراً مل گئی، اور اس اثنا میں جج نے شاہی مشیر ایک مختصر مشورہ کرنا شروع کر دیا۔

مشیر نے پوچھا ”نوکیا، مائی لارڈ! اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا جاسکتا؟“

جج نے ایک لمبی سانس لے کر کہا ”کچھ نہیں“

مشیر نے دریافت کیا ”کیا اُسے جب تک وہ چاہے تقریر کرنے کی اجازت دی جائے گی اور اس کے سو“

کوئی سفر نہیں ہے۔“

ارکانِ جیوری عدالت کے کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہوئے۔ جج نے پوچھا کیا آپ حضرات اپنے فیصلہ پر متفق ہو گئے ہیں؟
جو شخص سب سے آگے تھا اُس نے کہا ”ہاں، بیشک، جناب والا، ہم نے اس قیدی کو بالکل بے گناہ پایا۔“

کچھ کچھ بھڑی ہوئی عدالت میں سناٹا چھا گیا اور لوگ ایک دوسرے کا منہ میٹھنے لگے۔
جج نے کہا ”مسٹر جان تمہارے ملک کی جیوری نے تمہیں اُس الزام سے جو تم پر لگایا گیا تھا بالکل بری پایا ہے اور تمہیں آزاد کر دینے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تم نے اپنی صفائی کی تقریر میں دیہاں تک پہنچ کر اُس کی آواز رک گئی، غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ دماغی جوہر کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے میں نہایت زوردار الفاظ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی خداداد قابلیتوں کو کارآمد کاموں میں صرف کرو، نہ یہ کہ ایک قابلِ نفرت جرم کے ارتکاب کی تردید میں مشغول رہو۔ جان اب تم آزاد ہو اور جاسکتے ہو۔“
”مائی لارڈ مجھے ابھی چند الفاظ اور کہنے ہیں۔“

فقہ ختم ہونے سے پہلے ایوانِ عدالت میں سے مجمع منتشر ہونا شروع ہو گیا اور ایک منٹ کے بعد کمرے میں سوائے قیدی کے اور کوئی نہ رہا۔

قیدی کے چہرے پر ایک عجیب مسرت نمایاں تھی۔
”میرے چند الفاظ“ اُن کے تمام اعتراضات کا ایسا مسکت جواب ہوتے کہ اُن کے دانت کھٹے ہو جاتے۔ مگر خیر۔“

یہ کہہ کر وہ بھی کاروبار میں مصروف بازار میں ایک طرف کوچل دیا۔

ظفر قرشی دہلوی

بچپن کی یاد

بچپن کا راز کیا ہے لے دل ذرا بتا دے
جس سے دل حُزب کو بچپن کی یاد آئے
آئے نئے نئے تھے جس وقت ہم جہاں میں
دنیا کی کلفتوں سے دل تنگ آ گیا ہر
کیا بات سے جو ایسا خاموش ہو گیا ہر
شورِ جہاں ہے مجھ کو مانسِ شورِ محشر
ہستی کی آہ میں ہے ہر ہر قدم پھوٹ
محفوظ ہوں سدا میں آشوب سے جہاں کے
اے سازِ زندگانی مدت سے منتظر ہوں

بچھڑے ہوئے دنوں سے اک بار پھر ملا دے
تو اے ربابِ ہستی وہ راگ پھر سنا دے
وہ عافیت کا منظر اک بار پھر دکھا دے
گودی میں عاطفت کی تو پھر مجھے لٹا دے
اک بار پھر پرانے نعموں سے دل ہلا دے
پیاری سی دھن سنا کر تو مست پھر بنا دے
مہرِ پدر کی انگلی پھر رابہر بنا دے
آغوشِ مادری میں تو پھر مجھے سُلا دے
تو زخمِ ازل سے تاروں کو پھر سجا دے

آوازِ جن کی اب تک کانوں میں گونجتی ہے
وہ بے خودی کی تانیں ناآشاد پھر سنا دے

رام پریشاد کھوسلا
ناآشاد

جیتوا

افراد

جیتوؤں کا ایک گروہ جس میں ایک بڑھا، اُس کا جوان بیٹا، بیٹے کی بیوی، سات برس کا ایک بچہ، ایک بے باپ کی سچی، اُس کی ماں اور دو اور نوجوان ہیں۔
دو بڑھے لکھے مالدار نوجوان، ایک سرکاری اہل کار، اُس کی بیوی اور گاڑی بان۔

پہلا سین

سنان راستہ موسم سرما کی ایک شام عورتیں اور مرد بیٹھے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی سردی سے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ بڑھے کے پاس صرف ایک چادر ہے۔ جوانوں کے ہاتھ میں پٹلیاں ہیں۔ لڑکا ننگے سر ننگے پیر ہے اور آدھی باہوں کی کرتی پہنے ہے۔ لڑکی کے بدن پر ہاتھ بھر کا ایک کپڑا ہے۔ عورتوں کے پاس اور بچے کو کچھ نہیں۔
نوجوان (اپنے باپ سے) بابا یہاں کیوں بیٹھے رہے ہو، آگے چلو۔

بڑھا۔ آگے کہاں چلیں؟

نوجوان۔ کہیں چلو۔

بڑھا۔ چلتے چلتے دن بھر تو ہو گیا۔ اب پاؤں کام نہیں کرتے۔

نوجوان کہیں ٹھکانے تو اچھا ہے۔ یہاں نہ کنواں ہے، نہ کوئی بستی ہے۔

بڑھا۔ یہاں سبھی کہاں رکھی ہے ہم نے تو کہا تھا کہ اسی گاؤں میں ٹھہر جائیں، مگر تو نے نہ مانا۔ یہاں سے دوسرا گاؤں نہ جانے کتنی دور ہوگا۔

لے چیت کی فصل کاٹنے والے مزدور، فصل کے مینے میں ان کے گردہ کے گردہ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

دوسرا نوجوان - مگر بابا یہاں تو سڑی سے ٹھٹھر جائیں گے۔ کیسے گھام میں چلو۔
 بڈھا - چلو، گھام میں چلو۔ اس سے تو ٹھٹھر جائیں سوا چٹھا۔ اس جنجال سے نوپران بچیں گے۔
 (دونوں نوجوان گھوم کر واپس آئے ہیں۔ دونوں اور در کوٹ پہنچے ہوئے ہیں۔ آپس میں باتیں کر رہے ہیں)
 بڈھا - بھتیجا، یہاں سے گاؤں کتنی دور ہوگا؟
 (دونوں رک جاتے ہیں)

پہلا نوجوان - یہاں سے دو کوس ہے۔
 بڈھا - تب تو بڑی دور ہے۔
 نوجوان - تم لوگ کہاں جاؤ گے؟
 بڈھا - کہاں بتائیں، جہاں جگہ ملے۔
 کسان نوجوان - مہاراج، ہم چیتوا ہیں۔ سنا تھا کہ ٹپنے یہاں چیت کٹنے لگا ہے مگر ابھی تو یہاں لگا بھی نہیں لگا۔
 نوجوان - تم لوگ چیتوا ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟
 بڈھا - مہاراج سیاوری سے آئے ہیں۔ کل دوپہر کو چلے تھے۔ ساتھ میں جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب کیا کھائیں؟ کہاں جائیں؟

نوجوان - سیاوری تو بہت دور ہے۔ یہاں سے ساٹھ میل ہوگی۔ تم لوگ برابر چلتے آئے ہو؟
 بڈھا - اور کرتے کیا مہاراج!

نوجوان - مگر تم لوگوں نے بڑی بھول کی۔ پیچھے جو بنی تھی وہاں کیوں نہ ٹھہر گئے؟
 بڈھا - ٹھہر کر کیا کرتے؟ جتنا آگے نکل جائیں سوا چٹھا۔ یہی سوچ کر چل پڑے۔ ابھی ایک آدمی ملا تھا۔ کتنا تھا سیری میں چیت کٹنے لگا ہے۔ لیکن مہاراج فصل تو ستیا ناس ہو گئی، ہم لوگ کاٹیں گے کیا۔ اس آدمی کے پاس ایک گٹھری تھی۔ کتنا تھا، آدھ سیر دانے نہیں نکلے۔ پھر ہم سیری جا کر کیا کریں گے؟ درک کر مہاراج، سیری کتنی دور ہوگی؟

نوجوان سیری یہاں سے آٹھ میل ہے۔ تم ایسی سڑی میں اب آگے کہاں جاؤ گے۔
 بڈھا - مہاراج، کھانے کے لئے تو کچھ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ سویرے ایک مٹھی جنوں سے پانی پی کر چلے تھے دن بھر پانی کے سہارے ہی یہاں تک چلے آئے۔ مگر اب تو بھوک سے پیٹ جل رہا ہے۔ آنکھیں مندی جا

رہی ہیں۔ اپنی کچھ نہیں۔ پیٹ باندھ کر سو رہیں گے۔ مگر یہ لڑکا ہے، چھوٹی لڑکی ہے، بھگوان کی دیا سے اُن کے لئے کچھ مل جاتے تو اچھا ہے۔

دوسرا نوجوان داوور کوٹ میں سردی سے کانپتے ہوئے کیوں جی، تنہا رہے اور کپڑے کہاں ہیں؟ پہلا نوجوان۔ دیکھتے نہیں۔ بیچاروں کے پاس اور کپڑے کہاں رکھے ہیں؟ جو کچھ ہیں سو یہی ہیں۔ بڈھا۔ ہمارا ج آپ دیکھ تو رہے ہیں۔ انہیں کپڑوں سے کسی طرح رات کٹ جائے گی۔ بھگوان سب کا مالک ہے۔ نوجوان داوور کوٹ کی جیب ٹٹول کر اپنے ساتھی سے انہیں کچھ پیسے دے دیں۔ دوسرا نوجوان۔ اچھی بات ہے۔

پہلا نوجوان درپیشان ہو کر میری جیب تو خالی ہے۔

دوسرا۔ پھر حلو۔

پہلا۔ چلتے ہیں۔ ذرا اپنی جیب دیکھ لو۔ کچھ ہو تو ان بیچاروں کو دے دیں۔

دوسرا۔ میری جیب میں سگریٹ کی ڈبیا ہے۔

پہلا۔ تو کیا وہ سگریٹ کھائیں گے؟

دوسرا۔ کیا ہوا، پی تو سکتے ہیں۔

پہلا۔ چپ رہو۔ (پھر پریشان ہو کر بڈھے سے) بھائی اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں۔ نہیں تو تمہاری کچھ مدد کر دیتے۔

بڈھا۔ بھگوان تمہارا بھلا کریں، ہمارا ج۔ نہیں ہیں تو جانے دو۔

(دونوں نوجوان آگے بڑھتے ہیں)

پہلا نوجوان۔ تمہیں ان لوگوں پر ترس نہیں آتا؟

دوسرا۔ آتا کیوں نہیں۔ مگر جیسی حالت ہماری ہو ویسی ان کی۔ ہم اور وہ ایک سے ہیں۔

پہلا۔ تم تو وحشی ہو۔

دوسرا سین

(وہی چہنڈوں کا گردہ۔ لڑکا ماں کی گود میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ بڈھا چپ چاپ ہے۔)

پہلا نوجوان۔ بابا، اب تو بھوک سے بڑا حال ہے۔ پانی پی پی کر کہاں تک پیٹ بھریں منہ سوکھ رہا ہے آنکھوں کے سامنے تلکے چھوٹ رہے ہیں ہم سب تو سہلے گے، مگر تین نے سویرے کچہ نہیں کھایا۔ وہی چنے کھاتے تھے۔ بڑھا۔ نہیں کھایا تو کیا کریں کسی نے کچہ نہیں کھایا، بتاؤ کیا کریں، مر جائیں؟ تو ہی سب کو گھیر کر یہاں لے آیا ہے۔ کتنا تھا چیت کٹنے لگا۔ اب تباہاں چیت کہاں ہو گیسوں میں جان نہیں رہی چنا اوپر سے دیکھو تو پیلا ہے، اندر سے اینٹھ کر کالا پڑ گیا ہے۔ پھر آدمیوں کا کیا ہو؟ بھس کھا کر جئیں گے۔

(ساتھ کے دو نوجوان الگ باتیں کر رہے ہیں)

پہلا نوجوان۔ جی پانتا ہے یہ کالی مٹی کھا جائیں۔

دوسرا نوجوان۔ لگتی تو بڑی اچھی ہے۔ تم نے کبھی کھائی ہے؟

پہلا۔ تھوڑی سی مٹی اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے اسے یہ تو بڑی اچھی لگتی ہے سو نہ مٹی سو نہ مٹی باس آتی ہے۔

دوسرا۔ تو پھر چلو اسی مٹی سے پیٹ بھر لیں اور سو جائیں۔ سویرے دیکھا جائے گا۔

پہلا۔ پاگل اس طرح نیند آجائے تو سب جھگڑا ہی نہ چک جائے۔ بھوک سے آنٹیں سکڑ رہی ہیں نیند کہاں آئے گی!

دوسرا۔ یہاں بری کے پیڑ بھی نہیں کسی پیڑ کی جڑ ہوتی تو اسی کو کھاتے۔

پہلا۔ جڑیں تو بہت سی ہیں۔ کھاؤ نا۔

دوسرا۔ تم تو مہنسی کرتے ہو۔ آج دوپہر کو میں نے سچ مچ ہی پیپل کی جڑ توڑ کر کھائی تھی۔ بڑی مزے دار تھی۔

پہلا۔ چلو، اسی کو کھو دیں۔

(دونوں جاتے ہیں)

(ایک طرف لڑکی اپنی ماں کی گود میں اوں اوں کر رہی ہے)

ماں۔ ٹھنکی تو منہ توڑ دوں گی۔

لڑکی۔ اوں اوں، ابھی دے دے۔

ماں۔ کیا دے دوں؟

لڑکی۔ روہی کھونٹ میں جو چنے بندھے ہیں۔

ماں۔ (ایک گھونسا مار کر) ہاں کرتی ہے کہہ دیا چپ بیٹھی رہ۔ تھوڑی دیر میں کھا لینا۔ ابھی دیکھو۔ (کان میں کپتی ہے)

سبھی!

بڑھا لڑکی کو روتے دیکھ کر اے اے اے ماریوں دیا۔ آبیٹی میرے پاس بھاگ آ، پتن کے ساتھ کھیل۔
لڑکی (اونچی آواز سے غریب کرتے ہوئے) مجھے۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ بائی چنے نہیں دیتی۔
بڑھا۔ بیٹی اب اُس کے پاس چنے کہاں ہیں۔ سویرے سب نے اپنے اپنے حصے کے کھائے تھے۔
لڑکی۔ رکے تو ہیں۔ بائی نے کون کھائے تھے۔ کھونٹ میں بندھے ہیں۔

ماں (اُسے پٹیتے ہوئے) بندھے ہیں، تیرے لئے۔ کیوں اور میں کیا کھاؤں گی! بڑی لاڈلی آئی کیوں کی۔
بڑھا۔ ارے، کیوں مارتی ہے! میں تو دے دے سکھیا، میرے پاس کیوں نہیں آ جاتی؟
(لڑکی بڈھے کے پاس جاتی ہے۔ وہ اسے پچکار کر گود میں بٹھا لیتا ہے)

بڑھا۔ (اپنی بھوک سردی سے ٹھٹھرتا دیکھ کر) ہر دساکھاں چلا گیا؟ (اپنے بیٹے سے) اور تو بھی بیٹھا بیٹھا کیا کرتا ہے، جا
کر کلڑیاں چن لا اور ٹھوڑی سی آگ ہی بنا۔ سردی سے بڈیاں کانپ رہی ہیں۔

نوجوان۔ میں کہاں سے چن لاؤں۔ ان کو سلگانے کے لئے آگ بھی ہے؟
(بڑھا چپ ہو جاتا ہے۔ بھونٹوڑی دور آگے رٹک پر آگ جلتی دیکھتی ہے)

بھو۔ (دھیمی آواز میں) وہ دیکھو آگ جل رہی ہے ٹھوڑی سی لے آؤ۔
(سب اسی طرف دیکھنے لگتے ہیں جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں ایک کھلی ہوئی گاڑی اور تین آدمی بیٹھے دکھائی دیتے ہیں)
نوجوان۔ بابا چلو، وہیں چل کر بیٹھیں۔ گاڑی کھڑی ہے۔ تمباکو پینے کو مل جائے گا آگ بھی جل رہی ہے۔
(سب اٹھتے ہیں)

بڑھا (ادھر ادھر دیکھ کر) اے ہر دسا چل، ہم لوگ گاڑی کے پاس جاتے ہیں۔
(ہر داس اور اُس کا ساتھی کچھ چباتے ہوئے آتے ہیں)
(سب کا جانا)

تیسرا سین

گاڑی کھڑی ہے برٹک کے کنارے گھاس کا ڈھیر جل رہا ہے۔ ایک سرکاری اہلکار بیوی کو لے کر اپنے گاؤں
جا رہا ہے رات کا کھانا کھانے کے لئے وہاں ٹھہرا ہے۔ آگ کے سمانے اہلکار، اس کی بیوی اور گاڑی (الایٹھے ہیں)
گاڑی والا۔ آج تو بڑی سردی ہے۔

اہلکار۔ بے تو پر ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ گاڑی پر پال تنابے۔ یہاں سے چار کوس جگہ اور ہوگی۔ دس گیارہ بجے گھر پہنچ جائیں گے۔ نہیں تو رات بھر یہیں رہنا پڑے گا۔
(مہربانی غنائیں سے کھانا نکال کر شوہر کے سامنے رکھتی ہے، گاڑی والے کو دیتی ہے اور خود بھی لیتی ہے سب کھانے لگتے ہیں)

(چپیتو آتے ہیں)

بڈھا (آگے بڑھ کر) مہاراج، ذرا ہم لوگ تپ لیں؟ بیٹھ جائیں؟
اہلکار۔ (ذرا ہٹ کر) ہاں ہاں بیٹھ جاؤ۔

(سب چکر باندھ کر بیٹھتے ہیں)

اہلکار۔ (کھاتے ہوئے) تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟
بڈھا۔ کہیں نہیں۔ ہم لوگ چپیتو ہیں۔

اہلکار۔ ابھی سے نکل پڑے ابھی تو فضل آئی بھی نہیں۔
بڈھا۔ گھر بیٹھے بیٹھے کیا کرتے؟ باہر تو کچھ کام بھی مل جاتا ہے۔ سنتے تھے ادھر کہیں چپیت کتنے لگا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا۔
اہلکار۔ ادھر تو ابھی دیر ہے۔ مگر کوچ کی طرف فضل کتنے لگی ہے۔
بڈھا۔ (خوش ہو کر) آپ کو کیسے معلوم ہے؟

اہلکار۔ معلوم ہے۔ ادھر تو بازار میں نیا اناج بھی آگیا۔
بڈھا۔ کوچ یہاں سے کتنی دور ہوگا، مہاراج۔
اہلکار۔ پندرہ کوس ہوگا۔

بڈھا۔ تب تو بہت دور ہے۔

اہلکار۔ کوئی دور نہیں۔ ابھی سے چلو گے تو دوپہر تک پہنچ ہی جاؤ گے۔
بڈھا۔ یا بوسانہ لے میں (دیکھو۔

اہلکار (آگ بکھتی دیکھ کر) گاڑی والے سے، ارے کھیل تھوڑی سی گھاس اور لا۔ آگ بج رہی ہے۔
(کھیل اٹھتا ہے)

بڈھا۔ اے مہاراج گھاس کا ہے کو جلاتے ہو۔ بیلوں کو تو ملتی نہیں۔ ہم تھوڑا سا ایندھن اکٹھا کر لاتے ہیں۔

اہلکار۔ نہیں، نہیں، ضرورت نہیں۔ ہم لوگ ابھی چلے جائیں گے۔
 بڈھا۔ ایسی ٹھنڈ میں!
 اہلکار۔ کچھ ٹھنڈ نہیں۔ گاڑی پر پال تنہا ہے۔ کپڑے بھی کافی ہیں۔ چلے جائیں گے۔
 بڈھا۔ لیکن مہاراج ہیلوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔
 اہلکار۔ ٹھنڈ کیا لگے گی! کون سارات بھر چلنا ہے۔ ابھی دس بجے پہنچ جائیں گے۔
 (اہلکار کی پوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ بیوی اُس کے سامنے دو پوریاں اور رکھ دیتی ہے۔ چار گاڑی والے کو دیتی ہے کہ کن
 لڑکا اور لڑکی اب تک برابر اہلکار کا منہ تک بچے تھے۔
 لڑکا۔ (بے صبر ہو کر اور ماں کے اوپر گر کر) بائی، لچئی، اُوں، اول لچئی۔
 ماں (اسے دھکیل کر) بڑا انوکھا ہے۔ لچئی کہاں سے لاؤں!
 لڑکا۔ (اہلکار کی طرف دیکھ کر) وہ ہے۔
 ماں۔ (خفا ہو کر) تو کھالے۔

(لڑکا رونے لگتا ہے)

بڈھا۔ (اہلکار سے) مہاراج، ایک لچئی ہو تو اس لڑکے کو دے دو، بھوکا ہے۔
 اہلکار۔ اب تو کچھ نہیں بچا۔
 بیوی۔ ہے تو۔ ایک پوری بچی ہے۔ تم تو نہیں لو گے؟
 اہلکار۔ نہیں۔

(بیوی پوری لڑکے کے سامنے پھینکتی ہے اُسے کھانے کے لئے لڑکے کے ساتھ لڑکی بھی جھپٹتی ہے۔ پوری لڑکے
 کے ہاتھ میں پڑتی ہے۔ یہ اُسے جلدی سے منہ میں ٹھونس لیتا ہے۔ اہلکار ہنستا ہے)
 (لڑکی پل بھرتک کھڑی رہتی ہے پھر جھپٹ کر پوری پر منہ مارتی ہے۔ تب تک لڑکا اُسے صاف کر چکا ہے۔)
 لڑکی۔ (دائیں ماں کے پاس جا کر) لچئی اُوں اُوں (روتی ہے)
 ماں (اہلکار کی طرف دیکھ کر) مہاراج، ذرا سا ٹکڑا ہو تو، اور دے دو۔
 (اہلکار کھانا ختم کر کے چلنے کی تیاری کر رہا ہے)
 اہلکار۔ اب تو ہم لوگ کھا چکے۔

(عورت چپ ہو کر لڑکی کو گود میں چھپا لیتی ہے۔ لڑکا اب بھی اہلکار کی طرف دیکھ رہا ہے)
 لڑکی۔ (دباؤ سے چپٹ کر) بائی، لچٹی۔
 ماں۔ مجھے کھالے۔ لچٹی کہاں سے لائوں۔

چوتھا سین

(وہی جگہ۔ اندھیری رات۔ آگ بھی پڑی ہے۔ گاڑی چلی گئی ہے۔ بڑھارا کھ کے پاس لیٹا ہے۔ اس کے پاس اور لگ لیٹے ہیں۔ دونوں جوانوں کے سوا سب سو رہے ہیں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے)
 نوجوان۔ (کانپ کر) آف!
 دوسرا نوجوان۔ بڑی سردی ہے۔
 بڑھا۔ میری ہڈیاں تک کانپ رہی ہیں۔
 (بغل میں لیٹے ہوئے لڑکے کو اپنے اوپر قریب کر لیتا ہے)
 نوجوان۔ بابا ایسی سردی تو آج تک نہیں دیکھی۔ انگلیوں میں جہنمی چھوٹ رہی ہے۔ منہ کا خون جم رہا ہے۔
 بڑھا۔ اس سے اچھا تو یہی تھا کہ اس گاڑی کے ساتھ ہی چلے چلتے۔
 نوجوان۔ ہتھیں بیٹھے رہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ چلو۔
 بڑھا۔ آگ کے آسروں سے بیٹھا رہا۔ اب وہ بھی کچھ گئی۔ چلو کچھ ایندھن اکٹھا کر لائیں۔
 نوجوان۔ رات بھر ایندھن ہی اکٹھا کرتے رہیں گے۔ کچھ سو جھتا تو ہے نہیں۔ ایندھن سسرال کہاں ملے گا۔
 (اٹھ کر گھاس پھوس اکٹھا کرتا ہے۔ اُسے آگ پر رکھ کر پھونکتا ہے۔ دھواں)
 بڑھا۔ سویرا جانے کب ہوگا۔
 نوجوان۔ ابھی تو دیر ہے۔
 (اتنے میں لڑکی روتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے چپٹی پڑی ہے۔ ماں کا ایک آنچل اُس کے بدن پر ہے اور اُس کے بدن کا آدھا حصہ کھلا ہے)
 ماں (لڑکی کو پچکا کر کرناہند بھری آوازیں) سو جا بیٹی!
 (لڑکی پھر روتی ہے)

ماں! اس پر ہاتھ رکھ کر اے تو کہاں چلی گئی، ادھر کھسک آ۔ (اُسے اپنی چھاتی سے لگا کر آنچل سے بھی طرح ڈھکتی ہے) لڑکی لاپائیک چونک کر، بائی، لپٹی۔

ماں! (اُسے پتھلی دے کر سو جا، سو جا۔ سویرا ہونے پر تجھے لپٹی اور جلیبی دوں گی۔ لڑکی (اٹھ کر چلاتے ہوئے) اہل! اہل! ابھی دے دے۔ ابھی۔ (سب کی آنکھ کھل جاتی ہے)

ایک نوجوان یہ کیا آفت ہے؟

بڑھا۔ سکھیا کی ماں، کیا ہے؟

سکھیا کی ماں۔ کچھ نہیں بابا لپٹی کے لئے روتی ہے۔ بتاؤ لپٹی کہاں سے لاؤں؟ (رونے لگتی ہے) بڑھا۔ اسے روتی بھسے کو ہو؟

لڑکی۔ (دو تے روتے) اچانک سردی سے کانپ کر، اُوہو، اُوہو، اُوہو، جاڑا لگتا ہے۔ ماں۔ یہاں آجا بیٹی یہاں، جاڑا لگتا ہے تو کیا کروں۔

(اٹھ کر آگ کے پاس جاتی ہے)

لڑکی۔ اُوہو، اُوہو، جاڑا، جاڑا۔

ماں۔ (بڑھے کی طرف دیکھ کر ذرا اپنی چادر سے دو۔

(بڑھا چادر دیتا ہے۔ ماں لڑکی کو اُس میں لپیٹ کر مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ ادھر دونوں نوجوان ایندھن

اکٹھا کرتے ہیں)

لڑکی۔ ایک محنت اٹھ کر، ماں!

ماں۔ کیا ہے بیٹی؟

لڑکی۔ اُوہ!

ماں۔ پریشان ہو کر کیا ہے؟

لڑکی۔ (کاہنتے ہوئے) ڈر لگتا ہے۔

ماں۔ ڈر کا ہے کا بیٹی! دیکھو سب بیٹھے ہیں۔

لڑکی۔ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لپٹی۔ لپٹی چھین رہا ہے۔

نوجوان بوج پاس ہی بیٹھا ہے، اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو مرنے والوں کی طرح ہبکی ہبکی باتیں کر رہی ہے۔
 ماں - جانے بھتیجا! دیکھو تو کیسی صورت بن رہی ہے۔ (آنسو پونچھتی ہے)
 نوجوان لڑکی کو گود میں لے کر اور اس کا بدن ٹٹول کر لے لے، اس کا بدن تو بڑا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔
 بڑھیا - تاپ تو نہیں چڑھی؟
 نوجوان - تاپ ہی تو چڑھی ہے۔

ماں - تاپ! ہائے رام!
 لڑکی (بے ہوشی میں) اوہ ماں، ماں، وہ دیکھو میری لچٹی — لچٹی
 (ماں کی گود میں جانے کے لئے تڑپتی ہے)
 ماں - لاؤ، بھتیجا مجھے دے دو۔ یہ ہمتا ہے پاس نہیں رہے گی۔

(اچانک لڑکی چپ ہو جاتی ہے، ماں اسے گود میں لیتی ہے)
 ماں - (چونک کر) اے، اس کا بدن تو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم تو کہتے تھے گرم ہے؟ بیٹی! بیٹی! اوسکھیا!
 لڑکی (آنکھیں کھول کر) ماں، ماں بھوت! وہ دیکھو — میری —

ماں - بابا فراتم تو دیکھو۔ اسے کیا ہو گیا ہے۔ ہاتھ پیرا لے سے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔
 پڑھنا گھبراؤ نہیں۔ باہر میدان کی جگہ ہے۔ کہاں کیا ہے، کون دیکھ آیا ہے؟ کچھ ہو گیا ہوگا۔ سویرا ہونے دو۔
 درگا کا نام لو۔ اُن کے نام سے سب دکھ دور ہوتا ہے۔

ماں - ماں درگا میری سدھ لو۔ ہائے! بیٹی، بیٹی، تو بولتی کیوں نہیں! جانے سویرا کب ہوگا۔ (دھوتی ہے)
 (ٹھنڈی ہو اچلتی ہے۔ تپے کھڑکھڑاتے ہیں)

لڑکی - ماں! وہ بھوت - میں نے کہا تھا، مجھے مت لے چل۔ وہ دیکھ — وہ آیا — ارے ارے! دانت نکال رہا،
 — مجھے کھا جائے گا۔ ہائے — لے — لے — میری لچٹی لے — مجھے مت کھا۔ لے — لے —
 (تڑپ کر جان دے دیتی ہے)

ماں - ہائے بیٹی! دچھانی پیٹتی ہے،

(سب حیران بیٹھے رہ جاتے ہیں)

محفل ادب

پہلی شام

بالآخر فضا میں خاموشی بچھا گئی، اور وحشیانہ شفق نے ہر شے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، پرندے اور چوپائے خاموشی کے ساتھ بسیرا لینے کے لئے اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے۔ صرف ایک بلبل باقی رہ گئی جو تمام رات طرح طرح کے خوش آئند نغمے الاپتی رہی، رفتہ رفتہ آسمان زندہ جواہرات سے جگمگا اٹھا۔ زہرہ اپنے ستاروں کی بے شمار فوج پر حکمران سب سے علیحدہ جگہ گارہی تھی۔

یکایک چاند ایک شانہ بننے پر کار کے ساتھ نکلا اور اس نے اپنے عظیم المثال حسن کو بے نقاب کر دیا، تاریکی پر اب اس کی سیسیں شاعروں کی حکومت تھی۔

آدم نے اس حال میں حوا سے کہا ”میری رفیقہ! رات آگئی، اور سر چھڑا آرام کی خواہشمند ہے، ہمیں جسمانی مسائل کا خیال رکھنا لازم ہے، اس لئے کہ خدا نے راحت و مشقت کے ساتھ ساتھ تخلیق کئے ہیں اور آئندہ نسل انسانی کے لئے ان کا مفہوم ”شب و روز“ سمجھا گیا ہے۔ اب نیند کی اوس ہماری بلکوں کو خواہجے خوشگوار بوجھ سے جھٹکا دیتی ہے۔ خدا کی دوسری مخلوق تمام دن بیکار و غیر ذمہ دارانہ طور پر پھرتی رہتی ہے اس لئے انہیں آرام کی ضرورت کم ہے۔ انسان اپنا روزمرہ کام معینہ دماغی یا جسمانی کام کرنے کے لئے بنایا گیا ہے جو خدا کی نظروں میں اسے دوسری مخلوق سے علیحدہ اور سب سے لحاظ ممتاز بنائے ہوئے ہے بر خلاف اس کے اور حیوانات بے کار گھومتے پھرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اعمال پر خدا بھی متوجہ نہیں۔ حوا اس طرح مخاطب ہوئی۔

”میرے آقا! میری تخلیق کے راز تیرا حکم بلا دلیل ماننا میرا فرض ہے، خدا کی یہی مرضی ہے۔ خدا تیرا قانون ہے اور تو میرا اس سے زیادہ نہ جانتا ہی عورت کی بہترین علمیت اور اعلیٰ ترین صفت ہے میں جب تجھ سے مصروف گفتگو ہوتی ہوں تو تمام موسمی تبدیلیوں کو بھول جاتی ہوں اور میرے لئے ہر لمحہ پیغامِ راحت ہوتا ہے۔ صبح کا خوشگوار تنفس، طلوع کی دلکش کیفیت پرندوں کے سہانے نغمے، سورج کی بے شمار جھاریوں، درختوں، پھولوں، پھولوں پر چپکنے والی نورانی مشرقی شعاعیں، بڑا خود میرے لئے ایک ناقابلِ اقبال اور سرت ہیں۔

بارش کی ہلکی پھواروں کے بعد بیش بہا شبنمی موتیوں میں جگمگاتی ہوئی معطر اور زرخیز زمین، اس کے بعد سہانی چٹکنا، شام کی آمد، پھر خاموش رات کا نزول اور اُس میں ببل کے دلکش راگ، چاندی کی کرمری شاعریں، ستاروں کے آسمانی جواہرات غرض ہر چیز مسرت ہی مسرت ہے۔

لیکن پرندوں کے سحر آفرین نغمات میں صبح کا خوشگوار تنفس، سورج کی سطح زمین پر جگمگاتی ہوئی باصرہ نواز شاعریں، شبنمی موتیوں میں چمکتی ہوئی نوخیز جھاڑیاں اور پھل پھول، ہلکی پھواروں سے نکلتی ہوئی بھینی بھینی خوشبوئیں، شام کی خوشگواہری، رات کا سکون، بلبیل کے نغمے، چاند کی کرمری شاعریں۔ ستاروں کی جواہراتی چمک دمک — ہر شے میرے لئے بے معنی ہے۔

اگر تو میرے پاس نہیں ہے ” عالمگیر“

کتاب خانہ اسکندریہ کے لائبریرین کا خط

ڈی مٹ رمی ایس شاہ والا تبار کی خدمت میں عرض پر دان ہے کہ جب تو نے کتابوں کی فراہمی اور تنظیم و نگرانی کی خدمت میرے سپرد کی تو میں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اب عرض ہے کہ اور کتابوں کے ساتھ ساتھ ہمیں یہودیوں کی کتب شریعت بھی درکار ہیں۔ یہ عبرانی حروف اور اس فونم کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہمارے دائرہ علم میں نہیں آسکتیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابت بھی مناسب احتیاط سے نہیں کی گئی کیونکہ اب تک اُن کو شاید نہ لطفِ توجہ نہیں حاصل ہوا۔ اب یہ ضروری ہے کہ تو اس کے مستند اور صحیح نسخے تیار کرائے۔ یہ شریعت حکمت و دانش سے معمور ہے کیونکہ یہ قانون الٰہی ہے۔ اور اسی بنا پر ہمیں کہہ نہیں سکتے ابدرا کا خیال ہے، مورخین اور شعرا کے ہاں اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا اور نہ خود ان لوگوں نے اس کا کچھ حال لکھا جو اس شرع کے پابند ہیں کیونکہ یہ مقدس قانون ہے اور ناپاک زبانوں سے اس کی شاعت نہیں ہو سکتی۔ لہذا التماس ہے کہ تو یہودیوں کے سردار کاہن سے ہر قبیلہ کے چھ چھ ممتاز افراد و ردیگر ماہرانِ شرع کو طلب کر تا کہ ان کی مدد سے ہم ان صحائف کی روح کو پائیں اور ان کے مضامین کی حقیقی تفسیر سے واقف ہوں۔ اس طرح تیرے کتب خانہ میں خاطر خواہ ذخیرہ کتب جمع ہو سکے گا۔

”تباریح“

ایرانی ماں کا گیت

اُمّہ ماں تجھ پر قربان! اُمّہ کہ اب تو بہت سوچکا! اُمّہ کہ اب تجھ پر سونا حرام ہے! اُمّہ کہ تیرا باپ آزادی کی راہ میں مارا گیا اور اپنی جگہ تیرے سپرد کر گیا۔ اُمّہ کہ میرا دودھ تیرے لئے حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے! تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

اُمّہ! کہ میں تیرے باپ کی یہ تلوار تیری کمر سے باندھ دوں اور تجھے میدان جنگ میں بھیج دوں۔ اُمّہ کہ دشمن گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہو اور اس کا بدلہ لے! اُمّہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو اور میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔ اُمّہ! میری دونوں آنکھوں کے چراغ تیرے باپ کے بعد تیری ماں بے کس ہے بیدار س ہے اور تیرے سوا اس کے لئے کوئی امید گاہ اور پشت و پناہ نہیں۔ دشمن دروازے کی چوکھٹ پر پہنچ چکا ہے۔ اُمّہ اور اپنی ماں کے ناموس کی حفاظت کر! اُمّہ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے دل کا ٹکڑا ہے! اور اپنے باپ کی یادگار ہے! اُمّہ میرے دل کے پر تو اُمّہ! اپنی آنکھیں کھول کہ میں تیری آنکھوں میں غیرت و شجاعت کے وہ نشان دیکھوں جو تیرے باپ کی نگاہ میں موجود تھے! آہ تیری آنکھیں تیرے باپ کی آنکھوں کے کس قدر مشابہ ہیں! اُمّہ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو! میری جان تجھ پر فدا ہو! تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے۔

اُمّہ! میری جان کی روح اُمّہ! کیا تو ناقوس کی آواز اور اپنے بھائیوں کی فریاد نہیں سنتا۔ تیرے رفیق تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تجھے مدد کے لئے بلا رہے ہیں۔ اُمّہ! اور میدان جنگ کی طرف دوڑ! یا تو سر بلندی اور فیروزی کے ساتھ واپس آیا اپنے باپ کی جگہ آزادی وطن کی راہ میں اپنے باپ کی طرح جان قربان کر۔ اُمّہ کہ میرا دودھ تجھ پر حلال ہو۔ میری جان تجھ پر فدا ہو۔ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو اپنے باپ کی یادگار ہے!

”ادبی دنیا“

قافیہ

قافیہ نظم میں آبخار کا کام دیتا ہے۔ خیال کا تسلسل اور الفاظ کا ترنم قافیہ کی چٹان سے ٹکرا کر ابھرتا اور بلند ہوتا ہے، اور اگر قافیہ کو غزل کی طرح خیال کے بہاؤ کی روکنے والی دیوار بنا دیا جائے تو پھر خیال قافیہ پر سے ابل کر کھٹکتا اور ترنم کی دھواں دھار بوجھا ڈالتا، دوسرے مصرع میں سر ملی بھل ڈال دیتا ہے اور پھر اس مصرع کے ترنم کو ساتھ لے کر

نے کے مصرعوں میں قافیہ پر سے چادر کی طرح بہتا، نغمہ بلند کرتا ہوا پورے بند کے بند کو خیال کے تسلسل اور موسیقی لے اتار چڑھاؤ سے ایک دلغریب زندہ چیز بنا دیتا ہے!

”مجلہ عثمانیہ“

جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے

جب تو مجھے نغمہ سرائی کا حکم دیتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل غور کے مائے پھٹ جانے گا۔ میں بے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں، اور میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہیں۔
زندگی میں جو تلخی اور ناموائفت ہوتی ہے وہ تمام ایک خوش کن ہم آہنگی میں مبدل ہو جاتی ہے اور ری پرستش ایک خوش و خرم پرندے کے مانند جو دریا کے پار گزر رہا ہو، اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔
میں جانتا ہوں کہ تو میرے نئے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں صرف ایک مغنی کی حیثیت سے تیرے حضور میں آسکتا ہوں۔

میں اپنے نئے کے دور رس بانگوں کے برسوں سے تیرے قدموں کو چھو تا ہوں، جن تک پہنچنے کی بھی امید نہیں کر سکتا۔

نغمے کی خوشی میں مست ہو کر میں اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں، اور تجھے جو میرا آقا ہے، دوست کے بے یاد کرتا ہوں،

”اجل“

انسان کی حقیقت

زمین بہ مقابلہ ان نویلے گنبدوں کے ایسی ہے جیسے ایک خنکاش کا دانا سمندر کی سطح پر، اور تو اس دنے مقابلہ میں کیا ہے؟ — نیوٹن

میں کہتا ہوں! انسان کیا ہے؟ وہ ایک حقیر چیز ہے، ایک مشتِ خاک اور حیاتِ دوروزہ، ایک سانسِ زندگی اور موسم کے درمیان رو کے ہوتے ہیں — پسکل

”الردو“

تبصرہ

غالب۔ مولفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحبہ پی، ایچ ڈی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سید مرزا غالب کے کلام اور زندگی کی تنقید ہے۔ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی نقطہ نظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ شعر کی تعریف اور شاعری کی مثالیں تمام انگریزی سے اخذ کی گئی ہیں۔ حالانکہ قومی اور مذہبی روایا کی بنا پر مشرق اور مغرب کے تخیل میں بہت کچھ فرق ہے جس میں امتیاز کرنا ایک نقاد کا اولین فرض ہے۔ فاضل نقاد کو غالب کے اشعار پر ”سخن ناشناسوں“ کی تحسین ہے جا کا بڑا گلہ ہے۔ سب سے زیادہ شکایت انہیں علامہ بجنوری مرحوم سے ہے جنہوں نے جوش عقیدت میں یہاں تک کہ دیا کہ ”روح سے منت تک شکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کو ناشافہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں سیدار یا خوابیدہ موجود نہیں“ اور جب غالب کے پرستار اس فقرے کو دہراتے ہیں تو انہیں سخت ناگوار گزرتا ہے۔ غالب کی نسبت ان کی اپنی رائے یہ ہے کہ دوسرے غزل گو شعر کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو صوفی اور غلامِ ظاہر کرتا ہے اور عشق، جام اور شراب کے جادۂ مبتذل پر گامزن ہے، اور اگر کبھی اُس نے کوئی نئی راہ اختیار کی ہے تو وہ قنوطیت کی راہ ہے۔ غالب کی اردو شاعری کو وہ جذبات سے معرا اور تقنع سے پر خیال کرتے ہیں۔ ایک ستم انہوں نے یہ کیا ہے کہ غالب کے کلام کی کم بایگی ثابت کرنے کے لئے اس کے بہترین اشعار منتخب کئے ہیں اور دلیل کوئی پیش نہیں کی مثلاً۔

منظر اک بلند ہی پر اور ہم بنا لیتے کاش کے ادھر ہوتا عرش سے مکاں اپنا
کے متعلق فرماتے ہیں کہ ”اس میں فلسفہ ہی کون سا ہے؟“ اور
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اس میں لفظی چل بل کے سوا اور کیا رکھا ہے؟“ پھر
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے
کے متعلق فرماتے ہیں کہ ”اس میں کوئی نئی بات بھی ہے؟“

بہر حال کتاب دلچسپ ہے، حجم ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے۔ جناب مولف سے طلب فرمائیے!

زینب علیہا السلام مضامین منظر انٹرنیٹ کے ذریعے

مولانا محمد عابد اعظمی شہر رکھنوی مرحوم کی مستقل تصانیف متعدد درجہ شائع ہو کر ملک میں پھیل چکی ہیں۔ لیکن اس امر کی ضرورت تھی کہ ان کے تمام متفرق تاریخی، ادبی، علمی و اسلامی مضامین کو بھی ایک جگہ کے کی ضرورت میں شائع کیا جائے تاکہ ہر محقق و محاسب گیلانی مولوی داخل حق سہا رکھاد ہیں۔ کہ ان کی مہیا بلک کو شش آڈر سہا رکھاد ہے۔ یہ وہ علمی کام ہے۔ انہما ہے۔ علمی سلطان جلد و آڈر کے تمام مضامین نہایت عمدہ ترتیب و تدوین کے ساتھ تیار و جلد و آڈر میں چھپ گئے ہیں۔ آڈر شہر کے گوہر انشاں خانے کی یہ نذر است کامیابیاں ہمیشہ کے لئے دستبرد روزگار سے محفوظ ہو چکی ہیں۔ تیار کردہ مہیا علی شاہ صاحب کا یہ کام ہماری نظروں میں پڑا ایک قابل قدیم ہے۔ آڈر میں یقین ہے کہ آڈر و علم کا ایک تیار خاد اس باب میں ہماری ہنوائی کرے گا۔ یہ نادر و مجرب و کم و بیش چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ آڈر چار مضامین کا یہ عالم ہے کہ اس میں مولانا کے مرحوم کے تمام مضامین جو زیادہ تر ان کے مشہور رسائل و جرائد میں چھپے۔ نیز بعض دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اس سلسلہ جواہر میں منسلک ہو گئے ہیں۔ مضامین کو با اعتبار نوعیت کے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن کی تفصیل مہریت و صفات میں ہے۔

جلد ششم تاریخی واقعات پرتال لابی قیمت
جلد ہفتم نظم و ڈراما مضامین ہی مع ہیں۔ قیمت
 یہ مضامین شہر کے اس نادر کوئے کے کئی سی کیفیت ہے۔ مولانا کے مرحوم کی شائستگی نیز سادہ سلیس آڈر و دل آویز انداز تحریر کی خوبیاں واضح کرنا محض تحصیل حاصل ہے۔ ہر اردو خواہ فرد اور ملی انھوں ہر اردو و ملی سہا رکھاد کا فرض ہے۔ کہ وہ اس مجموعہ مضامین کو خریدے۔ آڈر کے مطالعہ سے کسب فیض کریں۔ چار ہزار صفحات کا یہ بڑے مرقع پر سے کا پورا زیادہ سے زیادہ چوبیس روپے میں مل سکتا ہے۔ آڈر مولانا شہر اچھے ہر دھڑ آڈر بلند پایہ مصنف کے تمام علمی و ادبی مضامین کے لئے جو کچھ بیکس پر وہ نے کی تفصیل و خیر رقم قطعاً کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ آخر میں ہم پورستہ مبارک علیشاہ صاحب گیلانی مالک گیلانی الیکٹرونک پریس بک ڈپو ہسپتال روڈ لاہور کی اس پیشہ اپنی خدمت کی مدد سے علاوہ دیتے ہیں۔ مرحوم کے انجام آڈر علم و اشاعت علم نے دور حاضر کے سب سے ہر دھڑ آڈر مقبول عام و خواص مصنف کے متشہور متفرق مضامین آڈر کم و بیش چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ آڈر کے لئے دستبرد روزگار سے محفوظ ہو چکی ہیں۔ آڈر شہر کے گوہر انشاں خانے کی یہ نذر است کامیابیاں ہمیشہ کے لئے دستبرد روزگار سے محفوظ ہو چکی ہیں۔ تیار کردہ مہیا علی شاہ صاحب کا یہ کام ہماری نظروں میں پڑا ایک قابل قدیم ہے۔ آڈر میں یقین ہے کہ آڈر و علم کا ایک تیار خاد اس باب میں ہماری ہنوائی کرے گا۔ یہ نادر و مجرب و کم و بیش چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ آڈر چار مضامین کا یہ عالم ہے کہ اس میں مولانا کے مرحوم کے تمام مضامین جو زیادہ تر ان کے مشہور رسائل و جرائد میں چھپے۔ نیز بعض دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اس سلسلہ جواہر میں منسلک ہو گئے ہیں۔ مضامین کو با اعتبار نوعیت کے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن کی تفصیل مہریت و صفات میں ہے۔

گیلانی الیکٹرونک پریس بک ڈپو ہسپتال روڈ لاہور

جلد اول شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
 یہ جلد میں حصوں پر مشتمل ہے۔ جن میں
 متوں کی قیمت علی ترتیب ہے۔
جلد دوم تاریخی اور جغرافیائی مضامین یہ جلد
 متوں میں ہے۔ قیمت حصہ اول چار حصہ دوم چار حصہ سوم
 شری ممدن کا آخری نمونہ۔ یہ حصہ در حقیقت لکھنوی گذشتہ
 نیت کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے۔ جن میں عبد شاہی کے
 ادبی واقعات آڈر و معاشرت کی تصویر کشی ایسی خوبی آڈر و معاشرت
 کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ کہ یہ ایک کتاب لکھنوی گذشتہ حالت
 پر سے طبع ہر آشکار کر دینے کے لئے باطل کافی و ادنی سہا رکھاد
 (فہرست ۳۵۷ صفحات ہے آڈر قیمت ہے)۔
جلد سوم سیر و سوانح اس جلد میں نامور مردوں آڈر و نامور
 ہا۔ آڈر یہ میں حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد صرف نامور مردوں کے
 سوانح حیات کے لئے وقف ہے۔ اس کی فہرست ۳۵۷ صفحات
 ہے آڈر قیمت ہے۔ بقیہ دو حصوں میں نامور مردوں کی سیرتیں
 مع ہیں۔ ان میں سے پہلی جلد کی قیمت چار دوسری جلد کی
جلد چارم آڈر تحقیق مسائل اس جلد میں مختلف
 مسائل پر صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (دو روپے)۔
جلد پنجم مطلع قوم و ملت اس جلد میں مولانا
 کے آڈر و معاشرت کی اصلاح کے لئے لکھے گئے
 است صرف ایک روپیہ (دو روپے)۔

لاہور کے لئے دستبرد روزگار سے محفوظ ہو چکی ہیں۔

سیات ہمالیوں

مہمان بہادر ویاں محمد شاہدین صاحب مرحوم نے۔ اے
لنچ جیکو رٹ پنجاب کا مجموعہ کلام جس میں ان کی
بزرگداشتی فلسفیانہ نظمیں۔ اور دیکش غزلیات ہرج
وع میں ان کے سبق آموز حالات زندگی اور کلام
پر تبصرہ کیا گیا ہے حجم ۸۰ صفحات دو تصویریں اعلیٰ
لکھائی چھپائی و لائٹنی کاغذ قیمت درجہ اول ایک روپیہ
علاوہ محصول ڈاک۔

سالہ ہمالیوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور

ہمیں مارچ ۱۹۲۶ء کے ہمالیوں
ضرورت ہے۔ اگر ہمارے ناظرین
سے کوئی صاحب اسے فروخت
پاہیں تو اٹھ آنے میں ذریعہ وی پنی
ال فرماویں۔

پرسالہ ہمالیوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور

بال متر گولیاں (بہادر و اطفال)

بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔
اور گھر بے رونق ہو جاتا ہے لیکن یہی نوزائیدان تندرستی کی حالت میں
ہر ایک سرست کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ جو شخص لوکلین سے ہی بیدار ہے۔
اس کی جوانی کیسی ہوگی۔ اور کیا کر سکے گا۔ اس نے بیمار بچوں کو تندرست
اور تندرست کو طاقتور بنانے کے لئے بال متر گولیاں کا استعمال کرادیں۔
یہ گولیاں بچوں کی جلد شکایتوں مثلاً دست کا آنا نے کا ہونا شکم کا دھنا
جسم کا زرد پڑنا تلی۔ سستی۔ کالمی۔ و بلا پن وغیرہ دور ہو کر پوری صحت اور
تندرستی جتنی چاہلکی حاصل ہوتی ہے۔ قیمت فی ڈبیر (جس میں تین سو
گولیاں ہیں) ایک روپیہ (عمر)

تمام مذاہب اور فرقے متفق ہو گئے

تمام مذاہب اور فرقے اسی طرح متفق ہو گئے ہیں۔ کہ ایک دوسرے کے
بیان میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا مسلمان عیسائی، ہندو، مولوی، پادری
ان سب کی متفقہ آوازیں ہیں۔ لا، زمانہ حال کی آب حیات ہیں (۱) اپنا
ثانی نہیں کہتیں۔ (۲) یوں بھی بارود جوتے ہیں۔ (۳) شیر زرباد دیتی ہے۔
(۴) قیمت بالکل کم برائے نام ہے (۵) علاوہ ان کے آنگنگ گھر گولیاں کی جتنی
کی ہزاروں صدائیں بلند ہو رہی ہیں جو بھی استعمال کرتا ہے تعریف کئے جاتے
نہیں رہتا آپ بھی ضرور تجربہ کریں تھوڑے ایام میں قبضی مدبھی خول کا
خوابی اور کسی پیٹ کا درد محدود کی کمزوری دماغ اور قوت حافظہ کی کمی وغیرہ
دور ہو کر اعلیٰ دھن کی طاقت مدد دے گی تو انائی حاصل ہوگی قیمت برائے نام
۲۲ گولیاں کی ڈبیر صرف ۵ روپے ڈبیراں ملخص
صحت و تندرستی کی نعمت خوشی و مسرت کا منبع۔ سچا راستہ دکھلائے ہیں
سچا دوست کتاب کام شاترا لکل مفت ملے گا لا سلفوٹائیں۔

وید شاتری مہنی شکر جی گو ویند رام جی جام نگر
کاٹھیا واٹر

۴۶
واحسی صاحب کا منجن

اکسیر زندان

یہ منجن اس نسخہ سے بنایا گیا ہے جو ملا واحسی صاحب اڈیٹر نظام المشائخ کو ان کی اڈیٹری
طبیعیہ کے زمانہ یعنی ۱۳۱۹ء میں سراج الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے عنایت فرمایا تھا اس
سے دانتوں اور مسوڑوں کی تمام خرابیاں اور بھلیفیں رفع ہو جاتی ہیں۔ چودہ پندرہ سال سے
واحسی صاحب اسے خود بھی استعمال کرتے ہیں اور اپنے شہر کے ہر ضرورت مند کو بھی دیتے ہیں۔
ہر شخص اس کا ثنا خواں ہو اور اسے سب سے اچھا منجن تسلیم کرتا ہو سینکڑوں پلٹے ہوئے دانت اس منجن
نے جوڑ دیئے۔ متعدد آدمی ہیں جنہیں پائریا کی شکایت تھی اور ہر کھانے کے ساتھ مسوڑ ہوں کا خون اور
مسوڑ ہوں کی پیپ پیٹ میں اتر اتر کر جن کی صحت کو برباد کر رہی تھی۔ صرف اس منجن کے ملنے سے
ان کے مسوڑے اچھے ہو گئے اور آج وہ خدا کے فضل سے مند رہتے ہیں۔ جس منجن سے پائریا
جیسے موزی مرض کو آرام ہوتا ہو اور جس منجن سے پلٹے ہوئے دانت جوڑ جاتے ہوں اس کے دوسرے
معمولی فوائد بیان کرنے فضول ہیں۔ یہ خیال کر کے کہ دہلی سے باہر کے لوگوں کے پاس بھی اس منجن کو
پہنچایا جائے۔ ہم نے واحسی صاحب سے منجن کا یہ نسخہ مانگ لیا ہے اور لاگت کی لاگت
اسے فروخت کر رہے ہیں۔

قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸) بمحصولہ اک ۴۷

ملنے کا پتہ: مینجر رسالہ نظام المشائخ۔ محلہ کوچہ چیلان۔ دہلی

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو!

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹس و رنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم ایک ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں۔ ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے۔ کہ آلہ استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جو نئی روح آپ چاہیں سالہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا درست جواب دیگی۔ بدلی پڑھا لکھا ہر انداز میں کام لے سکتا ہے۔ کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ اور یہی کسی جگہ کسی کی ضرورت ہے۔ عالم بالا کے حالات معلوم کرنا۔ گمشدہ کا پتہ لگانا۔ جو چوری کا سراغ معلوم کرنا۔ دشمن سے بدلہ لینا۔ مقدمات میں فتح پانا۔ سخت ماکہ سے حسب دلخواہ کام نکلوانا۔ دور از فاصلہ پر ایک سیکنڈ میں خبر بھیجنا۔ حسب دلخواہ نوکری یا نوکرا کا معاملہ کرنا۔ ناہنذاؤں کی عبارت پڑھنا۔ منقول صندوق یا مکان کے اندر کی اشیا کو مکرر دیکھنا۔ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں۔ اس نایاب چیز کا گھر میں موجود ہونا لازمی ہے۔ اصل قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے معقول وصول ڈاک صرف دو روپیہ چودہ آنے لے جائیں گے۔ ہدایات ہمارا مفت ارسال ہونگی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں تحریر فرمائیں۔

کیمیکلز سنڈیکیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

chemicals Syndicate (H) Jalandhar city (punjab)

برقعہ نو ایجاد

بائیس سال سے ہندوستان کے ہر طبقہ کے لوگوں میں روز بروز زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اس کی اختراع پر مختلف نمائشوں سے بارہ لاکھ و لکھ فی فیصلہ جکے ہیں۔ بخوبی صورت، آرام دہ، زمانہ کے حسب حال اور پردہ کا پورا محافظ ہے۔

کندے سے پہلے کے ٹخنے تک کی لمبائی اور سر کے دور کی ناپ روانہ کر دیں۔ واپسی کی شرط پر بذریعہ وی پی منگوا کر خود معائنہ بشرط واپسی منگوائیں کریں۔ اور پردہ نشین خواتین کو لیند کرنے کا موقع دیں۔

بہت اعلیٰ قسم اول معطلہ قسم دوم معطلہ لیکن نرم معطلہ۔ لیکن اٹالین معطلہ لیکن طرح معطلہ دستہ بوسی سلک للٹکھ چینی ریشم لٹکھ و فٹہ روزمرہ ہر وقت کام میں آنے والی نہایت کارآمد معلومات کا ذخیرہ ایک سال کا ایک جانا مانہ تاریخ و احساب

ساب خانہ داری مفت رکھنے کی مکمل ڈاگری۔ روزنامہ ہر ایک دھوبی تنخواہ ملازمین خرید جنس ماہواری روزمرہ ضروری اشیا کی خرید مابقہ خرچ نقشہ آمد و خرچ روزانہ ہر ایک مد کے لئے تاریخ وارجدا جدا لکھتے مع نام اشیا شامل ہیں۔ خالوں میں صرف تعداد وزن اور رقم دو نو

صحنی پڑتی ہیں۔ چھوٹی بچی یا بچہ اشیا کے نام پڑھ سکتا ہو۔ اور مہند سے لکھنے جانتا ہو۔ خانہ پر کر کے گھر کا حساب تاریخ وارجد رکھ سکتا ہے۔ اعز بڑا۔ کاغذ سفید، لکھائی و چھپائی اعلیٰ دو سو بیس صفحات قیمت دو روپے علاوہ محصول ڈاک ڈھائی آنے کے صرف سے آپ کے گھر میں

تینا دو روپیہ مانا نہ بچت لازمی ہے۔

خاتون وبے بی اسٹورز نمبر ۹۳۔ فتحپوری دھلی

ہمایوں کا سال گرہ نمبر

پونے دو سو صفحات کا شاندار ذخیرہ علم و ادب
سات رنگ یک رنگ گرائی نیتھا و چمنیں سہر ایک ساتھ ایک دلکش انظم یا مضمون موجود ہے
سالگرہ نمبر کے بعض دیگر مضامین

زمانہ حضرت ہمایوں مرحوم مغفور کی بقیر اور نظم و دلکش اور پر از معلومات مضمون مفصل و مبسوط عزم آفرین مضمون
آنکھ کا جادو ہمایوں کے مقالہ نگار خصوصی صاحب ایک نقاب پوش زندگی غازی غلام الدین صاحب کٹھیں انگلستان کے بلند پایہ شعرا جاکٹس کی زندگی
میاں عبدالعزیز صاحب کے جدت طراز قلم سے ایک ایم۔ اے بی۔ اے بی۔ ڈی کے قلم سے ایک خیالی کے حالات اور شاعری کا ایک دلکش تذکرہ مولوی
الوگھا افسانہ سیرت کا خاکہ حامد علی خاں صاحب بی۔ اے
کیف موسیقی حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک خزاں کی ایک ایت روس کے شہرہ آفاق بچہ حضرت تاجزین کی دل آویز فلسفیانہ نظم
دل آویز نظم افسانہ نویس مکیم گور کی ایک شاہکار کا اردو الماسات حکیم آزاد انصاری کے پاکیزہ حارفانہ
سائنس اور مذہب کا ملپ میاں بشیر احمد صاحب نے زہرہ از منصور احمد تخلیلات
آکسن کے قلم سے روح اور روحانیت کے سائل رویائے محبت صفحات جیل پر میاں بشیر احمد فلسفہ یاس کے متعلق مولوی حمید احمد خان
پر علی نظر سے ایک جامع و مانع تبصرہ صاحب کی ایک پر از سوز و گداز نظم صاحب کا ایک عالمانہ مقالہ
مصور میاں عبدالرحمن صاحب کا ایک قوت فیضیہ منیاء الدین صاحب کی ایک جام صہبائی حضرت انور مسابائی کی پرکھتہ باعیات
ان مضامین کے علاوہ تیس کے قریب دوسرے گراں پایہ مضامین ہیں جن کے عنوان قلت گناہ کی وجہ سے یہاں درج
نہیں ہو سکے ہندوستان کی فاضل خواتین کی نظم و نشر کے بہترین نمونے آپکو ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں ملیں گے قیمت یک روپیہ فریکٹی ہے۔

مینجر سالہ ہمایوں - بی۔ بی۔ ایس۔ روڈ لاہور

از کلبہ احرار خادم خلق

واقعہ ڈنگہ - ضلع گجرات پنجاب

وصال حق طلبی - نشین نامش بائیں صال خدا در وصال نام خدا

تقریظ از انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

عبادت میں ثقافت اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ اہل دین اور اپنے مذہب محبت و عقیدت رکھنے والے ضرور اسکا مطالعہ کریں۔

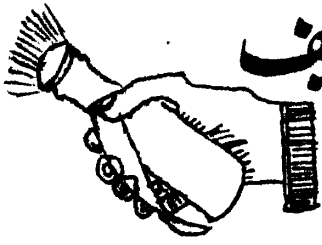
ترتیب دوم مولف جناب سید صاحب خادم خلق - ملے کا پتہ ڈنگہ ضلع گجرات پنجاب قیمت عدد محصول ڈاک نمبر ۱۵۲
تحفہ خادم خلق صفحہ تقطیع ۱۸ x ۲۲ مولف صاحب جلال پور کی جامعہ حزب اللہ سے تعلق رکھتے ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے ایسے رسالے وقتاً فوقتاً شائع کرے کا ارادہ کیا ہے۔ جو اخلاقی و مذہبی طور پر مفید ہوں۔ اور رسالہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ خدا - وحدانیت - برکات روحانی - وجود باری تعالیٰ پر استدلال بہت - جفا کشی - وغیرہ مختلف عنوانات قائم کر کے ان پریشانیوں کی ہیں مختصر نظمیں اور غزلیں بھی کہیں کہیں ہیں۔ غرض چھوٹے چھوٹے اخلاقی و مذہبی مضامین کا ایک کاشکول ہے مسلمانوں کے لئے سود مند ہونے میں شک نہیں ہے۔

بعد از اسلام سنت الاسلام بنیاد مند آپ صاحبان سے اپیل کرتا ہے کہ اس نیاز نامہ خدمت جمیع اہل دل مسلمانان اللہ کی کام میں سپاسداری فراموش نہ فرمائی۔ مذہبی قومی و اخلاقی اس کتاب کو خود خریدیں اور اس کے خرید اور مہیا کرنے میں سب سے پہلے فرما کر عند اللہ عاجز و عند الناس مشکور ہوں اور اس سرمایہ کی توسیع بذریعہ دیگر کتاب ہذا فرمائیں۔ تاکہ آئندہ بھی اشاعت و تبلیغ کا کام باحسن طریق جاری رکھا جائے۔

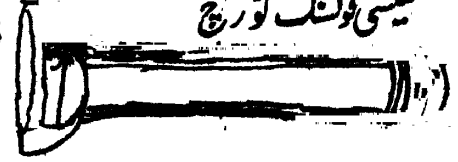
خواص فعل مضارع کو درست کر کے خون صلیح پیدا کرتا اور دوران خون باقاعدہ کرتا ہے جس سے بفضل ثانی موسم گرما کا تحفہ مطلق انسان بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ جگر کی اصلاح کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے جس کے لئے بھی مفید ہے۔ بالخصوص سکن لاہور اس کا تجربہ کریں قیمت چھ ماہ - عدد ترکیب استعمال آدھ لیا یا چھ ماہ میں صبح سویرے ایک رتی استعمال کیا جائے پرہیز ترشی بادی اور تیل کی اشیاء سے۔

پتہ - خادم خلق مقیم ڈنگہ - ضلع گجرات

قیمتوں میں حیرت انگیز تخفیف



قیمت علاوہ محصول



فیتی فوکنگ ٹورچ

بغیر بری کے بجلی کا پاکٹ لمپ
۹۵۵ اس میں ایک ڈائمنڈ لگا ہوا ہے۔ جو خود بخود بجلی پیدا کرتا ہے۔
اور کبھی خراب نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ خریدنے کے بعد میں کبھی
برس تک ایک پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر قسم میں
کام دیتا ہے۔ روشنی صاف و سفید ہے۔ قیمت ۷۷
علاوہ محصول ڈاک
لے کر پتہ۔

۲۱۰۳ سائیکل کس فوکنگ ریج ۵ فٹ فٹ قیمت ۱۷۷
۲۳۷۷ فکل سلور بوی منہ کشادہ فوکنگ ریج ۱۰۰ فٹ قیمت ۱۷۷
۲۴۴۷ نہایت چڑا منہ۔ دراز فوکنگ ریج ۱۵۰ فٹ قیمت ۱۷۷
۲۴۴۷ اصلی امریکن الوڈ ٹی بہت مشہور و معروف قیمت ۱۷۷
۲۴۴۷ پانچ میل کا تمام ٹورچوں کا سرتاج اس سے زیادہ دور روشنی پہنچانے
والا ٹورچ نہیں ہو سکتا۔ حد درجہ خوبصورت کشادہ منہ قیمت ۱۷۷
کمل بری لٹل
کم از کم ۱۷۷ والا ٹورچ بھی ہے مل سکتا ہے۔

کامریڈ ٹریڈنگ کمپنی ۹ گارٹن روڈ شہر دہلی

اردو کا نیا رسالہ

کامیابی

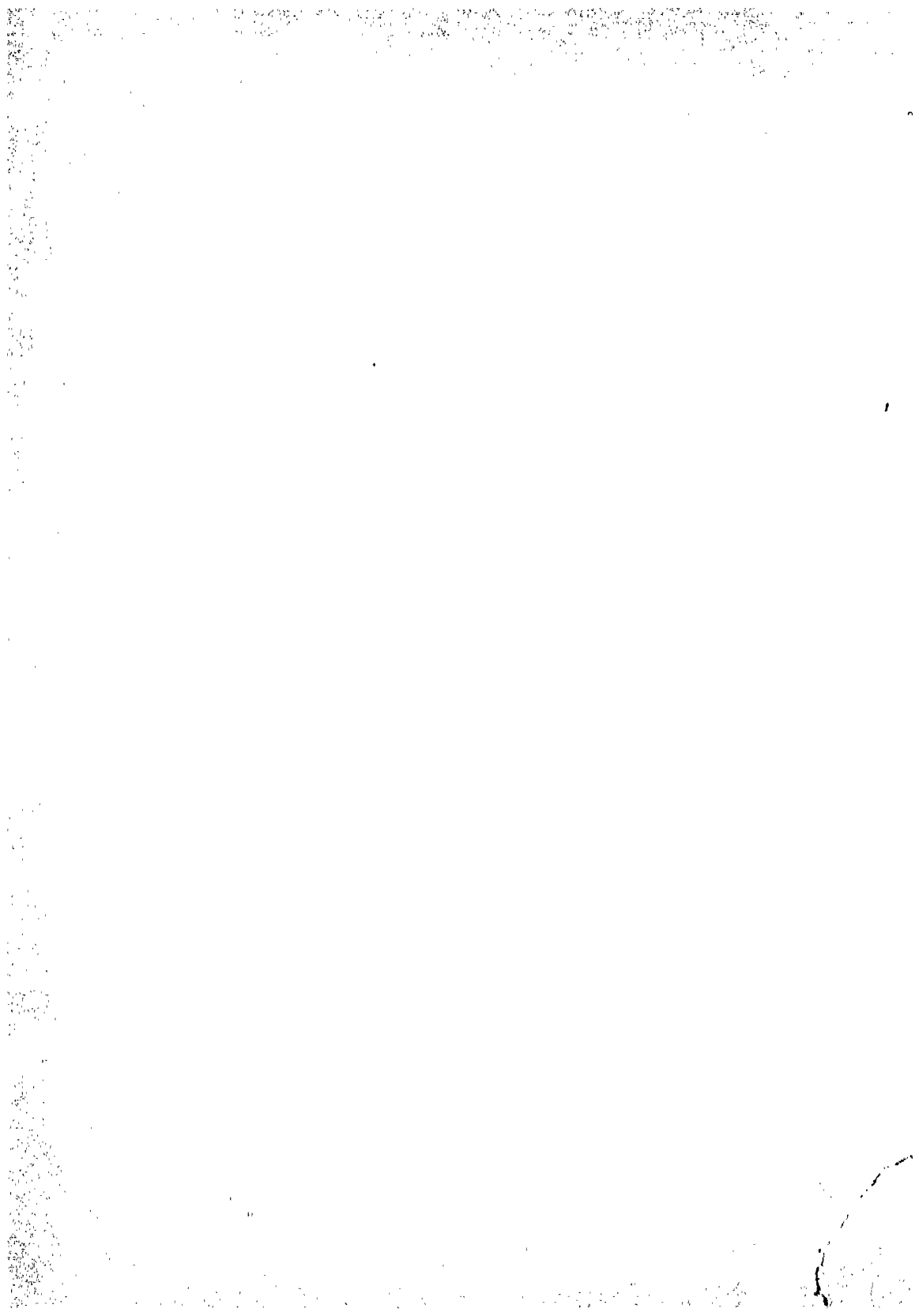
مسلمانوں کی عملی ایجاد اور اجتماعی قوتوں کو پیدا کرنے ان میں
اولوالعزمی، علمی حوصلگی، اجرات و استقامت محنت و جفاکشی ایسا
و قربانی کے اوصاف پیدا کرنے اور ان کو ترقی اور کامیابی کے
راستوں پر لگانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔
نہایت ہی عمل آموز اور کارآمد رسالہ ہے۔ اور اس کا مطالعہ
بچوں عورتوں اور جوان کے لئے پھر ضروری ہے۔
مخبرہ دیکھ کر آپ انشاء اللہ بہت پسند کریں گے۔ ابھی ایک کارڈ
نمونہ کیسے لکھ دیکھئے۔

میجر کامیابی دفتر حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر
محمدنی لٹریڈ دہلی

جام صہبائی

حضرت آثر صہبائی کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو
چکا ہے۔ آپ کی حیات افروز اور روح پرور رباعیات ملک کے
مختلف بلند پایہ رسائل میں شائع ہو کر نقادانِ فن سے خراج
تحسین وصول کر چکی ہیں۔ جام صہبائی کی خوبیوں کی ضمانت
کے لئے حضرت کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت صرف ۸
ملٹی کا پتہ

جلال الدین اکبر الراعی بلڈنگ بیرون بھائی
دروازہ۔ لاہور



قواعد

- ۱۔ ”ہمایوں“ بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے *
- ۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر ٹوٹے اتریں درج کئے جاتے ہیں *
- ۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے *
- ۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنے کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے *
- ۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے *
- ۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۹۳۶ صفحے سالانہ ہوتی ہے *
- ۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے، اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قسماً بھیجا جائے گا *
- ۸۔ جواب طلب امور کے لئے اس کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے *
- ۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ نمونہ *۔
- ۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے *
- ۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے *

مینجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی علم الدین مینجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی لائیکچرک پریس لاہور میں باہتمام بالبرنظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا



بشیر ذہنی (۱۳۶۲)
 اٹھو! وگرنہ خسر نہیں ہوگا پھپکھی
 دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
 (ہمایوں)

بِیَاكَارِ عَلَا فِضْلِہِ اَنْزِیْلِ حُسْبِیْ مِیَا فَجَّتْ كَاْذِبِیْنَ صَاہِیْہِیْہِیْ

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی، اے (آکسن) بیرسٹریٹ لاہ

جائنٹ ایڈیٹر } حامد علی خاں - بی، اے
 منصور احمد

1

2

فہرست مضامین

جلد ۱

نمبر شمار

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء
تصاویر: ۱۔ کوہ سہرام کا ایک دلکش منظر۔ ۲۔ حکیم عمر خیام صاحب مضمون

نمبر شمار	مضمون	نمبر شمار
۴۴۹	خلوت و جلوت	۱
۴۵۰	جہاں نما	۲
	تصاویر: کوہ سہرام کا ایک دلکش منظر حکیم عمر خیام	
۴۵۴	عمر خیام	۳
۴۵۵	ذوق شاعری	۴
۴۶۴	غزل	۵
۴۶۵	بلنسیہ	۶
۴۶۸	برسات (نظم)	۷
۴۶۹	سازھی اور سوٹ	۸
۴۷۳	تاثرات (نظم)	۹
۴۷۴	تاریخی جامعات	۱۰
۴۷۷	خدا حافظ (نظم)	۱۱
۴۷۸	شادی کیونکر ہو	۱۲
۴۸۱	بھابی کے نام خط	۱۳
۴۸۳	لمعات (نظم)	۱۴
۴۸۴	خالد اور جیدہ (افسانہ)	۱۵
۴۸۶	جستجوئے حق (نظم)	۱۶
۴۹۵	رات کی خاموشی میں	۱۷
۴۹۸	ضبط نفس	۱۸
۵۰۰	معارف محبت (نظم)	۱۹
۵۰۱	ایک بالآخر ہستی کے مصائب زندگی (افسانہ)	۲۰
۵۰۹	تجلیات (نظم)	۲۱
۵۱۰	بچے اور بزرے (افسانہ)	۲۲
۵۱۳	غزلیات	۲۳
۵۱۴	محفل ادب	۲۴
۵۱۹	مطبوعات جدیدہ	۲۵

خلوت و جلوت

اپنی خلوت میں الگ بیٹھا ہوا اپنی ہی چار دیواری میں گمراہ ہوا میں دنیا و عقبیٰ اور حیات و ممات کی الجھنوں کے سلجھانے میں مصروف ہوں۔ دنیا کو کس نے بنایا اور پھر اس کے پیچھے عقبیٰ کیوں ہوئی اور اس کے پہلے کیا تھا اور نہ تھا تو کیوں نہ تھا؟ اس سب کچھ کے اندر زندگی کی روح کیسے پھینکی اور چھپائی تو پھر اک ہوائے جھونکے کی طرح کس نے اس جہنم میں اُدھر سے آئی اور اُدھر سے چل دی؟ یہ زندگی جس نے بیل بوٹوں کو اگایا پرند چرند کو اڑایا دوڑایا یہ مجھ میں آکر کیوں نری سانس لینے والی چلنے پھرنے والی کھانے پینے بولنے چالنے والی جان نہ بنی رہی؟ میرے اس دہس کے خاکی وارضی جسم میں اگر یہ پوچھیں کس سوچ بچار میں پڑ گئی؟ دکھیتی ہے سنتی ہے سوچتی ہے اور سر بگڑیاں ہو جاتی ہے کیا یہ اس چھوٹے سے قید خانے میں بند کر دی گئی جس کی کھڑکیاں آنکھیں میں جو ہزاروں اور کروڑوں میل کے نظاروں کا پل کے پل میں عکس اتار لیتی ہیں جس کی غلام گردش دماغ ہے جو ایک چشم زند کے ہزاروں حصے میں اُس دور دراز حرم ناز کے دروازے پر جا دستک پاتا ہے جس کا رہنے والا شاید اسی سبک رفتار کے ساتھ کائنات کی وسعتوں میں کوئی آنکھ چھو لی ہی کھیل رہا ہے؟

اپنے گھر میں اس گھر والی سے یہ باتیں پوچھتا ہوں تو یہ اندر ہی اندر ایک کرب سا ایک بے چینی ہی پھیلا دیتی ہے۔ میں اُٹھ کر مٹھنے لگتا ہوں اور میری نگاہ اُن چند کتابوں پر جا پڑتی ہے جو میری الماری کی سچی زینت اور میری ہستی کی ایک جھوٹی شجی کا موجب ہیں۔ اپنی بے ثباتی میں یکے بعد دیگرے میں اُن کو اٹھاتا ہوں، ایک کستی ہے کائنات کا بنانے والا؟ اچھا تو پھر اُس کا بنانے والا؟ اور پھر اُس بنانے والا کا بنانے والا؟ فضول لغو بے معنی! دوسری کستی ہے جیم و جمن؟ عالم و عادل؟ نیک و پاک؟ اور اس پر یہ برائیاں اور باورسیاں چھوٹے بڑے کے جھگڑے یہ کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم و تکلیفیں اور مصیبتیں؟ بے عقلی کج فہمی خوش گمانی!

جاہل مرید کم عقل مہوید اور بے علم انسانوں کو طعن و تشنیع کرتا ہوا اپنے نفس سے باغی و بیزار ہو کر میں گھر سے نکل پڑتا ہوں لیکن اپنی خلوت سے یوں پہلو بچاتا ہوں کہ کسی کی جلوت سے دوچار ہو جاتا ہوں! اب محض اک میں ہی دلوں نہیں بلکہ یہاں تو مجھ سے کروڑوں اویسی ہیں اور بھیلیتی ہوئی زمین اور یہ اُٹھتے ہوئے پہاڑ اور یہ سورج کی کرنیں اور یہ بادلوں کے پرے اور دور دور و پھند اور وچھرا اور و غار اور وہ چوٹیاں اور پھر وہ چاند اور تارے اور اُن کی درمیانی مسافتیں اور اُن کوئی ماننے والے لیکن اور اُن دیکھی اُن سنی اور اُن بوجھی خدا ہی جانے کیا کیا کچھ!!!

”خلویٰ“

ہمال نما

جرمنی اور انگلستان کا لٹریچر

جدید "لونگ ایج" کے بہرہ ادبیات میں جرمنی اور انگلستان کے لٹریچر پر ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"برنر ٹیمپلیٹ" اور "ہنچر گارڈین" نے جرمنی اور انگلستان کے موجودہ ادب پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ جرمن اخبار لکھتا ہے کہ ۱۹۲۸ء کے دوران میں ہماری مطبوعات کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی ہے اور انگریزی اخبار نے یہ قیافہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اب سے ایک سو سال بعد موجودہ برطانیہ افسانہ نویسوں میں سے کون کون سے بہت زیادہ مقبول ہونگے۔

جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد بھی جرمنی برابر کتابوں کی پیداوار میں سب قوموں سے بڑھا ہوا تھا۔ صرف ۱۹۱۹ء میں وہاں ۵۸۷۶۶۱ کتابیں شائع ہوئیں، لیکن ۱۹۲۲ء میں ان کی تعداد ۴۲۶۱۴۱ تک پہنچ گئی۔ دو سال بعد تعداد گر کر ۱۸۰۳۸۰ رہ گئی، لیکن ۱۹۲۴ء میں پھر ۲۷۸۶۶۰ کتابیں طبع ہوئیں اور ۱۹۲۵ء میں ۲۶۹۵۱۲ کتابیں نئی اور پرانی جتنی کتابیں طبع ہوئیں ان کا میزان ۳۱۰۲۶ تھا اور ۱۹۲۸ء میں ۲۷۶۹۴۲ کتابیں اپنے ملک امریکا میں سالانہ اوسط دس ہزار سے کچھ کم ہی رہتی ہے اور برطانیہ عظمیٰ میں اس سے ذرا بڑھ کر۔

گزشتہ سال کی جرمن مطبوعات کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ ادبِ لطیف کی کتابیں دوسری اصنافِ کتب سے تقریباً دو گنی شائع ہوئیں۔ ان کی تعداد ۴۵۰۰ کے قریب تھی، دوسرے درجے پر مدر سے کی کتابیں اور تیسرے درجے پر صنیات اور دنیا کی کتابیں تھیں۔ گزشتہ سال کی بہ نسبت دو ہزار سے اوپر کتابیں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مضامین پر نکلیں۔ اگرچہ رومن حروف کا رواج ہر جگہ بڑھ رہا ہے لیکن جرمنی میں اب تک نصف سے زیادہ کتابیں گوٹک حروف میں چھپتی ہیں۔ تراجم کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال مان کی تعداد ۱۶ فیصدی سے متجاوز ہو گئی۔ پانچ سو سے زائد کتابیں انگریزی زبان سے ترجمہ ہوئیں۔ ۲۸۸ فرانسیسی سے اور ۱۷۶ روسی سے۔

انگلستان کے ادبی کوائف ماضی کی بجائے مستقبل کے متعلق ہیں۔ "پانچسٹر کارڈین" میں یہ معلوم کرنے کے لئے ایک مقابلہ جاری تھا کہ ۱۲۰۰ء میں عمر حاضر کے کون کون سے برطانیہ افسانہ نویس سب سے زیادہ مقبول سمجھے جائیں گے۔ مقابلہ میر، شامل ہونے والے ہر شخص کو چھ افسانہ نویسوں کے نام تحریر کرنے کی اجازت تھی جن کی تصانیف اُن کی رائے میں آج سے سو سال بعد سب سے زیادہ پڑھی جائیں گی کسی فرسٹ میں ۹۹ چھ نام یک جا موجود نہ تھے جو آخر مقبول ترین ثابت ہوئے، لیکن اول درجے کا انعام اُس شخص کو ملا جس نے ویلز، بینٹ، جارج مور، گالزورڈی، شیلے کے سمیت، اور آرایچ ماٹرم کے نام لکھے تھے۔ پہلے بیس ناموں کی فرسٹ یہاں درج ہے، اور ساتھ ہی اُن آرا کی تعداد بھی دی گئی ہے جو ہر ایک کے لئے موصول ہوئیں۔

۱۱ ۸۰

گالزورڈی

۹ ۳۳

ویلز

۶ ۵۴

بینٹ

۴ ۵۵

کپلنگ

۲ ۸۶

بیری

۲ ۳۳

وال پول

۱ ۹۸

کے سمیت

۱ ۶۵

جارج مور

۱ ۱۰

برنارڈشا

۱ ۰۱

کامن ڈائل

۷ ۹

آرایچ ماٹرم

۶ ۳۳

جان بوشن

۶ ۱

ڈی ایچ لارنس

۶ ۰۰

چپٹرٹن

۵ ۰

الڈوس ہکسلی

۴ ۸

ہال کین

۴ ۶

میری فیلڈ

۴۶

لاک

۴۱

روز میکالے

۳۸

فلپائن

برنارڈ شا کو زیادہ بلند جگہ اس لئے حاصل نہیں ہوئی کہ اُس کی شہرت کا انحصار افسانے کی بجائے ناولک پر ہے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ پہلے اور لارنس کو زیادہ آرا کیوں حاصل نہ ہوئیں۔ یہ امر بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اسی ایم فاسٹر کو ۱۳۷ ورجینیا ولف کو ۲۱، کاٹن میکنزی کو ۱۱۶ اور جیس جاس کو دس سے بھی کم آرا ملیں۔ امریکا والے یہ دیکھ کر بھی حیران ہونگے کہ اس کے ساتھ کو ایک کافی بلند مقام ملا ہے لیکن اس کی مقبولیت کی یہ وجہ ہے کہ اُس نے اپنی قابلیت کو اپنے محبوب وطن کے مناظر کے بیان کے لئے وقف کر رکھا ہے اور یہ بات انگریزوں کو بہت بھاتی ہے۔ امریکا کے اہل قلم اس مقابلے میں شامل نہ تھے۔

چینیوں کی "ذہانت"

چین کے کئی ایک اخبارات نے یہ خبر شائع کی ہے کہ چینی پولیس نے قیدیوں کی تعذیب کے لئے ایک برقی مشین منگائی ہے۔ ان اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں اُن سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انہوں نے طریقہ عمل بین الاقوامی آبادی کی پولیس کی تقلید میں شروع کیا ہے، لیکن جب کپتان مارٹن کشر پولیس سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ "اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے، اس پر عمل نہیں کیا جاتا اور اس کی اجازت کبھی نہیں دی جائے گی۔ بعض قیدیوں نے صوبائی عدالتوں میں یہ شکایت کی ہے مگر جب عدالت نے تحقیقات کی تو اس کی کوئی اصلیت نہ نکلی۔"

کرنل یو آن جو شنگھائی میں شعبہ امن عامہ کے ڈائریکٹر ہیں اغوا اور ڈکیتی کے بڑھتے ہوئے حادثات کے پیش نظر یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کم درجہ کی کوئی سزا ان رہزنوں کی سرکوبی نہیں کر سکتی اور نہ اس کے بغیر امن عامہ کا قیام ممکن ہے۔ جن جن مجرموں کو جسمانی سزا انہیں دی گئی اُن کے معاملے میں ترغیب و تخریب کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئی ہیں، انہوں نے جرم کا اقرار نہیں کیا اور معاملہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکی۔ چونکہ جہانی سزا حکومت کے احکام کے خلاف ہے اس لئے کرنل موصوف کی تجویز سے اور جنرل چنگ کی منظوری سے مجرموں کی تعذیب کے لئے ایک ایسی برقی مشین خریدی گئی ہے جس کے دو کھمبوں کے ساتھ دو منفی اور مثبت تاریں لگی ہوئی ہیں۔ ہر تار کے سرے پر دھات کا ایک دستہ ہے قیدی کے کپڑے اتروا کر اسے ایک کڑھی کی سیڑھی سے مضبوطی کے ساتھ کس دیا جاتا ہے اس کے ہاتھ سینے پر رکھے جاتے ہیں اور ان میں

یہ دھات کے تے تے دے دیئے جاتے ہیں۔ پھر سبکی کی روکھول دی جاتی ہے اور وہ مجرم کے سائے بدن کی ایسی ناقابل برداشت سنسنی پیدا کرتی ہوئی گزرتی ہے کہ وحشی سے وحشی ڈاکو بغیر کسی مزید کوشش کے جرم کا اقرار کر لیتا ہے۔

آفتاب

آفتاب ہماری دنیا کے لئے توانائی کا سرچشمہ ہے۔ توانائی کے وہ تمام وسیع خزانے جو کوئلے اور تیل میں پوشیدہ ہیں سبزیتوں نے انہیں سورج کی روشنی ہی سے اخذ کیا ہے۔ پروفیسر فریڈ ایم ڈیلانو کے قول کے مطابق آفتاب کی اس توانائی کی مقدار جو ہر روز زمین تک پہنچتی ہے اس توانائی کے برابر جو آٹھ ارب ٹن کوئلے سے برابر ہو۔ صرف ایک دن کی دھوپ سے اگر کام لیا جاسکے تو ساری دنیا کے کارخانے، ریل گاڑیاں اور دفانی جہاز میں ہزار سال تک چل سکتے ہیں۔

ایک مربع گز قطعہ زمین پر جو تپش دس منٹ میں پڑتی ہے وہ ایک کوارٹ پانی کو ابال دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن چونکہ ابھی ہم نے اس سے کام لینا نہیں سیکھا اس لئے اس کی تقریباً تمام کی تمام مقدار ضائع چلی جاتی ہے۔ سورج کی تپش اس قدر تیز ہے کہ ۹۹ فی صدی شیشے میں سے گزر جاتی ہے تپش ایک ایسے ڈبے میں جمع کی جاسکتی ہے جس کا ڈھکنا شیشے کا ہو اور جو اندر سے کالا ہو۔ لارڈ ہرشل ایک ایسے ہی ڈبے میں سورج کی تپش سے انڈے پکالیا کرتے تھے۔ روشن ملکوں میں استعمال کا پانی گرم کرنے کے لئے دھوپ ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ دھوپ سے پانی گرم کرنے کے آلات فلوریڈا اور کیلیفورنیا میں کثرت سے رائج ہیں۔

ذرے کی جسامت

آخر ملک نے دوسرے رخت و منس کی طرح ذروں کو بھی تول اور ناپ لیا ہے۔ ہونٹ ولسن کی صد گاہ کے ڈاکٹر ولسن کہتے ہیں کہ انسان کو ذرے اور ستارے کی درمیانی منزل میں نصف راستے پر کھنچا جائے۔ دس کھرب کھرب ذروں سے ایک آدمی کی تعمیر ہوتی ہے اور ایک سو کھرب کھرب انسانوں کا مادہ ایک اوسط ذرے کے ستارے کے برابر ہوتا ہے۔ ذرے کا قطر انچ کے دس کروڑویں حصے سے بھی کم ہے۔ یہ مقابلہ ایک گالف کے گیند کے ذرے کی اضافی جسامت اتنی ہی ہے جتنی گالف کے گیند کی زمین کے مقابلے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گیند کے ہر ذرے کو گیند کے برابر کر دیا جائے تو گیند زمین کے برابر ہو جائے گی۔

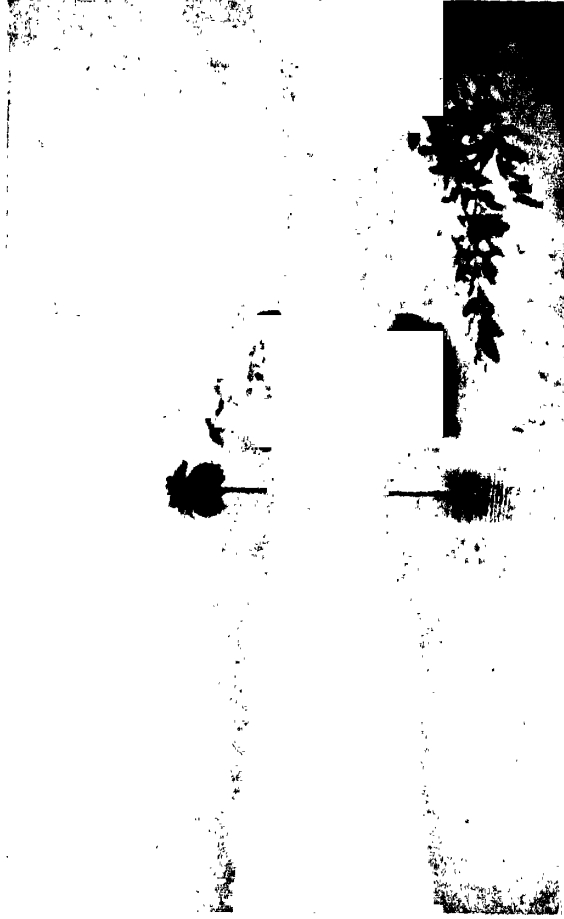


Photo by Shahabuddin Rehmatalah

کوہ سہسرام کا ایک دلکش منظر

فرعاد کا باقی ہے نشان کوہ کے ازیں اک چشمہ شہرین ہے رواں کوہ کے ازیں



حکیم عمر خیام

CALCUTTA
ART & WORKS
LANKA

عمر خیام

اس دنیا میں ہر شخص مسرت طلب پیدا کیا گیا ہے۔ آدمی پر جو کچھ آلام و مصائب گزرتے ہیں، ان سے عمدہ برا ہونے، اور ان میں تابعدار و تخفیف کرنے کی دل خواہش قلب انسان میں ہمیشہ مستور رہتی ہے۔ آج جو چیز نئی ہے کل پرانی ہو جائے گی۔ جو آج پیدا ہوا ہے وہ کل مٹ جائے گا، جہاں آج ہمارے وہاں کل خزاں ہوگی۔ انہیں مشاہدات کی بنا پر آدمی کے دل میں اس وقت خود بخود سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں جب اس کی عمر زرا بھیگ جاتی ہے اور وہ عہد شباب سے نکل کر پیری میں قدم رکھتا ہے۔ یہ دنیا کیا چیز ہے؟ روح کیا چیز ہے؟ موت کیا چیز ہے؟ زندگی کیا چیز ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ اور کہاں جائیں گے؟ زندگی کا اعتصام کیا ہے اور آخرت تمام کیا ہوگا؟

ابتداء سے آفرینش سے لے کر آج تک ان سوالات کا فلسفی بخش جواب کسی نے نہیں دیا ہے۔ مشہور حدیث ہے ان اولیٰ فی شاعر عمر خیام نے ان رموز و نکات کو اپنی لطیف رباعیات میں حل کرنے کی جوش کی ہے اور قابلِ ادب اور اس بنا پر آج وہ دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ بقول اس کے، روح ایک جسٹس لطیف ہے جس کا علاقہ جسم سے سوا ذاتِ باہمی سے براہ راست ہے۔ اس کا پیمانہ ہے کہ روح کو دنیا کی تمام شکستوں سے پاک رکھو طبیعت پر کبھی غم، تردد، افسوس، فکر اور طمع کا بار نہ ڈالو۔ ہمیشہ بے نیاز رہو۔ ایشیا اور ترقیاتی کی حقیقی روح لمپنا نذر پیدا کرو۔ اگر تم میں ایشیا کا جذبہ موجود نہ ہوگا تو تمہاری روحانیت تباہ ہو جائے گی۔

عمر خیام کسی ایک خاص مذہب و مسلک کا پیرو نہیں ہے۔ اس کے لئے عام مذہبی متفادات بہت اچھے ہیں، اور عالمگیر مذہب کا وہ قائل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صدائے ہر مذہب جلہ کرے۔ وہ کسی خاص مذہب و ملت کے لئے وقف نہیں ہے۔ خدا نے انہیں جو دل دیا ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تم حق و باطل کی تصویریں، وعن و کچھ دیکھ سکتے ہو۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، اس کا خیال انہیں ہے بلکہ وہ اس امر کا قائل ہے کہ جو کچھ واقعات حیاتِ انسانی میں گزرتے رہتے ہیں وہ سب تقدیر الہی کے تحت ہوتے ہیں۔ بغیر خدا کی مرضی اور حکم کے پتہ بھی نہیں مل سکتا۔ لہذا ہمیں جب کوئی تکلیف پہنچے، یا راحت و کامرانی نصیب ہو تو یہی یقین ہماری تسکین قلب کا ضامن ہو گا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔

انسانی زندگی ایسی ہے جیسے کنول کے پھول کی پتھریوں پر قطرہ ہائے آب ہوتے ہیں۔ ذرا ہوا کا جھونکا آیا قطرہ پھسل کر رو یا میں مل گیا، اور پھر وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ لہذا انسان کی قابلیت، حسن، شجاعت، دولت، جہمت، سب فانی اور چند روزہ ہے، اگر بقائے دوام ملتا ہے تو صرف اس کی روح کو۔ عمر خیام کو خدا پر انتہائی توکل ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا ہمیشہ معترف رہتا ہے اور توبہ کرتا رہتا ہے۔ عمر خیام کا سب نمایاں وصف یہ ہے کہ باوجودیکہ تنگ خیال اور متعصب تلافوں کے درمیان اس کی پرسکون اور تربیت ہوئی تاہم وہ تعصب اور مذہبی امتیاز سے بالکل برا اور منفرہ رہتا ہے۔

تخیل کی رفعت اس کے کلام کی ایک خاص شان ہے۔ اس کے جامِ سفالی کے ایک ایک فنے میں ہزاروں خوبصورت چہرے، خند و غلے گل مسرت و کامرانی تھیں، ملے جڑے ہیں، جو کبھی خاک میں مل گئے اور پھر کھارنے اُن کی خاک کا جام تیار کیا۔ اسی طرح خیام کے کاشانے کی ایک ایک اینٹ میں غرور و تکبر اور شامِ ازاقت دار والے تلخ وادوں کے سر کی خاک ملی ہوئی ہے۔ عمر خیام باوجودیکہ فضل و علم میں کامل ہے، تاہم اپنے آپ کے انتہائی کسرتی سے جاہل مطلق تصور کرتا ہے۔ اُس کا مقولہ ہے۔

تمہارا آخری مقصد خدا کی ذات ہونی چاہیے

حسن عزیز جاوید

ذوق شاعری

تھوڑی دیر کے لئے شاعری کی بحث سے بالکل الگ ہٹ کر سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ”مناق“ یا ”ذوق“ جسے انسان کی دماغی خوبیوں میں ”جمالی“ نقطہ نظر سے سب سے بہتر تصور کیا جاتا ہے دراصل ہے کیا چیز؟ مختصر الفاظ میں یہ تعریف پیش کی جاسکتی ہے کہ ”ذوق اُس قوت کا نام ہے جس کے ذریعہ ہم خوبصورت چیزوں کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔“ قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ذوق کوئی ”اندرونی طاقت“ ہے جو حسن کے اثر کو قبول کرنے کا کام انجام دیتا ہے یا اس قوت کا تعلق عقلی براہین اور خارجی دلائل سے ہے؟ یعنی ذوق کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے یا عقل سے؟ اس بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنے تجربے سے دریافت کرنا پڑے گا کہ جب ہم کسی خوبصورت چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم پر اُس کے حسن کا اثر کیونکر اور کس طرح کام کرتا ہے؟ آیا اس قلبی اثر کے لئے ہم اپنے فطری وجدان کے ممنون احسان ہوتے ہیں یا عقل اور تیز کی عقدہ کشائی کے؟ جب ہم کوئی روح افزا منظر دیکھتے ہیں یا کوئی تڑپا دینے والا گیت سنتے ہیں تو کیا ہم پر ان چیزوں کا محض اہل لئے اثر ہوتا ہے کہ چند مخصوص دلائل کی بنا پر وہ منظر قابل ستائش قرار پاتا ہے اور گیت سے محفوظ ہونے کے لئے ہمارے پاس متعدد عقلی وجوہ موجود ہوتی ہیں۔

ہمارا تجربہ ان سوالات کا یہ جواب دیتا ہے کہ خوبصورت مناظر یا سامعہ نواز صداؤں سے اثر پذیر ہوتے وقت ہمارا دماغ کبھی کسی منطقی استدلال کی ادھیڑ میں الجھا ہوا نہیں رہتا، نہ ہمارا ذہن اس وقت دلائل اور براہین کے ذریعہ ہمیں کسی عقلی نتیجہ کی راہ دکھانے میں مصروف ہوتا ہے بلکہ ہم بالکل وجدانی طور پر غیر محسوس طریقے سے حسن کا نوری اثر اس طرح قبول کر لیتے ہیں کہ بسا اوقات حسن کے بہت گہرے اثر کے باوجود ہم یہ تک بتانے سے بالکل قاصر رہتے ہیں کہ اس شدید اثر کی کونسی کھلی ہوئی اور نمایاں وجہ ہے؟ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ”ذوق“ کا تعلق ”وجدان“ سے ہے جو تمام نرا ایک اندرونی قوت ہے۔ ذوق کے وجدانی ہونے کا ایک دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ حسن سے متاثر ہونے کے معاملے میں فطرتاً کائنات کے تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ نیچر کے حسین نظاروں اور نغمہ و موسیقی کی دلکش صداؤں سے جہاں ایک طرف حقائق عالم کا رمز شناس فلسفی لطف اٹھاتا ہے وہاں دوسری طرف ہل

چلانے والا کسان اور بھیڑیں پالنے والا چرواہا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عمدہ خوشبوؤں اور خوشنما رنگوں سے جس طرح ایک پڑھا لکھا جوان آدمی محفوظ ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مدرسہ کے ناخبرہ کارلٹ کے لئے بھی یہ چیزیں اثر اور لطف سے خالی نہیں۔ خوبصورتی سے محفوظ ہونے کے لئے بچے اور بوڑھے، تعلیم یافتہ اور جاہل، امیر و غریب کی کوئی قید نہیں،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جمال کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ یعنی کسی پر کم ہوتا ہے اور کسی پر زیادہ لیکن بہر حال خواہ کم ہو خواہ زیادہ لیکن ہونا ضرور ہے۔ یہاں پر سوال صرف یہ کم اور بیش، پختہ کارہ جاتا ہے لیکن اس میں ذہ برابر شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حسن سے متاثر اور محفوظ ہونے کی خاصیت تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو وصف تمام انسانوں میں مشترک ہو وہ کسی کوئی خارجی چیز نہیں ہو سکتی بلکہ لازمی طور پر اُسے اندرونی اور فطری ہونا چاہئے۔ بس یہ امر ثابت ہو گیا کہ ”ذوق“ بلاشبہ ایک وجدانی قوت کا نام ہے۔

ذوق کی اصلی بنیادیں تو دراصل اُس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جسے وجدانِ قلب کہتے ہیں لیکن اگر ہم ایک ترقی یافتہ ذوق کا تجربہ کرنے بیٹھیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ ذوق کے اندر جو عناصر شامل ہیں اُن کا پہلا اور بنیادی حصہ تو وہی ہے اور دوسرا اضافہ حصہ ”الکتابی“ ہے۔ ذوق کا وجود ہوتا تو تمام انسانوں میں فطری طور پر ہے لیکن سب کا ذوق یکساں اور ایک ہی حالت پر نہیں رہتا بلکہ الکتابی ذرائع سے ارتقا اور بالیدگی حاصل کرتا رہتا ہے اور یہیں سے تمام انسانوں میں ذوق کی کمی بیشی کا یا اچھے اور بُرے مذاق کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے بعض لوگوں میں ذوق کی قوت بہت ہلکی اور کمزور ہوتی ہے۔ وہ حسین چیزوں سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر ہونے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں میں صرف حسن کی بہت موٹی موٹی اور نمایاں خوبیوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جمال کے لطیف پنہاں اور غیر نمایاں پہلوؤں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف بعض لوگوں میں ذوق اس قدر قوی ہوتا ہے کہ حسن کے باریک سے باریک اور نازک سنا کرک رخ بھی اُن کی محاورہ جستجو سے پوشیدہ نہیں رہتے۔

اگر ہم ذوق کی اس کمی و بیشی اور مقدار کی عدم یکسانیت پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ اس اختلاف کے عموماً دو بڑے اسباب ہوتے ہیں:-

(۱) داخل -

(۲) خارجی

۱۔ داخلی اسباب سے میری مراد یہ ہے کہ تمام انسان اپنی دماغی ساخت اور ذہنی قوتی کے لحاظ سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور چونکہ وجہ ان کی عمدگی کا دماغی قوتی پر بہت کچھ انحصار ہے اس لئے فطرتاً بعض لوگوں میں حسن سے متاثر ہونے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔

۲۔ خارجی اسباب سے میرا یہ مطلب ہے کہ چونکہ کتابی ذرائع سے ذوق کی ترتیب کی جاسکتی ہے اس لئے جن لوگوں کو اپنے ذوق کی بالیدگی کے لئے موافق حالات میسر آتے ہیں۔ ان کا مذاق دوسریں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ظاہری حالات اور تعلیم و تمدن کے فرق کی وجہ سے ذوق میں عدم یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ ذوق پر تعلیم اور تربیت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہ حقیقت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جس میں نشو و نما اور بالیدگی کی صلاحیت موجود ہے۔ آئیے اب ہم یہ دریافت کریں کہ ہم کون کون سے طریقوں اور ذریعوں سے مذاق کو بالیدہ کر سکتے ہیں اور نشو و نما کے ارتقائی مدارج طے کر لیں۔ ان کے لئے کون سی تدابیر معین اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ انسانی قوتوں کو ترقی دینے کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ ان سے مسلسل اس کثرت سے کام لیا جائے کہ یہ کثرت استعمال ان قوتوں کے لئے ورزش کا سامان بہم پہنچا دے۔ جس طرح جسم کو تندرست حالت میں رکھنے اور بدن کی قوت بڑھانے کے لئے جسمانی ورزش نہایت ضروری چیز ہے ٹھیک اسی طرح ذہنی قوتوں کو نشو و نما بخشنے کے لئے بھی لازمی ہے کہ ہم انہیں استعمال کی کثرت سے برابر طاقت پہنچاتے رہیں۔ ورزش جس طرح جسمانی قوتوں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح دماغی اور ذہنی قوتوں کے لئے بھی فائدہ رساں ہے۔ اور تو اور خود ہمارے حواس خمسہ کا یہ حال ہے کہ ان پر استعمال کی کمی اور زیادتی کا پورا پورا اثر پڑتا رہتا ہے جن لوگوں کو اپنے پیشہ کے لحاظ سے روزمرہ کی زندگی میں کسی مخصوص حس سے زیادہ کام پڑتا رہتا ہے ان کی وہ حس دوسرے حواس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی بصارت جزئیں کے باریک کل پرزوں کا کام کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر قوی ہوتی ہے جس گھڑی کے پرزوں میں ہمیں باوجود غور کے کوئی خرابی یا سبے نرمی نہیں دکھائی دیتی اس میں ایک مشاق گھڑی ساز کی آنکھ بیک نظر نازک سے نازک نقص کی گرفت کر لیتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ عطر کے کارخانوں میں ملازم ہوتے ہیں اور جنہیں روزانہ مختلف قسم کے عطروں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے ان

کا شامہ اس درجہ تیز ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحہ میں خوشبوؤں کے باریک سے باریک فرق کو بھی پہچان جاتے ہیں۔ جب حواس کو مشق اور کثرت استعمال سے اس قدر قوت پہنچائی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ذوق کو اس قسم کے خارجی ذرائع کی مدد سے ترقی نہ دی جاسکے۔

مثال کے طور پر موسیقی کے ذوق کو لے لیجئے۔ ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ ذوق حیرت انگیز سرعے کے ساتھ ارتقا کے مدارج سے گذرتا رہتا ہے۔ بالیدگی اور نشوونما کی استعداد جس قدر اس مذاق میں ہوتی ہے کسی دوسری قوت میں نہیں۔ مبتدی کو شروع شروع میں صرف سیدھی سادی اور عامیانه چیزوں میں مزہ آتا ہے۔ اس منزل میں اسے فن کی بلند چیزوں سے مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ تک کثرت کے ساتھ گانا سنتے سنتے وہ راگ راگنیوں کے سطحی فرق سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس منزل سے بھی گزرنے کے بعد اُسے پست اور بلند چیزوں میں امتیاز ہونے لگتا ہے اب ادنیٰ درجہ کی عامیانه چیزیں جنہیں وہ کچھ عرصہ پیشتر اس قدر دلچسپی سے سنا کرتا تھا اُسے محفوظ نہیں کرتی اُسے بلند چیزوں کی تلاش پیدا ہونے لگتی ہے۔ غزل سے بندرتج ٹھہری اور دادوا، پھر دادا سے ٹپہ اور ترانہ کی نوبت آتی ہو یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے سابقہ پڑتے پڑتے مذاق میں اور زیادہ بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے تو ان سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ذوق کی بلندی اس منزل پر پہنچ کر دہریہ اور خیال کی سی نازک فنی چیزوں کی طلبگار ہو جاتی ہے۔

جو لوگ فن مصوری کے مبصر ہوتے ہیں انہیں ابتدائے شعور ہی سے اس صنعت میں دخل نہیں ہوتا۔ مذاق کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لئے انہیں بھی بالکل اسی طرح صد ہا منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، جس طرح موسیقی کے اہل نظر کو۔

یہاں تک جو بحث ہوئی وہ مجموعی حیثیت سے اس ذوق کے متعلق تھی جس کے فیوہرے ہم ہر قسم کے حسن سے مشاعرہ ہوتے ہیں۔ اب ہم اپنی بحث کو صرف اُس ذوق تک محدود کریں گے جس کا تعلق محض شعری اور سخن فنی سے ہے۔ اب ہمیں یہ بات دریافت کرنا چاہئے کہ ذوق شاعری کو سدھارنے اور ترقی دینے کے کیا ذرائع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذوق شاعری چونکہ ”مجموعی ذوق“ ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کو ترقی دینے کے جو طریقے ہیں اُن کی شاخ رہیں بھی بالکل وہی ہیں جن سے مجموعی ذوق کو ارتقائی مدارج میں گذرنا پڑتا ہے، شاعری کے بہترین شاہکاروں کے مطالعے سے اُن کے باہمی موازنہ اور مقابلے اور مختلف قسم کے کلام کو کثرت کے ساتھ پڑھنے سے ٹھیک اسی طرح مذاق کو درست کیا جاسکتا ہے جس طرح نغمے کے شوقین بالکل استادوں کا گانا سن سن کر موسیقی کے ذوق کو سزا دیتے ہیں۔

ابتداء میں جب کوئی شخص پہلی مرتبہ شاعری کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اس کا وجدان حد درجہ کند اور ضعیف الحس ہوتا ہے۔ اول اول شعر کی لطافت اس پر بہت خفیف اثر کرتی ہے۔ اُسے عموماً عامیانه قسم کے اشعار ملاحظہ کرتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہوتی ہے جس میں اُسے اعلیٰ درجہ کے شعر اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ صاف صاف یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ جس کلام کا وہ مطالعہ کر رہا ہے اس میں کون کون سی نمایاں خوبیاں یا کون کون سے کھلے ہونے عیوب ہیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ کلام کو جانچنے کے لئے وہ کس چیز پر اپنے فیصلے کا انحصار کرتے زیادہ سے زیادہ وہ یہ بتا سکتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اسے حظ اور انبساط حاصل ہوا یا نہیں۔ لیکن اس شخص کو اگر شاعری سے کثرت کے ساتھ سابقہ پڑتا ہے تو اس کے مطالعہ کے پہلو بہ پہلو اُس کے مذاق میں بھی قی پیدا ہوتی جائے گی۔ جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا اُس کا ذوق بھی سدھرتا جائے گا۔ تھوڑے دنوں کی مشق اُسے اس قابل بنائے گی کہ وہ کسی نظم کو پڑھ کر اُس کے متعلق نہ صرف یہ فیصلہ کر سکے کہ وہ اچھی ہے یا بُری بلکہ وہ نظم کے تمام پہلوؤں کو جزو جزو اپیش نظر رکھ کر اُس کی خوبیوں کو سمجھ سکے۔

مندرجہ بالا امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوق شاعری کو بالیدہ کرنے کے لئے مطالعہ بہت ضروری چیز ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس مخصوص قوت کی نشو و نما کے لئے ہمیں اپنے دماغ کو ادبی ورزش بہم پہنچانا ضروری ہے۔ ذوق کو بالیدہ کرنے کا ایک دوسرا اہم طریقہ اور بھی ہے۔ اس کا تعلق براہ راست انسان کی عقل سلیم اور قوت تیز سے ہے۔ ہم کسی کلام کے محاسن کو اُس وقت تک حقیقی طور پر نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی عقل سلیم اور قوت تیز کی مدد سے اچھائی اور برائی میں فرق محسوس کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اپنی سمجھ کے ذریعہ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُس کو اچھا یا بُرا سمجھنے کے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں؟

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذوق ایک ایسی قوت ہے جسے دو طریقوں پر بالیدہ کیا جاسکتا ہے۔ (۱) کلام کے متواتر مطالعہ کے ذریعہ دماغ کی ورزش سے۔

(۲) کلام کو عقل سلیم اور قوت تیز کے ذریعہ پرکھنے سے۔

اگر ہم مذاق شاعری کی مکمل ترین نوعیت پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ مذاق میں عموماً دو بہت نمایاں اور اہم خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اول لطافت مذاق۔ دوم صحت مذاق۔

لطافت مذاق اور صحت مذاق میں بہت نازک اور لطیف لیکن نہایت اہم فرق ہے۔ لطافت مذاق کا تعلق تمام تر اس فطری وجدان کی عمدگی پر ہے جس پر ذوق کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔ وجدان کی عمدگی کا معیار یہ ہے کہ کلام کی وہ خوشنمایاں بھی جو بے حد نازک اور غیر نمایاں ہونے کی وجہ سے ظاہر میں نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں ہم اپنی

تمام دلفریبیوں کے ساتھ اپنے اصلی رنگ میں عریاں نظر آجائیں۔

مذاق میں لطافت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اعلیٰ درجہ کے وجدان کے ساتھ انسان میں حسیت بھی بدرجہ اتم ہو۔ ”حساسیت“ سے میری مراد ”حواس کے ذریعہ خارجی چیزوں سے متاثر ہونے کی قوت“ ہے۔ جن لوگوں میں حساسیت کی قوت مضاعف ہوتی ہے وہ کبھی حسن سے صحیح طور پر متاثر نہیں ہو سکتے۔ نیچر اور آرٹ کی خوبصورتی سے پورا پورا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کی بصارت، سماعت، لمس، شامہ اور ذائقہ اپنا اپنا فعل پوری استعداد کے ساتھ انجام دیں۔

صحیح مذاق کا تعلق اُس بالیدگی سے ہے جو سمجھ اور عقل سلیم کے ذریعہ ذوق کو حاصل ہوتی ہے۔ صحیح مذاق شخص وہ ہے جو کلام کی فنی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ جس کے پیش نظر کلام کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہمیشہ عقل سلیم کا معیار ہوتا ہے۔ وہ کلام کا باہمی موازنہ کر کے اس بات کا پتہ لگا لیتا ہے کہ کونسی خوبی کس پایہ کی ہے؟ اور کلام کا کون سا پہلو عمدگی کے لحاظ سے کیوں قابلِ متانش ہے؟ ایسا شخص کبھی شعر کے ظاہری محاسن پر نہیں جاتا۔ اس کو الفاظ کی بھڑک اور فقرہوں کا انوکھا پن اُس وقت تک ہرگز نہیں رجھا سکتا جب تک وہ شعر کو اپنی سخن سنجی کی کسوٹی پر کس کر اُس کے حقیقی محاسن کا اندازہ نہ کر لے۔

اس میں شک نہیں کہ صحیح مذاق اور لطافت مذاق دونوں لازم اور ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے آپس طرح وابستہ اور پیوست ہیں کہ کسی طرح انہیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح مذاق اُس وقت تک صحیح مذاق قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اُس کے ذوق میں صحت کے پہلو پہلویہ لطافت بھی موجود نہ ہو۔ اسی طرح لطیف مذاقی کے لئے صحیح مذاقی لازمی چیز ہے۔

اس تمام بحث کے بعد اب یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اچھے اور بُرے ذوق کے درمیان تمیز کر سکیں؟

اس سوال کا جواب زیرِ نظر بحث کا وہ حصہ ہے جس میں ہمیں سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس بات کا ایمان داری کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دماغ انسانی کی کوئی قوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر لوچدار، تغیر پذیر، اور جلد جلد رنگ بدلنے والی نہیں ہے جتنی کہ ذوق مختلف زمانوں اور مختلف حالات کے تحت دنیا میں ہمیشہ مذاق میں اس قدر کثرت اور سرعت کے ساتھ انقلاب اور تغیر رونما ہوتا رہا ہے کہ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کوئی مستقل بالذات شے ہو بھی یا محض اعتباری اور ظنی شے ہو؟

آیا اس کی بنیادیں کسی ٹھوس حقیقت پر قائم ہیں یا یہ چیز فطرتِ انسانی کے تلون پذیر رجحانات اور ذہن کے رنگ بنگی میلانات کے زیرِ اثر ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ چیز جو آج سے پچاس برس پیشتر صنعتی خوشنمائی اور فنی حسن کا بہترین شاہکار قرار دی جاتی تھی آج جدید روشنی کے دور میں اس قدر پامال اور غیر دل کش سمجھی جاتی ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونا بھی اپنے مذاق کی توہین سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ناسخ کی شاعری کو لیجئے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ناسخ استادِ روزگار تصور کئے جاتے تھے۔ ہندوستان کے اس گوشے سے اُس گوشے تک اُن کی شاعری کی دھوم تھی۔ اور سخن فہموں کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کے کمالِ شاعری کے گیت نہ گائے جاتے تھے۔ لیکن آج ناسخ کے رنگ کا پسند کرنے والا مشکل سے ہندوستان کی تمام آبادی میں کوئی ایک آدمی ملے گا۔ انصاف سے بتائیے موجودہ زمانہ کے اردو دل چلتے ہیں آپ کتنے ایسے اربابِ فہم دیکھیں گے جو ناسخ کی شاعری سے لطف اٹھا سکتے ہوں؟ ”شعوی گلزارِ نسیم“ جو ایک زمانہ میں سخنِ سخن کی آنکھ کی سرمہ بنی ہوئی تھی، جو اپنے عہد کی بہترین شاعری کا بہترین شاہکار تصور کی جاتی تھی آج کیوں بے توجہی اور فراموشی کی تاریکی میں پڑی ہوئی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن سے بظاہر یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ واقعی مذاق کا کوئی اصل معیار نہیں۔ ہر شخص کا ذاتی مذاق ہی اُس کے لئے معیار کا کام دیتا ہے اور یہ کہ ہم کوئی ایسا مشترک معیار قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جس کے فیصلے کے سامنے سب کو بلاچون و چرا تسلیم کی گردن خم کر دینا پڑے۔

اگر ہم ذرا سا بھی غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ایسا سمجھنا محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر بالفرض ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیں کہ اعلیٰ درجہ کے ذوق اور ادنیٰ ذوق میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی ایسا معیار مشترک نہیں ہے جس سے مراعہ کیا جائے تو لامحالہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ہر قسم کا ذوق خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اپنی اپنی جگہ پر اچھا ہے۔ اہل نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ یہ دعویٰ کس قدر مہمل اور بے معنی ہے۔ ممکن ہے کہ کلام کی سطحی خوبیوں کے معاملے میں یہ دعویٰ زیادہ ناقص اور بے معنی نہ نظر آئے لیکن جہاں شاعری کے اعلیٰ درجے کے نمونوں کی بحث آپڑتی ہے وہاں یہ دعویٰ محض غلط ہی نہیں بلکہ حد درجہ احمقانہ ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ہم اے پیش نظر ایک ایسا گروہ ہے جس میں مذاق کے لحاظ سے ہر درجے کے لوگ شامل ہیں۔ اگر اس گروہ کا ہر شخص فرداً فرداً غالب کی شاعری کو پسند کرتا ہے تو اس سے ہم اس نتیجہ پر سرگرد نہیں پہنچ سکتے کہ اس جماعت کے تمام افراد کا ذوق یکساں طور پر اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگر انہیں لوگوں سے

علیحدہ علیحدہ غالب کے بہترین شاہکاروں پر تنقیدی نقطہ نظر سے تفصیلی رائے پوچھی جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ ذوق کے لحاظ سے اس جماعت کے سارے افراد یکساں نہیں ہیں بلکہ کسی کا مذاق بلند ہے کسی کا پست۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یہ تسلیم کر لینا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذوق میں سرے سے کوئی فرق نہیں کتنی بڑی نا انصافی ہے۔ جب ہمارے پاس اس بات کے کافی دلائل موجود ہیں کہ ہم بجا طور پر ایک شخص کے مذاق کو دوسرے شخص کے مذاق پر ترجیح دے سکتے ہیں یا ایک شخص کے ذوق کو اچھا اور دوسرے کے ذوق کو بُرا قرار دے سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مذاق میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق قائم کر سکتے ہیں تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ذوق کی اچھائی اور برائی پر کھنے کے لئے کوئی مشترک معیار ضرور ہونا چاہئے۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ معیار کی ضرورت عموماً کن صورتوں میں لاحق ہوتی ہے؟ ہمیں کب اس کی حاجت پیش آتی ہے کہ ہم کسی معیار سے فیصلے کے لئے اپیل کریں۔

اگر مختلف چیزوں کے متعلق متضاد آراء کا اظہار کیا جائے تو اس وقت معیار کا سوال زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کیجئے آپ کا کوئی دوست غالب کا پرستار ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر کو غالب کا مدد مقابلی نہیں سمجھتا۔ اس کا خیال ہے کہ غالب کا کلام تمیر سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آپ میر کی شاعری کو غالب کی شاعری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ چونکہ آپ کی رائے آپ کے دوست کی رائے کے بالکل متضاد ہے۔ اس لئے یا تو آپ کا مذاق صحیح ہوگا یا آپ کے دوست کا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے دعووں کی حمایت میں آپ یہ کہہ کر اُسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ میر کا سا سوز و گداز، اس کی سی زبان کی حلالت اور نرمی اس کا سا خلوص اور درد غالب کے کلام میں موجود نہیں لہذا میر لازمی طور پر غالب سے بہتر شاعر ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کا دوست غالب کی فوقیت میں یہ دلائل پیش کر سکتا ہے کہ خیالات کی قدرت، مضامین کے تنوع، غیل کی بلند پر کاری، انداز بیان کی جدت، اور الفاظ کے شکوہ کے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمہری نہیں کر سکتا لیکن اس تمام بحث کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کا ذوق جو میر کو غالب پر فوقیت دیتا ہے بہتر ہے یا آپ کے دوست کا جو غالب کو میر کے مقابلے میں قابل ترجیح ٹھہراتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تصفا لے باوجود دونوں کا مذاق اپنی اپنی جگہ پر اعلیٰ درجہ کا ہو۔

لہذا معلوم ہوا کہ دراصل معیار کے سوال کی اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے، جب ایک ہی شے کے متعلق لوں میں اختلاف رائے ہو یعنی جب اسی چیز کو ایک شخص خوبصورت اور دوسرا بد صورت قرار دے۔ مثلاً اگر

کوئی شخص یہ کہے کہ میرے کلام میں کوئی خوبی نہیں۔ اس کی شاعری بے جان اور مردہ ہے اس کے کلام میں نہ کوئی گداز ہے نہ سوز و ساز نہ تاثیر۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اُسے اردو شعر کی صف میں کوئی مرتبہ دیا جائے، تو ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یا تو یہ شخص شاعری کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور یا اس کا مذاق حد درجہ ناقص اور بگڑا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اس پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کا مذاق غلط ہے شاعری کے کسی مشترک معیار سے اپیل کریں اور اس معیار کے ذریعہ اُس شخص کی بے راہ روی اسے سمجھا دیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ذوق کی اصلی بنیادیں تو اس اندرونی حاسہ پر ہوتی ہیں جس کا تعلق وجدانِ قلب سے ہے لیکن خارجی طور پر بھی ذوق کو عقلِ سلیم اور قوتِ امتیاز کے ذریعہ ترقی بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔

اب اگر دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا موجود ہوتا جس میں تمام انسانی قوتیں مکمل ہوتیں جس کے ذہنی اور دماغی قوتیں ہر حالت میں بہترین اور صحیح ترین کام انجام دیتے۔ جس کی عقل کبھی خطا نہ کرتی اور جس سے فیصلے کے وقت ذرہ برا بھلا کا احتمال نہ ہوتا تو ہم بلا خوف و اندیشہ تمام مخلوق کے مذاق کے لئے اپنے شخص کی صائب رائے کو معیار قرار دے سکتے تھے۔ لیکن چونکہ خدا کی اس وسیع کائنات میں ایک شخص بھی اپنے اندر یہ تمام خصوصیتیں اکٹھی نہیں رکھتا اس لئے لازمی طور پر ہمیں اُس اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کے افراد میں مندرجہ بالا خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود ہوں۔ یعنی ہم باسانی اُس اکثریت کے مذاق کو معیار قرار دے سکتے ہیں جس کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر وہی اور اکتسابی دونوں حیثیتوں سے اپنے اندر وہ تمام خوبیاں رکھتا ہو جو مذاق کی صحت اور لطافت کے لئے ضروری ہیں۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ اختلاف رائے کے ہر موقع پر ہم اس معیار سے کسی صحیح اور فوری فیصلے کے طالب ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ شعر و سخن کے معاملات میں عام طور پر جو موٹے موٹے اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کے طے کرنے کے لئے اکثریت ہی کے مذاق کو معیار کے طور پر پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔

ذوق

حیدر آباد دکن



غزل

پرستش کے قابل ہو تحقیق ہی
ہمیں علم ہے اور بہ تحقیق ہے
بجا ہے، مرا ناز قسمت بجا
وہ مجھ سے قریب اور ہیں اُس سو دُو
محبت کے اثنا میں ہر جور دوست
تعجب ہے اُس کا کرم اور یہ دیر
عطائے دو عالم تو برحق ہر گز
جو تو کافر عشقِ جاناں نہیں
مرے کفر کو کفر کہنا غلط
اُسے خطِ عقبے سے کیا واسطہ
مرا ایک دم اور دو عالم کے غم
تصور کے ہمراہ تصدیق ہے
فقط دردِ دل و جگر تخلیق ہے
کہ تیری تمنّا کی توفیق ہے
مری جمع بھی رشکِ تفریق ہے
محبت کے وعدے کی توثیق ہے
خدا جانے کیا وجہ تعویق ہے
کچھ اس کے علاوہ بھی توفیق ہے؛
بالاجماع کافر ہی، زندق ہے
مرا کفر ایساں کی تصدیق ہے
جسے عیشِ دنیا کی توفیق ہے
عجب کشمکش ہی، عجب ضیق ہے

حقیقت میں آزاد! اُس کی جفا

ہماری وفا کی اتالیق ہے

حکیم آزاد و انصاری

بلنسیہ

بلنسیہ جسے آج کل آپ نقشہ یورپ پر ویلنٹیا کے نام سے مرقوم دیکھیں گے سپین کا مشہور شہر ہے اور اُس کے دارالحکومت میڈرڈ سے جسے مسلمانوں کے عہد حکومت میں مجربط کہتے تھے ۱۹۰ میل پر جنوب مشرق میں آباد ہے۔ وادی الکبیر کہ سپین کا مشہور دریا ہے اس کے شمال میں موجیں مارتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے۔ دریا کا منظر نہایت سہاؤنا ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درخت جھوم لے ہیں، اور دریا کانسیگوں پانی اُن کے درمیان سے گزرتا ہے جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے اپنی فیاضی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے اپنے حسین و لطیف مناظر اسی جگہ کے لئے خاص کر دیئے ہیں۔ شہر کے باہر کی عمارتیں خوشنما اور منظر دلکش ہے، مگر اندر کے مکانات بہت بلند واقع ہونے کے سبب آنکھوں کو کچھ اتنے بجلے معلوم نہیں ہوتے جب ان کا سایہ بازاروں پر پڑتا ہے تو طبیعت میں خشکی اور افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔ بازار کچھ اتنے فزخ نہیں ہیں اور رکس تو دور دروز تک پیچ و خم کھائے ہوئے نظر آتی ہیں، صنعت کو ہے شیشے اور ریشم سے ہمکنار ہے اور تجارت ریشم شراب انگور اور زعفران سے لطف اندوز + اک زمانہ تھا کہ بلنسیہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش گاہ تھا، سوداگر کیڑوں کو دور دراز ممالک میں لے جاتے تھے، یہاں ایک خاص قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا جو نیچ بلنسی کے نام سے مشہور تھا، شمالی افریقہ میں اس کی بہت مانگ تھی + نارنگیاں یہاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اگر اس کو نارنگیوں کا شہر کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ بلنسیہ کو اپنی قدامت پر ناز ہے، ایک زمانہ میں پومپی نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر کچھ عرصہ کے بعد از سر نو تعمیر ہو کر آباد ہوا۔ جب مسلمانوں نے ۱۳۱۸ء میں اس کو فتح کیا تو اُس وقت کا تھ قوم برسر حکومت تھی ۱۵۹۴ء میں عیسائیوں نے اس پر حملہ کیا اور یہ مسلمانوں کے مستحکم ہاتھوں، سے نکل گیا، بلنشین کی فوج نے دوبارہ اس کو باہال کیا مگر ۱۶۳۸ء میں کارپروازان قضا و قدر نے ہمیشہ کے لئے اس شہر کی مگرانی پینی عیسائیوں کی قسمت زیریں میں لکھ دی۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں بلنسیہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کا دارالحکومت شہر بلنسیہ نہایت آباد پر رونق اور فضل و کمال کا مرکز تھا تاریخ جغرافیہ اور ادب کی کتابوں کے ہزاروں صفحے بلنسیہ کے باغات اور عمارات، یہاں کے علماء فضلہ اور شعرا کے تذکروں سے معمور ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی شہر کا بیرونی حصہ نہایت پُر فضا اور آباد تھا، سلطہ سمندر سے آفتاب

کی شاعری منعکس ہو کر اس حصے کو روشن رکھتی تھیں مگر اندرونی حصہ صفائی کے نہ ہونے سے متعفن اور رنگ و تازگی نہ تھا۔ پتوں اور پھولوں کے لشکروں کے لشکر موجود رہتے تھے، چنانچہ غرناطہ کا ایک مشہور شاعر ابو جعفر بن سعد کہتا ہے۔

ہی الفردوس فی الدنیا جالاً لساکنہا مکانہا البعوض

یعنی جمال و لطافت کے لحاظ سے تو بلندیہ اپنے ساکنوں کے لئے بہشت ہے مگر اس میں پھولوں کی

مصیبت ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔ کہ

رقص البواغیث فیہا علی غناء البعوض

یعنی پھر تو اس میں گیت گاتے ہیں اور سپورقص کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں بلندیہ کے باغات کی یہ کثرت تھی کہ ہر طرف سبزہ زار لہلہاتے اور چشمے و فصلان نظر آتے تھے

رصاصہ اور مدینۃ المنصور دو مشہور سمنے تھے، ان میں نہریں بہتی تھیں اور نہریں پل بستہ تھیں۔ جہاں تک نگاہ

کام کرتی تھی یا تو زعفران کے زریں کھیت دعوتِ نظارہ دیتے تھے یا نارنگیوں کے ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ

کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ ایک مورخ لکھتا ہے: بلندیہ رصاصہ اور پل کے اعتبار سے رونق اور لطافت میں بغداد

کے ساتھ ہم سہی کرتا ہے، سبزہ زاروں اور باغوں چشموں کی کثرت کے باعث بلندیہ کو مطیب الاندلس، یعنی

سیرگاہ سپین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلندیہ کے دلربا مناظر کی تصویر اکثر شعرائے اندلس نے اپنے اشعار میں نہا

حسن و خوبی سے کھینچی ہے۔ مگر جو عربی زبان کے مذاق اور علم سے محروم ہیں لاریب کہ انہیں ان مدجہد اشعار

کی آب و تاب اور لطافت سے بھی محروم ہی رہنا پڑے گا، چنانچہ ان کے نفس مضمون ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے

ابن زقاق لکھتا ہے الفصاف کی پوچھو تو بلندیہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے تمام شہروں سے گونے بہت

لے گیا ہے، میرے اس دعوے کی دلیل خود بلندیہ ہے جس کا جمال آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے، خدا نے سن

نے اُسے حسن کا خلعت بخشا ہے جو دریا اور سمندر کے نقش و نگار سے مزین ہے! بلندیہ کے تاجدار، مردان نے

کہا ہے بلندیہ وہ نوجوان معشوق ہے جو سندس سبز کلباس زیب تن کئے ہوئے ہے، اگر تم اُس کے قریب جاؤ

تو وہ اپنے آپ کو پھولوں اور شگوفوں میں چھپالے گا۔

بلندیہ کو کبھی کبھی قحط سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا اور سروی عیسائی آئے دن اُس پرورش کرتے تھے۔

ابو الحسن بن حریق اس بات کا اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: یہ بات مشرق و مغرب میں سلم ہے کہ بلنسیہ ہر قسم کے حسن کا مرکز ہے اگر کوئی کہے کہ اس میں قحط کی آفت برپا ہوتی ہے اور تلواروں اور نیزوں کا مینہ برتا ہے تو اس کو کہہ دو کہ بلنسیہ ہے تو بہشت، مگر قحط اور جنگ کی دو مصیبتوں کی اوٹ میں!

علم و فضل کے اعتبار سے سرزمین بلنسیہ بہت بلند مرتبہ ہے، مادری گیتی نے اس مروجہ خیر خطے میں ایسے ایسے علما اور شعرا کو جنم دیا کہ جن کے نام آسمانِ ادب و شہرت پر رہتی دنیا تک چاند سورج بن کر چمکتے رہیں گے اگر شاعروں کی فہرست تیار کی جائے تو یہاں کے مندرجہ ذیل شعرا نمایاں طور پر داد کے مستحق ٹھہریں گے:-

ابو العباس بن امیہ، ابن محذر، ابن حجاج، ابو جعفر بن عبد الوالی، ابو الحکم ابن غماز، ابن جبیر، ابن عبدون، علی بن احمد، ابن سعد الخیر، رصافی وغیرہم۔

محدثین کے اسمائے گرامی بلنسیہ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:- ابو المظرف بن

عمیرہ، ابو احمد جعفر الخزاعی، ابو عبد اللہ بن بعیش، ابن ہاجر اور ابن ہذیل وغیرہم۔
بلنسیہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ایک صوبے کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس میں بہت سے قصبے اور قریے آباد تھے، جن میں سے مشہور قصبہ شاطبہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ قرات اور حدیث کی درس گاہ تھا، اور منظر کی لطافت و خوبی کے لحاظ سے بھی بے نظیر تھا، یہاں کا کاغذ تمام اندلس میں مشہور تھا اور دور دور تک جاتا تھا، ۶۴۵ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچھلے ہوئے صوبوں کی فہرست میں اس کے نام کا بھی اندراج ہو گیا! اندہ جس کے پہاڑوں میں لوہے کی کانیں ہیں بلنسیہ کے مضافات میں شامل تھا، یہی وہ سرزمینِ پاک ہے جس کو ابو جعفر احمد بن حسن القضاعی جیسے بلند پایہ محدث کی زاد بوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ابو جعفر کو حدیث کے علاوہ ادب اور فنِ طب میں بھی کمال حاصل تھا اور وہ ایک عرصہ تک غرناطہ کے گورنر عثمان بن عبد المؤمن کے سرکشی بھی رہے تھے۔

یہ بھولے بسرے بلنسیہ کی محلِ سی تاریخ اور مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کی داتان کا ایک پارنیہ اور

پُر درد ورق!

امین

برسات

کیا کیا نہ دعائیں کرتی تھی مخلوق خدا برکھارت کی
 اللہ کہاں سے آنکلی یہ سرد ہوا برکھارت کی
 دکھلا گئی کیا کیا دم بھر میں گھنگھور گھٹا برکھارت کی
 چشے ہر سمت ابلنے لگے جن سے ہر فضا برکھارت کی
 ہے ارض و سما پر کیفیت، کیا جلوہ نما برکھارت کی
 ہر چیز بنی فردوس نظر، برسی جو گھٹا برکھارت کی
 ہے روپ انوپ جدھر دیکھتا شیر ہو کیا برکھارت کی
 گھر سے تو نکل جنگل کو تو چل، لذت تو اٹھا برکھارت کی
 کیا جھولتے ہیں کیا گاتے ہیں، کر کے ثنا برکھارت کی
 کیا کیف فرا و ہوش رہا، ہے سوچ ہوا برکھارت کی
 ہر سوچھی راگنی گاتا ہے ہر صبح و سہا برکھارت کی
 اللہ یہ کیفیت کتنی، ہے ہوش رہا برکھارت کی
 کیا میٹھے سُردوں میں رہ رہ کر گاتی ہی ہوا برکھارت کی
 کس کس کو نہ جوش میں لائے گی ستارہ ادا برکھارت کی
 کس درجہ معطر رہتی ہے ہر وقت ہوا برکھارت کی
 بگلوں کی قطار ایسی اُجلی، کالی یہ گھٹا برکھارت کی
 خورشید نے کیسی اوڑھی ہے خوش رنگ و ابرکھارت کی

کل تک میسا کھ کی گرمی تھی آج آئی ہوا برکھارت کی
 اللہ کیا پاک یہ بادل گھر گھر کے کدھر سے آئے ہیں
 بجلی کی کرٹک بادل کی گرج، زوروں کی جھڑپی اور نیانی
 لو بھر گئے پل میں سب جل تھل، لوندی نالے چلنے لگے
 کیسی ہے زمیں پر پہر پل، ہیں چرخ پہ کیا پائے بادل
 کیا وادی کیا صحرا کیا بن، کیا کوہ کا دامن کیا گلشن
 دھرتی کو ملا ہے لباس نیا، آتا ہے نظر آکاس نیا
 کیا پیڑ ہیں، کیسی بلیں ہیں، کیا پھول ہیں کیا سبز
 اشجار ہیں کیا جھومے ہیں بڑے کس لطف میں ہیں سب چھوٹے بڑے
 کیا پیاری کوکے کوئل کی، کیا راگ چھڑا ہے بھونرے کا
 بھنگراج کہیں، دراج کہیں، چندول کہیں، طاؤس کہیں
 کیا نلج رہی ہے ہر تلی، کیا جھوم رہی ہے ہر ڈالی
 چشموں کی صدا اللہ اللہ جھرنوں کی نوا اللہ اللہ
 مصروفِ تہنم ہیں کلیاں، مشغولِ ترنم ہیں چٹریاں
 نسرین سمن جوہی چمپا، بیلا کیوڑا ہر سو ہے کھلا
 دیکھو تو ذرا اے اہل نظر کیا ہی سماں یہ گردوں پر
 رنگین گھٹا کی چاور پر کیسے ہیں شفق کے گل بوٹے

پھر جھوم کے بادل آئے ہیں، پھر دھار لگی ہر مینہ کی نجیب
 ہاں بہرِ خدا پھر نظمِ ذرا تو اپنی سنا برکھارت کی

میر سعادت حسین

نجیب

ساڑھی اور سوٹ

کچھ عرصہ ہوا کہ شملہ کی کسی سڑک پر ایک خالی ساڑھی خراں تھی، یعنی ساڑھی تھی پر ساڑھی کے اندر کچھ نہ تھا یا کم از کم معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر والی گھر میں ہے اور ساڑھی ہوا خوری کے لئے تن تننا خود ہی نکل پڑی ہے۔ خدا جانے ساڑھی اور ساڑھی پوش میں تو ٹوئیں میں تک نوٹ پینچی تھی اور ساڑھی تنگ آکر نکل پڑی تھی یا بچاری پہننے والی کو گھر کے کام کاج سے فرصت نہ تھی اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں نورم تھی ہوں یہ بچاری کیوں یونہی مڑے بٹے، بہر حال کچھ بھی وجہ ہو چند آنکھوں والوں نے دیکھا کہ ساڑھی موجود ہے اور ساڑھی پوش غائب۔ ان میں سے ایک حضرت نے جرات کر کے قدم بڑھایا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر کہ کوئی ٹاک میں تو نہیں یہ صاحب ساڑھی کے پاس جانکے اور ٹوپی اٹھا کر قدم ساتھ ملائے کوٹھے کہ کسی غیبی طاقت نے ان حضرت کو سوٹ سے غائب کر دیا اور ان کا خالی سوٹ اس ساڑھی کے ساتھ مگرشت کرنے لگا۔ اسی غیبی طاقت نے صاحب موصوف کو سوٹ اور ساڑھی کی گفتگو سمجھنے کی لیاقت تو عے دی اور یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ساڑھی اور سوٹ کے عقب میں چلتے رہیں مگر اور ہر قسم کی طاقت اُن سے لے لی۔ جو مکالمہ ان حضرت نے ساڑھی اور سوٹ کا سنا اُسے آپ یوں بیان کرتے ہیں۔

سوٹ۔ معاف کیجئے، مگر جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سیر کا لطف اٹھاؤں انکار نہ کیجئے!
ساڑھی۔ آپ ساتھ ساتھ تو چل ہی پڑے مگر میں سوچتی ہوں کہ میرا آپ کا کیا ساتھ؟
سوٹ۔ کیوں؟

ساڑھی۔ جناب یہ بند کسی غریب ہندوستانی جلا ہے کی دستکاری کا سیدھا سادھا نمونہ اور وہ بھی ایسا جسے جیسی کہ وہ ہر بھولے پن سے لپٹ جانے کی عادت، اور آپ ماشا اللہ مغربی چستی و چالاک کی کا بہترین اشتہار۔ پلیس تو اکڑ کر اور تڑھوں تو وہ بھی شکستے ہیں۔

سوٹ۔ بنانے میں تو آپ مشاق معلوم ہوتی ہیں۔

ساڑھی۔ واللہ بنا رہی تھی۔ کیا جو کتنی ہوں وہ غلط ہے؟ مجھ غریب کا تو دامن آج تک جیب سے

آلودہ نہیں ہوا اور آپ ہیں کہ اوپر جیب نیچے جیب، اندر جیب، باہر جیب -

سوٹ (ہنسر) خالی جیب سے جیب نہ ہونا اچھا ہے -

ساڑھی (اندازِ دلربائی سے) جی ہاں، جیب خالی اور اس پر اکڑ بازی -

سوٹ - جناب یہ آپ کے انچل کا ذرا سا کھسکا سب کس بل نکال دیتا ہے -

ساڑھی - اوہو، آپ تو شاعر مزاج معلوم ہوتے ہیں -

سوٹ - ہوں تو نہیں مگر بننا پڑتا ہے -

ساڑھی - اچھا آپ زبردستی شاعر نہ بنے اور کچھ آپ ہیتی کئے - جھوٹ چاہے کتنا دلفریب ہو سچ کے سامنے بچ ہے -

سوٹ - تعمیل ارشاد میں عذر نہیں مگر بہتر تو یہی ہے کہ آپ ہیتی نہ کموں -

ساڑھی - جی نہیں، ہم تو ضرور سنیں گے -

سوٹ - اچھا تو سنتے - میں جب سے اس ملک میں آیا ہوں دراصل جلا بھنا رہتا ہوں - میرے وطن میں

بہت ہی میری ذلت ہوتی تو بھی یہ خوشی ضرور ہوتی رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں ٹھٹھا

گاہے ماہے قمقموں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی - چل پہل میں وقت گذرتا

مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے - یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو، اعتدال سے

کام لو، چلو تو سنبھل کر، بیٹھو تو سمٹ کر، دیکھو تو جھک کر، پاس رہو مگر دور دور میں تو جان بلب ہوں ساچھا

ہو جیسی دن بچھٹ پھٹا کر اس دنیا سے چل دوں -

ساڑھی کیوں؟ میں نہ کہتی تھی کہ میرا آپ کا ساتھ نہیں - آپ کون ہیں یہاں کی تہذیب پر نکتہ چینی کرنے

والے؟ کیا اتنا بھی پتہ نہیں کہ غیر کا کیا مذکور بھائی بہن کو نہیں کہہ سکتا کہ ”بہن تم حسین ہو“ جب نامہ

بدلے گا تو بدلے گا کافی الحال تو پرانی تہذیب رائج ہے اور اس کے مطابق خوبو کو حسین کہنا گناہ ہے اور

اپنے آپ کو برا ثابت کرنا ہے -

سوٹ - یہی تو رونا ہے کہ دکھیں تو بُرے، کہیں تو بُرے اور جو قدرے قلیل آزادی پاہیں تو بُرے آپ

نے مجھ سے میرا حال پوچھا کیوں تھا؟

ساڑھی - خدا جانے کیوں مگر مجھے تو کچھ ہمدردی پیدا نہیں ہوئی - ہمارا پڑانا فلسفہ تو یہ کہتا ہے کہ رنج میں

بھی راحت ہے اگر انسان کا ایمان ٹھیک ہو۔

سوٹ۔ یہ بات مطلقاً سمجھ میں نہیں آئی۔ رنج میں کس طرح راحت ہو سکتی ہے؟
 ساڑھی۔ آپ روحانیت سے بالکل عاری معلوم ہوتے ہیں۔ رنج خدا کی طرف سے ہے اور جب اُس کی
 مرضی سے ہے تو اُسے بخوشی قبول کرنا چاہئے۔ آپ کی خواہشات کے مطابق دنیا کا نظام جب نہیں ہے
 تو بہتر ہے کہ آپ وہ خواہشات ترک کر دیں۔ یہاں اگر فراک اور ساڑھیاں آپ سے ملنے سے کتراتے ہیں
 تو آپ اُن سے ملنے کی خواہش ہی دل سے نکال دیں۔ قسمت کے آگے سر تسلیم خم کریں۔
 سوٹ۔ یہ ہو چکا۔ اگر روحانیت یہی ہے کہ کوشش نہ کی جائے تو این جانب کا روحانیت کو دور ہی سے
 سلام ہے۔ کوشش کر کے آپ سے ملتا تو یہ چند لطف کی باتیں کیسے سننا؟

(۲)

صاحب سوٹ بیان کرتے تھے کہ کسی نکر پر یک لخت ساڑھی خائب ہو گئی اور اُن کا سوٹ پھر ان کے
 گلے کا ہار ہو گیا اور یہ بھی کہتے تھے کہ اُس دن سے وہ اپنے سوٹ کے سامنے سخت جھل رہتے ہیں کہ
 اس پر دیسی کی زندگی عبث حرام کی۔ جب ان کی طبیعت ذرا زیادہ گداز ہوا کرتی ہے تو فرمایا کرتے ہیں کہ اس
 ملک میں انسان تو کیا اچھا کپڑا بھی اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔

اس امر کی بہت کوشش کی گئی کہ پتہ چلایا جائے کہ کیا ساڑھی پوش سے اس ملاقات کا ذکر کیا یا
 تمام واقعہ کو کھا گئی مگر اڑتی اڑتی بھی کوئی خبر نہ سنی۔ البتہ اس واقعہ سے ایک دو مہینے بعد کسی خاتون
 کی تحریر ایک رسالے میں شائع ہوئی اور اس تحریر سے شاید عقدہ کشائی ہو سکے۔ وہ تحریر حسب ذیل ہے

ساڑھی سے گفتگو

”چڑیل یہ تیرا چڑکنا مجھے کہیں کا نہ رکھے گا! کیا کہا کہ بیوی! یونہی خفا ہوتی ہو! الٹا چڑکو تو الٹ کو ڈانٹے بھلا
 جو میں یونہی خفا ہوتی ہوں تو یہ بتا کہ کل جو میں جوہری کی دوکان پر کھڑی تھی تو تو کیوں اس خٹلمین کے سوٹ کو
 چھو رہی تھی؟ ہو! کی انھکیسیاں! اُن رسی لپاٹن! ہوا کا تو وہاں نام و نشان نہ تھا۔ اچھا ہاں سچ بتاؤ۔ کیا کہا کہ ایک
 دفعہ اپنی ملاقات ہو گئی تھی۔ سوٹ کا مجھ سے اور میرا سوٹ سے رنگ کھلتا تھا۔ اچھا کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ بیوی
 وہ تہ ہونے کے لئے گیا تھا اور مجھے آپ نے رینگنے کے لئے دیا تھا۔ وہ ایک بھلے سے آدمی کی مکان ہے ناٹھنڈی

سڑک پر۔ بس وہیں۔ ہم دونوں تیار تھے لیکن لینے کوئی نہ آیا تو ہم یونی چل قدمی کے لئے ذرا نکل پڑے تھے اسد قسم ایسے مزے کی باتیں کرتا ہے کہ کیا کہتے مگر میں نے اُسے خوب بنایا۔ اب آیا میری سمجھ میں یہ تیرا بنا ٹھنڈا رہنا۔ شرم جیا گھول کر پئی گئی ہو کیا کہا؟ کیا کروں کہ رنگ ہی شخ ہے تیرا تو داغ چل گیا ہے مگر بندی اس آزادی کی حامی نہیں۔ کیا کہا کہ تم نے اسے بہت سمجھایا؟ بچا رارو دیا تو رحم آیا؟ جی نہیں ایسے رحم کو تم پہننے دو۔ لوگ کچھ کا کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری زبان بند بھی ہوگی یا یونہی قہقہی کی طرح چلتی جائے گی؟ کیا کہا کہ ہنسنا بولنا کیسے بند ہو؟ ہے نا تو آفت! اب جو کچھ کہوں گی تو رو دو گی۔ کیا کہا کہ بُرا ماننے کی بات نہیں مگر امروا قیہ یہ ہے کہ انسان کپڑے سے ہی بنتا ہے، جی ہاں۔ گویا وہ مہاتما لوگ جو کپڑا انہیں پہنتے انسان ہی نہیں۔ اری ہے تو تو دبیسی گریاں تیری سب فرنگیوں کی سی ہیں۔ کیا کہا کہ میری بلا فرنگن ہو۔ بات یہ ہے کہ سب ساڑھیوں نے حلف اٹھایا ہے کہ ہندوستان کی خاتونوں کو آزاد کر کے چھوڑیں گی، اُف رسی تیرے دعوے! گویا یہ جو ہندوستان میں ترقی کی رو ہے اُس کے محرک سوت، کپاس اور ریشم میں۔ کیا کہا کہ ہاں بیوی سچ تو ہے۔ مرد کجخت ولایت گئے تو وہاں سے ٹوٹا اٹھا لائے مگر ایک صدی سے ہندوستان کی روئی سفر کر کے ملل بن کر آ رہی ہے آخر کچھ تو اس سفر کا اثر ہونا تھا مجھ میں بھی ولایتی تاگا ہے مگر اس کی بدولت نہیں بلکہ نشوونما کا تقاضا ہے کہ ہم آزادی چاہیں۔ دیسی کھیتوں میں امرکین کپاس کا بیج، انگریزی نروں کا پانی، جاپانی کا رخاؤں کی مانگ۔ چھوڑیے وہ اب اپنی پرانی ترنگا تو تو بڑی عالم فاضل نکلی۔ کیا کہا کہ اب سکرادوں۔ کیوں؟ کیا تجھے میرا سکرانا بھاتا ہے؟ اری کیوں لپٹی جا رہی ہے۔ چلوں؟ کہاں؟ باہر۔ دیوانی ہو خواہ مخواہ چل نکلوں۔ کیا کہا کہ اور کئی ساڑھیاں مل جائیں گی۔ اور جوان کے ساتھ مرد ہوئے؟ کیا کہا کہ اگر ہوئے تو کوئی اچھی سی بات ہی کہیں گے کچھ کھانا جائیں گے۔ نہ بابا تو تو بڑی دلیر ہے۔

فلک پیمایا

محبت ایک آتش ہے سردی سے معمور، ایک شیرینی ہے کڑوا مٹ سے بھرپور، اور ایک درد ہے مسرت کا سرمایہ دار؛ یہی وہ جذبہ ہے جو خیالات و احساسات کو دل آنکھیں اور کان تھپتھپا کر تلبہ ہے؛ یہی وہ جذبہ ہے خواہش جس کی خوراک ہے، مسرت جس کی تربیت ہے، حسد جس کا اتنل ہے، مکر و فریب کی چالیں جس کی موت ہیں اور بے توجہی جس کا کفن ہے۔ — لی

تاثرات

دے کر تسلیاں دلِ حسرتِ نشاں کو میں
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے آستان کو میں
مسرور ہوں مٹا کے دلِ سخت جاں کو میں
فانی سمجھ رہا ہوں نشاطِ جہاں کو میں
دے کر فریب تیری نوازش کا رات دن
تسکین دے رہا ہوں دلِ نیم جاں کو میں
گردش نے جس کی خونِ تمتا بہا دیا
ہمدرد جانتا تھا اسی آسماں کو میں
شکوہ ترے ستم کا نہ ہو گا بیاں کبھی
روکے رہوں گا حشر میں اپنی زباں کو میں
بجلی کو ضد ہوئی ہے کہ گلشن کو ٹھونکا دے
لے جاؤں یا آکھی کہاں آشیاں کو میں
تم چھپ گئے ہوئے کے مجھے دعوتِ تلاش
اب ڈھونڈتا پھروں گا تمہارے نشاں کو میں
کب تک سناؤں آپ کو رودادِ بے کسی
سوار کہہ چکا ہوں اسی آستان کو میں
رفت پسندیاں ہیں میسر ہی نگاہ کی
کعبہ سمجھ رہا ہوں ترے آستان کو میں

جلوہ ہے ہر گلی میں کسی کے جمال کا

جنت سمجھ رہا ہوں ظفرِ گلستاں کو میں

نذیر احمد ظفر

تاریخی جامعات

علمی مدارس کا رواج حقیقت میں زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ مغربی عمران کے فلورسے پہلے کلدانیوں اور مصریوں نے مدارس علمیہ کی تشیید کی تھی۔ ان کے مدرسوں میں طب و حکمت، اور فلکیات کی بہترین تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر سب سے پہلے یونانیوں نے اُن کے نقش قدم کی پیروی کی۔ اور یونان کی تبعیت میں رومن قوم نے بھی مدارس کا افتتاح کیا لیکن رومن قوم کی اس ترقی اور اٹھان سے پہلے بطالس نے (اسکندر مقدونی کی اجازت پر) اسکندریہ میں ایک مدرسے اور کتب خانے کی بنیاد ڈالی تھی۔ جو ٹھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے تمام مدارس و مکاتب پر فوقیت لے گیا۔ اسکندریہ کا یہ مدرسہ تقریباً سات صدیوں تک اعلیٰ پیمانے پر چلتا رہا۔

ابتداء میں پیروان مسیح نے زمانی علوم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس زمانے میں اُن کی تمام تر مہمت و توجہ کا اصلی مرکز دینی علوم تھے۔ اس میدان میں فارس اور عرب مسیحیوں سے بہت آگے ہیں، نو شیروان عادل نے شہ ۳۷۰ء میں جندیساپور میں طب و حکمت کا اعلیٰ پیمانے پر ایک مدرسہ کھولا تھا جو عباسیوں کے زمانہ حکومت تک قائم رہا۔ چنانچہ خلیفہ منصور عباسی نے اُسی نقش پر بغداد میں ایک نئے دارالعلوم کا افتتاح کیا۔ لیکن ہارون رشید جب سریر آرائے خلافت ہوا تو علوم و فنون کی گرم بازاری بہت بڑھ گئی، حتیٰ کہ ہر جامع مسجد کے پہلو میں ایک پرائمری اسکول قائم تھا۔ مامون کے زمانہ میں باپ کی علمی یادگاریں اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمکیں۔ دمشق و بغداد، بصرہ و بخارا، اسکندریہ و قاہرہ، مراکش و فارس اور اندلس وغیرہ میں مدارس علمیہ کا رواج بڑی دھوم سے پھیلا۔ سن ۱۱۷۰ء میں صرف قاہرہ کے اندر ۲۰ بڑے بڑے مدارس تھے۔ قریب میں ۱۰ عظیم الشان کتب خانے بہترین بلوراجاب کتابوں سے مملو موجود تھے۔ اندلس کے ہر پرگنہ میں چھوٹے چھوٹے مدارس کے علاوہ ایک بڑا مدرسہ بھی تھا۔ سن ۱۱۷۰ء میں خود قرطبہ کے اندر ۱۵۰ مدرسے، ۵۲ پڑگال میں ۲۵، مرسیہ میں ۱۷ علمی انجمنیں تھیں، اشبیلیہ، غرناطہ اور بلنسیہ کی علمی انجمنوں کی تعداد مزید برآں تھی۔ علامہ مقری کا بیان ہے کہ اہل اندلس علم کے بڑے حریص تھے۔

خود علم اور علمی کتابوں کے ساتھ خلیفہ المستنصر کی عنایتوں کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنی طرف سے علمی

کتابوں کی خریداری کے لئے مصر و افریقہ فارس و عرب کی طرف مختلف وفود بھیجے، جو ہر قسم کی علمی کتابوں کو خریدتے اور نقل کرتے۔ خلیفہ نے مصنفین و ماہرین سے اُن کی تمام تصنیفات طلب کیں، اور معاوضے میں زر و جوہر سے اُن کے دامن کو مالا مال کیا۔ یہاں تک کہ علمی جواہر ریزوں کا چار کروڑ یا چھ کروڑ کتابوں کی صورت میں ایک انبار لگ گیا۔

ابوالفرج المظلی کی روایت ہے کہ قاضی صاعد بن احمد اندلسی قاضی طلیطلہ المتوفی ۶۲۳ھ نے لکھا ہے کہ: عرب نے صدر اسلام میں زبان اور احکام شریعت کی معرفت کے علاوہ کسی دوسرے علم کی طرف کئی توجہ نہیں کی۔ کہیں کہیں بعض افراد ضرورت کی مجبوریوں سے صرف طبی مشغلہ رکھتے تھے۔ عربوں کی یہ رفتار دولتِ امویہ کے خاتمہ تک قائم رہی لیکن جب ہاشمیہ کا دور آیا اور یہ لوگ ملک کے بادشاہ ہوتے تو سب سے پہلے جس نے علوم کی طرف توجہ کی وہ خلیفہ ثانی ابو جعفر المنصور کی ذاتِ گرامی تھی۔ موصوف کو تبحرِ فقہ کے علاوہ فلسفہ و نجوم کے مسائلِ دقیقہ میں بھی مہارتِ تامرہ حاصل تھی۔ اسی سلسلہ کا ساتواں فرماؤا مامون بن ہارون رشید جب سریرِ آرائے خلافت ہوا تو اُس نے اپنے دادا المنصور کے ناتمام عزائم کو بڑی خوبی سے پورا کیا۔ مامون نے علوم و فنون کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں، وہ تاریخ کے اوراق میں زندہ جاوید رہیں گی۔ مامون نے ملوکِ روم کے پاس بہت سے وفود بھیجے۔ اور اُن کے کتب خانوں کی نادر اور جید فلسفیانہ کتابیں منگوا کر ماہرینِ فن سے اُن کے ترجمے کرائے اور لوگوں کو فلسفہ پڑھنے کی ترغیب دی۔ مامون کو حکما سے بہت زیادہ انس تھا۔ وہ ان کے مذاکرات اور مناظروں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا۔

بغداد میں عباسیوں نے، مصر میں فاطمیوں نے، اندلس میں امویوں نے مامون کے اس مبارک طرز کی عرصہ دراز تک تقلید کی۔ جس کی بدولت مدارسِ عربیہ کے انتشار کا دائرہ مرقند و بخارا سے لے کر فارس و قرطبہ تک پھیل گیا۔ امرا و ملوک ان مدارس پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے تھے۔ مشہور مورخ گبن نے نقل کیا ہے کہ: کسی وزیر نے بغداد میں صرف ایک مدرسہ جامعہ کے انشاء پر ۱۲۰ ہزار گنی خرچ کی تھی اور ۹ ہزار گنی سالانہ کی آمدنی کی جائیداد اُس پر وقف کی تھی۔ یہ فیاض ذات نظام الملک طوسی کی ذات تھی اور وہ مدرسہ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ تھا۔

قاہرہ کے صرف ایک کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی ایک لاکھ سے زیادہ نادر روزگار کتابیں موجود تھیں، اور اُن کے مطالعہ کی ہر شخص کو عام اجازت تھی۔ اس مکتبہ کی صرف فلکی اور طبی کتابوں کا شمار ۶۵۰۰ مجلدات

سے زیادہ تھا۔

مدارس عربیہ اور اُن کی علمی خدمات کے حیرت انگیز کارناموں کی یہ ایک معمولی توصیف ہے۔ اگر موقوفہ ملا تو کسی اگلی صحبت میں انشاء اللہ بسط کے ساتھ ہم پھر عرض کریں گے، لیکن بایں ہمہ تاریخ کی یہ ایک ناقابلِ برداشت حقیقت ہے کہ گیارہویں اور بارہویں صدی سے پہلے خفایق و معارف اور علوم و فنون کا آفتاب عالمِ کتاب مشرق سے مغرب کی طرف مائل ہو گیا۔ اور ایشیاد افریقہ سے ہٹ کر اس کی نورانی شعاعیں سرزمینِ یورپ پر پڑنے لگیں۔ یورپ میں سب سے پہلے علوم و فنون کے مدارس کارولج اٹلی میں شروع ہوئے۔ نویں صدی میں مدرسہ "سالرنو" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور گیارہویں صدی میں یہ مدرسہ طب میں اتنا مشہور ہوا کہ اقطارِ یورپ سے جوق درجوق طلباء آنے لگے۔ دسویں صدی کے اواخر میں مدرسہ "پولونا" کا افتتاح ہوا۔ اور گیارہویں صدی میں اس مدرسے نے قانون میں عام شہرت حاصل کی۔ اور سترہویں صدی میں طب و قانون اور الیات کی اعلیٰ ڈگری دینے لگا۔

پیرس کا مدرسہ ایک زمانے سے قائم ہے لیکن تیرہویں صدی کے اوائل میں جب کہ قانون اور طب، فنونِ الیات وغیرہ کا اس میں باقاعدہ انتظام ہوا۔ ۱۲۵۳ء میں پیرس کے اندر ایک جدید مدرسہ "سارین" کی تشریف آوری ہوئی۔ اور ابھی چودھویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فرانس میں ۴۰ یونیورسٹیاں تیار ہو گئیں۔ "سلا منکا" کا مشہور مدرسہ ۱۲۷۲ء میں قائم ہوا۔ اور مسلسل ۵۰ برس تک اسپین والوں کے لئے باعثِ فخر رہا۔ "آکسفورڈ" کے متعلق صحیح طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب قائم ہوا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ بارہویں صدی کے شروع میں اس کا مکمل افتتاح ہو چکا تھا۔ ۱۲۷۳ء میں "کیمبرج" کا مدرسہ، جامعہ کی حیثیت میں منتقل ہوا۔ ۱۳۷۷ء میں مدرسہ "براگ" اور ۱۳۶۵ء میں مدرسہ "دائنا" کو یونیورسٹی بنا یا گیا۔ پھر مدارس جامعہ کی تاسیس اور تشیّد اس کثرت سے پھیلی کہ سارے یورپ میں عام ہو گئی۔ امریکہ والوں نے بھی اپنے یورپین اسلاف کی پیروی میں بے نظیر بہت اور اتفاق کے ساتھ یونیورسٹیوں کا افتتاح کیا۔ امریکہ میں کتنے ہی جنہوں نے بیسیوں لاکھ گنی یا اس سے بھی زیادہ کی رقمیں مدارس پر وقف کی ہیں۔ امریکہ والوں کی یہ عظیم النظیر قربانی اور ایثار حقیقت میں ساری دنیا کے لئے ایک پیغامِ درس و عمل ہے۔

فاعتبروا یا اولی الا بصار لعلکم تفلحون

بدر اصلاحی

خدا حافظ

اے گل گلستانِ رعنائی جانِ محسوبی و دلآرائی
میرے دم سے ہے سوزِ پروانہ تجھ سے روشن ہے شمعِ زیبائی
میرا جینا بھی کوئی جینا ہے تجھ بن اے نورِ چشمِ بینائی
تجھ بن آرامِ زندگی معلوم اے سرورِ دلِ تمتائی
کیسے گزے گی راتِ فرقت کی کیسے کاٹوں گا روزِ تنہائی
جاں ہی لے کر رہے گی آخر کار دردِ فرقت کی کار فرمائی
مر رہا ہوں میں اس تصور سے ہے مرے دل پہ غم کی عینائی

از جگر دو دمیرو د بصرم

شعلہ ام خشک مغز و سودائی (نظیری)

تجھ کو جانے نہ دوں کہیں ہرگز چاہتا ہے یہ شوقِ سودائی
لیکن اس وقت کی عنان گیری ہے سراسر خلافِ دانائی
کہہ رہا ہوں تجھے خدا حافظ گو نہیں طاقتِ شکیبائی

بِ سفر رفتنت مبارک باد

بِ سلامت رومی و باز آئی (سہی)

شادی کی نوکری ہو

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ مردانی بیٹنگ میں ایک چھوٹی کوٹھڑی اور دو خاصہ کمرہ ہیں۔ نہانے میں ایک چھوٹا سا صحن ہے۔ دو جانبہ الان اور اندر کے رخ تین چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ بیچ میں ایک شاہ نشین سی بنی ہے۔ اوپر ایک چوترا اور اس کے بعد تین درکا دالان۔ دالان کے بعد ایک سہ درہ کمرہ اور بازوؤں میں دو چھوٹے کمرے ہیں۔ دالان میں درسی کافرش ہے وسط میں گاؤ تکیہ اور سوزنی کچی ہے۔ اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کی کمین دوہنیں ہیں۔ بڑی ہن عصمت لا ولد ہیں۔ بیوہ ہو چکی ہیں اپنی چھوٹی بہن رفعت کے پاس رہتی ہیں۔ رفعت کے دو بچے ہیں لڑکی پندرہ سال کی اور لڑکا دس سال کا ہے۔ رفعت کا میاں وکیل ہے کافی آمدنی ہے گھر کا خرچ اجلا ہے۔ شریفانہ زندگی بسر ہوتی ہے۔ موقع موقع سے کچھ پس انداز بھی ہو رہتا ہے۔

رفعت دالان میں بیٹھی کچھ سی رہی ہیں۔ عصمت کسی اور کام میں مشغول ہیں

رفعت۔ اے باجی ذرا ورے آنا۔

عصمت۔ بوا کیا ہے۔ آج فرصت تھی میں نے کہا لاؤ خمیری سمبوسہ ہی تل لوں تمہارے میاں کو پسند چار اور رہ گئے ہیں، ذری ٹھہر جاؤ یہ نکال لوں۔ نہیں تو کڑا ہی جلے گی۔

رفعت۔ اے ہے آپ آپ کو تو جب دیکھو جب بھی تلتا پکاتا۔ وہی شل ہے اٹھ سا سو پیٹ کا دکھ۔ وہ رحمت بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ اے دیکھو نا۔

عصمت۔ لے رحمت تو آبیٹھ تیری بیوی کوئی کام بھی قرار سے کرنے دیتی ہیں؟ دیکھو ذرا سنہری نکالو۔ جلا نہ دیجو۔

عصمت کنگیر چھوڑ بہن کے پاس آ بیٹھیں۔ پٹاری گھسیٹ کے پان بنایا۔

رفعت۔ آپاکل مہر النساء پھر آئیں گی میں کیا جواب دوں گی۔

عصمت۔ جواب کیا۔ ”ہاں“ اس کے لئے بھی کسی نام جھام کی ضرورت ہے۔

رفت۔ اجڑی لو اور سنا۔ آپ نے تو کیسی آسان ”ہاں“ کہہ دی۔

عصمت۔ تو بوا اور کیا کہوں۔ بیٹی کا معاملہ ٹھہرا آخر لڑکے میں کیا فی ہے۔ ٹک ٹک سے بھٹیک۔ نہ سال ددھیال صاف۔ پڑھا لکھا وہ سوا بی اے ٹی اے کیا ہوتا ہے اس میں پڑھتا ہے سوچا س کا نوکر بھی ہو جائے گا اور نہیں کیا چاہئے۔ یہی چودہویں پندرہویں برس شادی کا وقت ہوتا ہے۔

رفت۔ آپا ابھی تو شوکت کی پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اور پھر جب تک لڑکا لکھا تا کماتا نہ ہو کس امید پر لڑکی دے دوں۔ میں تو بیس سے پہلے کبھی بھی میری شوکت کو نہ بیاموں اور وہ بھی جب تک شوکت کی رائے نہ ہو ہاں کیسے کہہ دوں۔

عصمت۔ تو بوا پھر لو چھتی کیوں ہو جو دل میں آئے سو کرو۔ نابوا ہمارے زمانے میں آٹاں باوا نے جس کے چاہا حائے کر دیا۔ جیسا لڑکے سے بھرا بھگتا۔ جب آئی گوریں جاسوئے کسی نے ہوں سنی نہ ہاں۔ یہ سوئے فرنگیوں کے طور طریق انہیں کو مبارک رہیں۔ بھلا غضب تو دیکھو شوکت سولہویں برس میں سوئے لونڈوں کی طرح مدرسوں میں پڑھنے جلے نہ ڈولی نہ گاڑی۔ اچھی بڑی نظریں پڑیں۔ بیٹی ذات ٹھہری۔ ادا تاں باوا کی عزت رکھے۔ نابوا مجھے تو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

رفت۔ آپا بے شک الدین اولاد کے لئے اچھا ہی کرتے ہیں لیکن انہیں اولاد کے خیالات کا احساس کیسے ہو۔ اب آپ ہی بتائیے میرے دل میں اس وقت کیا ہے۔ آپ اپنی ہی کہئے آکا دودھ لہاے آپ خوش فقیں۔ ایک نہیں دو دو سو کنوں کا جلا پارا دن کی دانتا کل کل آپ دن کتیں تو وہ رات۔ آپ نے اپنے کو تمام کر لیا مگر انہیں کبھی پروا بھی نہ ہوئی۔ کیوں کیا ابا جان کو اُن کے اطوار معلوم نہ تھے بچپن سے دیکھا تھا۔ مگر وہی کوتاہ نظری۔ خاندان سے باہر نگاہ ہی نہ کی۔ بیسیوں پیام آئے مگر نہ بجھے اناں جان نے کسی کو کشیر کا جلا ہا ٹھہرایا کسی کو دودھ لکھا کسی کی دوھیال میں فی نکالی۔ کسی کی نہال میں کیرے ڈالے ایک نہ پسند آیا۔

عصمت۔ نابوا۔ میرے سوئے اناں باوا کو کیوں پتی ہو قسمت میں جیسا لکھا تھا مل گیا۔ تم ہی کوشمٹوں کے لئے آخر تمہیں بھی تو مانگا تھا۔ وہ بھی تو ان کا بھانجا ہی تھا۔ پھر تمہیں کیوں نہ دے دیا۔

رفت۔ تو مجھے جھونکنے میں کسری کیا تھی۔ ادا بجھے نانا جان نہ اڑتے نہ ان سے میری شادی ہوتی ایک نواسی کا حشر تو دیکھ چکے تھے دوسری کی چھاتی پر کیوں مونگ دلواتے۔ دیکھ لو شملوں کیا کر رہا ہے ایک پر ایک سو کن لا رہا ہے باپ کی اس گائے پسینے کی کمانی یوں خاک میں ملا رہا ہے۔ باجی یہ سب جہالت کی باتیں ہیں قسمت کے

کھے کو تو کون سیٹ سکتا ہے۔ مگر اس نے جب آنکھیں دی ہیں تو اندھے کیوں ہو جائیں عصمت۔ ہاں بوا سچ ہے۔ چودھویں صدی ہے۔ لڑکی کو کوٹھ سے لگائے بیٹھی رہو۔ تم ہی نے تو اس لڑکی کو غارت کیا ہے۔ موٹی پھل پائیاں میموں جیسا لنگا پھر کاتی پھرے۔ بوا چاہے برا مانو یا بھلا میں تو خدا لگتی کہوں گی۔ نوج کنبہ کی لڑکیاں ایسی ہوائی دیدہ ہوں۔ نہ ستینا نہ پروانا نہ چکانا نہ ریندھنا۔ جب دیکھو جب لگوڑی پرچیاں۔ یہ فلانی نس کی ہے یہ ڈھکی میم کی ہے۔ بس یہی کسر رہ گئی بیٹی سے میاں بھی پسند کرالو دکانوں پہ ہاتھ رکھ کر انا بوا۔ اسد بچائے بڑا زانہ ہے۔

رفعت۔ آپا آپ سچ کنتی ہیں۔ اگلے زمانے میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ اس زمانے میں نہ کوئی شرم کم پوچھتا ہے نہ گھر داری کو۔ جہاں دیکھو تعلیم پوچھی جاتی ہے، جس لڑکے کو دیکھیے انگریزی تہذیب کا دلدادہ، انگریزی رہائش کا شیدا۔ اگر لڑکی اس جیسی نہ ہوئی تو دونوں کی جان ضیق میں اور اماں باوا کے گلے میں جرتیوں کا ہار۔ تو باجی اپنے کو جنجال میں کون ڈالے۔ اولاد جانے اور اس کا کام۔ ہاں اچھا بڑا ہم بھی بتا دیں گے۔ عصمت۔ بس بوا تو پھر تم پہ کاہے کا بوجھ ہے۔ لڑکی خود جواب دے لے گی۔ رفعت۔ تو بہ آپا تو ناراض ہوتی ہیں۔

عصمت۔ ناراض نہ ہوں تو کیا کروں۔ لڑکی کو تم نے ہوا بنا دیا بوا بیٹی نہ ہوئی اتالیق ہوئی۔ رفعت۔ آپا اتالیق کی کیا بات ہے لڑکی سے پوچھنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں تو کل مہر الفنا سے کہہ دوں گی لڑکا پڑھ لکھ لے کام سے لگے پھر دیکھا جائے گا۔ ایسی جلدی ہی کیا ہے۔

سردار محمد معظم خاں

تھوڑے پر قناعت کرنا بہت بڑی دانائی ہے۔

نیکی کی محبت خوشی پیدا کرتی ہے۔

محبت کا ہاتھ افلاس کو شکست دیتا ہے۔

کابل کو اپنا نفس باہر گراں اور زندگی وہاں جاں معلوم ہوتی ہے

ارشاد بدایونی

بھابی کے نام خط

اے بی بھابی سلام

کسوگی تو سہی کہ اندر سی سعیدہ کتنی جھوٹی ہے۔ مگر بھئی بھابی دیدوں گھٹنوں کی قسم جو مجھے گلوڑی کو دم لینے کی بھی مسلت ملی ہو۔ یوں تو مجھے گھر پہنچے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہو گئے مگر ادھر تو گلوڑے گھر کے دھندے اور ادھر ماما بی کم بخت ہر کہ بس اگر خبر نہ رکھوں تو کھانا دیکھتے ہی بجائے بھوک لگنے کے بھاگ جائے۔ مصالحو کی ہر اند گوشت کی بسا ند کے مائے تلی ہونے لگتی ہے۔ یہ گلوڑی دیہات کی عورتیں مہارمی دہلی کے کھائے کیا جانیں۔ یہ تو خیر پچاری غریب عورت ہے جو سونے سے پٹی ہوئی پڑی ہیں ان کو بھی دیکھو تو بے اختیار منہسی آتی ہے۔ روپیہ ہو جانے دو مو گلوڑا پرین کمال چلیکا کل یہاں کے تحصیلدار کی بیوی ملنے آئی تھیں کوئی سپاس برس کی عورت، سرسبز کڑے بال، سانولا رنگ، موٹا نقشہ ہوا سے سارے منہ پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سبز مخمل کا سرسبز پاجامہ جس کی مہربوں پر لچکا ٹنکا، اودھنمل کا کرتا نھی جان توئی لچکا لگا، سبز چمپا نے رنگ کا بنا رسی دوپٹہ، زیور میں گوندنی کی طرح لدی پاؤں میں پازیب رم جھول چوراسی بل لچھے الم علم پھنے، ماتھے میں آرسی جس میں بار بار اپنا منہ دیکھتی تھیں۔ غرض کہ عورت کیا تھی خاصا ہولی کا سوانا تھی۔ بے خبر بے اطلاع آدمکیں۔ میں غل کر رہی تھی۔ سبنتی نے جا کر کہا، جلدی جلدی نین لٹے ڈال باہر نکلی۔ یہ سبنت کڈانی دیکھ کر منہسی بہت آئی مگر ضبط کیا۔ افروز جانا جیسی خسر ہے تم کو معلوم ہے۔ وہ باتیں کر رہی تھیں یہ پیچھے گلوڑی نقیلیں اتار رہی تھی میری مائے منہسی کے بُری حالت تھی۔ اے ہے بھابی ان دیہات والیوں کی شکل پر روڑھا پن کیسا برستا ہے۔ خدا کسی دلی دے کو تو دیہات میں لائے نہیں۔ بات کرو تو مزہ انہیں، گلوڑی سخت زبان، میرا نودم لٹتا ہے، آٹھ دن میں دل گھبرا گیا۔ سچ کہوں تمہارا نندوئی کی تکلیف کا خیال نہ ہو تو ایک دن بھی نہ ٹھہروں۔ سنے میں لدی پڑی ہیں محروم نہ نہیں۔ ایلو میں تم کو ایک دعوت کا حال سناؤں۔ پیر کے دن یہاں ایک بڑے زمیندار میں، گاؤں گراؤں کوٹھی باغ سب کچھ، باہر کا کارخانہ بہت بڑا، میں سمجھی ان کی بیوی سے مل کر ضرور جی ہل جائے گا۔ خیر بھابی میں جو پہنچی تو دیکھا کہ آنگن بہت بڑا، پختہ، مگر نارنگی امرد کے چھلکے جاکا کوٹے کے ڈھیر، حوض سنگ مرمر کا کیسا خوبصورت بنا ہوا مگر اس میں بھی ٹوٹے ٹھیکرے، ماش کی دال سے چھلکے نوکریں تین چار اتر وائے آئی تھیں۔ میلے چکٹ کپڑے جھنڈے بال۔ میرے کپڑے دیکھ کر لگیں چرغم چرغم کرنے میں اس حیرت میں تھی کہ یہ تماشا کیا ہے۔ آگے بڑھی چوتھے پر ایک بان کی چارپائی پر ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی بیٹھی ہوئی۔ ایک ماما اُس کی جوئیں دیکھ رہی تھی۔ لڑکی کے کپڑے ریشم کے تھے اور گونا گونا ری لگا تھا مگر سیلے چکٹ۔

معلوم ہوا یہ سردار صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ میں یہ تماشا دیکھتی چلی جا رہی تھی کہ دو تین لونڈیاں دھڑ دھڑ گھبتی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی آئیں کہ بی بی جی بی بی آتی ہیں۔ ہوا میں ان کی شعل حیران ہو کر دیکھنے لگی بے خیالی میں منہ اوپر اٹھائے جا رہی تھی نگوڑے کیلے کے چھلکے پر پاؤں پھسلا، اونڈھے منہ کرنے سے بچی، ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پانی تھی کہ ایک بیوی سیاہ فام، بھدی سی آکر نہ سلام نہ دعا گلے سے پست لگیں۔ میں ہکا بکا کہ یہ تماشا کیا ہے۔ خیر جب وہ الگ ہوئیں تو معلوم ہوا سردار صاحب کی بیوی یہی ہیں کہنے لگیں بو بو اندر چلو۔ ان کے اس فقرے پر ایسی ہنسی آئی کہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ہنسنے ہوئے دوپٹے پر جو نظر پڑی تو نگوڑا باربرلیٹ کا دوپٹہ جس پر اسد بخشتہ دو خوش قدم کے ہاتھ کی لیکری اور کٹاؤ بنا ہوا تھا غارت ہو کر رہ گیا۔ چکنے ہاتھ کا پورا بچنے کا نشان دوپٹے پر ہو گیا۔ صدر دالان میں پہنچی۔ چوکوں پر قیمتی دالان کا فرش مگر منوں گرد۔ قیمتی اشیاء جو طاقچوں میں سچی تھیں وہ بھی خاک آلود سب کھانے کا حال بھی سنو۔ سینی رابستنی خان پوش، دولونڈیاں طشتوں میں کھانا لے کر آئیں۔ پیچھے سے ایک روٹیوں کی تھنی لے کر آئی۔ کھانے تو بہت تھے مگر نگوڑے سرائے بساندے، گوشت کچر کچر کرنا۔ بشکل تھوڑا بہت کھایا۔ اور تو خیر سب کچھ کھا کر شامی کبابوں پر ورق دیکھ کر منہ ضبط نہ ہو سکی۔ کھانا شروع کرنے سے ذری دیر پہلے ایک بیوی نے آکر پاؤں کچر لئے۔ میں نے سردار صاحب کی بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا، کہنے لگیں یہ بہو ہیں، ہمارے ہاں بہوئیں پاؤں چھوتی ہیں۔ ان کا بھی طلیہ سنو۔ بشکل تو خیر خاصی تھی مگر دیابت کا روڑھا پن کہاں جائے۔ بچہ کوئی چار برس کا گودیس، ٹانگوں سے ننگا سر پر گوڑے کی ٹوپی، ہاتھ میں گاجر کا ٹکڑا۔ کھانا شروع ہوا لڑکا بہت بے باکی سے سب چیزیں بہت بہت لے کر کھارہا تھا، شب دیگ کا پیالہ اٹھانے کے لئے جو ہاتھ بٹھایا تو پانی کا گلاس جو بھرا رکھا تھا وہ اس سے ٹکرا کر گرا۔ شامنت اعمال سے وہ مجھ نگوڑی کے قریب تھا۔ پانی بہ کر آیا اور جب تک میں اٹھوں اٹھوں غرارے کے پائے سب گیلے ہو گئے۔ اس قدر غصہ آیا کہ بس کیا کموں مگر دادی نے مسکرا کر کہا۔ ننھے ننھے بچے بیٹھو، دیکھو پانی گر گیا۔ لڑکا اس کہنے پر بگڑ گیا اور منہ اونڈھا کر جولت ماری تو تلابی کا پیالہ جراباس کھا تھا اونڈھ گیا۔ بشکل ماں نے خوشامد منت سماجت سے اٹھایا۔ میں تو ایسی گھبرائی کہ کھانا ختم کرتے ہی اجازت مانگی۔ لے ہے بھابی کبھی اماں جان یہاں ہوں اور تم ہو تو تماشا دیکھو۔ لے بھابی افروز کمتی تھی کہ جسے کا خیر سے پیر بھاری ہے اس جھوٹی لپٹان کا تو مجھے یقین نہیں تم لکھو تو یقین آئے۔ ہم تو اس دن کی آس منا ہے ہیں۔ ماموں آبا تو بہت خوش ہو گئے۔ افروز تم کو سلام کہتی ہے۔ یہ خط ذری حمیدہ کو دکھا دینا۔ ذرا مملت ہو تو ان کو بھی خط لکھوں۔ اماں جان کی خیریت لکھنا۔ بوضدا حافظ۔ اب غسل کرنے جاتی ہوں، مائے گرمی کے دم بولا رہا ہے فقط تمہاری سعید ماہر خ

لمعات

حیات و ذوقِ طرب، اے رہینِ بخیری گئی نہ ظلمتِ شب تا ستارہ سحری
 غمِ زمانہ صبرِ آزما مبارک باد کہ رازِ ہمتِ پرواز ہے شکستہ پری
 ہر ایک فزّہ تار ایک ہے حیرمِ جمال حجابِ دید اگر ہو نہ تیری کم نظری
 مگر بطورِ جنوں چاکِ پیر بہن کرے! جنوں اگر چہ نہ دیتا ہو درسِ عالمہ درسی
 نثارِ لاکھ نشا طِ ارم، جو ممکن ہو شرابِ ناب لبِ حُبّ بار و قصِ پری
 مقامِ شکر ہے اے شکوہِ سنجِ نا پرسی کہ ننگِ زخمِ جگر تھا، خیالِ سنجیہ گری
 حدودِ میکدہ ہیں، اکائنتِ لامحدود جہانِ بخودِی و صد جہانِ بے خبری

ذلیل کیوں نہ مستلِ کمال ہو اختر

ہوئی ہے زینتِ بازارِ عینِ بے ہنری

سید علی اختر

خالد اور حیدہ

(عرب کے مشہور شاعر اصمعی کا ایک افسانہ)

محارب اور ظہیر ایک ہی ماں باپ سے دو بھائی تھے، دونوں اپنی جرات اور شجاعت کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور تھے۔ لیکن محارب قبیلے کا سردار تھا اور ظہیر اُس کا وزیر تھا۔ محارب اُس کے مشورے پر چلتا تھا مگر ظہیر بھی اُس کا تابع فرمان تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُن کے درمیان کسی معاملہ پر بحث نکلا رہوئی اور بڑا جگاڑ پیدا ہو گیا ظہیر اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ نہایت مغموم تھا اور نہ جانتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا "لے عربی سرداروں کے سردار اتم اس قدر آزرده خاطر کیوں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے ناراض کیا ہے یا کسی نے تمہاری توہین کی ہے؟ ظہیر نے کہا میں کیا کروں وہ جس نے میرے دل کو زخمی کیا ہے وہ ہے جس پر میں اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جسے میں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا وہ دنیا میں میرا ایک ہی رفیق، میرا بھائی ہے۔ آہ، اگر وہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے بتا دیتا کہ وہ کیسے شخص کا مد مقابل ہوا ہے اور اپنی قوم کے رواسا کے سامنے اس کی مثال کو ایک عبرت بنا کر پیش کرتا۔ اُس کی بیوی نے کہا "اُسے اپنے مال و منال سے لطف اٹھانے دو اور تم یہاں سے چلو" اور ظہیر کو آمادہ کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے شعا کے شرٹھے، جن میں مذکور تھا کہ توہین انسان کو اپنے ماں باپ کی جانب سے بھی قبول نہیں کرنی چاہئے۔

ظہیر نے اپنی بیوی کے مشورہ کو مان لیا۔ اُس نے رخصت کی تیاری کر لی۔ اپنے خیمے لپیٹ لئے اونٹوں پر اسبابِ ملاد، اور قبیلہ سعد کی قیام گاہ کی طرف چل دیا جو اُس کے حلیف تھے۔ مگر اُس کے دل میں اپنے بھائی سے جدا ہونے پر رورہہ کر ایک درد اٹھتا تھا۔ اور اُس نے کہا "اُس سفر میں جو مجھے تجھ سے دُور لے جا رہا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار سال چلتا رہوں گا اور ہر سال مجھے تجھ سے ہزار میل دُور لے جائے گا۔ اگر اب تو مجھ پر ہزار مصر کے برابر بھی احسان کرے اور ہر مصر میں ایک ہزار میل ہوں تو میں انہیں خفارت کے ساتھ ٹھکرادوں گا جب تک میں تجھ سے دور رہوں گا اپنی کم مانگی پر قناعت کروں گا اور جدائی کے دنوں میں اس شعر کو چھوڑوں گا جو تاناک موتیوں کی لڑی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ مجھ کو کسی شخص کی اپنی ہی قوم اور اپنے ہی وطن میں حقیر کی جائے تو

اُس کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ تو جس نے میرے دل کو یوں زخمی کیا ہے بہت جلد رجن و حیم خدا کی قوت کو محسوس کرے گا کیونکہ وہی میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والا اور قائم و دائم ہے۔ آخر ظہیر قبیلہ سعد میں پہنچ گیا اور گھوڑے پر سے نیچے اُتر آیا۔ بنو سعد نے اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کی بیوی جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی، اور ظہیر نے اُس سے کہا کہ اگر خدا نے ہمیں لڑکا دیا تو یہ اُس کی عین عنایت ہے لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا چرچا نہ کرنا اور لوگوں کو اس معاملے میں نہ دینا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے تاکہ میرے بھائی کے لئے وجہ شمت پیدا نہ ہوئے آخر وہ وقت بھی آن پہنچا اور ظہیر کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی انہوں نے اس کا نام جیدہ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ باہر لوگوں میں اُسے جند رکہ کر پکارا جائے تاکہ وہ اسے لڑکا سمجھیں۔ اور لوگوں کو اس کا مزید یقین دلانے کے لئے ان کے ہاں کئی دن تک صبح و شام دعوتیں اور جلے ہوتے رہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں دوسرے بھائی محارب کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خالد رکھا۔ اُس نے یہ نام خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے طور پر منتخب کیا، کیونکہ جب سے اُس کا بھائی اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اُس کے معاملات سلجھ رہے تھے۔

دونوں بچے جوان ہو گئے اور اُن کی شہرت عرصے کے طول و عرض میں پہنچ گئی۔ ظہیر نے بیٹی کو گھوڑے کی سوار اور تمام وہ فنون جنگ سکھائیے تھے جو ایک جری اور بہادر سپاہی کے لئے سیکھنے لازمی ہیں۔ اُس نے اُسے سخت سے سخت محنت اور خطرناک سے خطرناک مہم میں کود پڑنے کا عادی بنا دیا تھا جب کبھی وہ کسی جنگ پر جانا قبیلہ کے اور عربوں کے ساتھ وہ اُسے بھی ہمراہ لے لیتا۔ اور ان جنگی سواروں میں جیدہ نے اپنی شجاعت کے طفیل جلد ہی ایک انتہائی درجہ حاصل کر لیا۔ اور ایسا ہوا کہ وہ بہادری میں اپنے رفقا سے سبقت لے گئی، یہاں تک کہ وہ تین تینا شیروں پر اُن کے غاروں میں جا کر حملہ کر دیا کرتی تھی۔ اُس کا نام سن کر لوگ کانپ جابا کرتے تھے۔ جب وہ کسی بہادر کو مغلوب کرتی تھی تو وہ ضرور کہا کرتی تھی: ”میں جند را بن ظہیر ہوں جو قبیلوں کا شہسوار ہے“ اُدھر اُس کے عم زاد بھائی خالد نے بھی اپنے دلیرانہ کارناموں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُس کے باپ محارب نے جو ایک نہایت غفلت مند اور داناسوار تھا اجنبیوں کی تواضع کے لئے محلات تعمیر کرا رکھے تھے جہاں بہادران ملک کی خصوصاً بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ خالد بڑے بڑے جنگجوؤں کی صحبت میں پلا اور بڑھا تھا۔ یہی وہ مکتب تھا جس میں اُس کے ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے شہسوار کی کافز سیکھا تھا،

اور اب ایک بے باک سپاہی اور ایک خوف انگیز مبارز بن گیا تھا۔ اُس کے سپاہیوں کو اب علم ہو چکا تھا کہ اُس کے جوش اور اُس کی قوت پر کوئی غلبہ نہیں پاسکتا۔

آخر اُس نے اپنے بھائی جنرل کے متعلق سنا اور اُس کے دل میں اُس سے ملنے، اُس کے حالات معلوم کرنے اور اُس کے کرب دیکھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوا لیکن وہ اپنے اس شوق کو پورا نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا باپ اپنے بھائی کے اس بیٹے کے متعلق اکثر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ خالد کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ محارب کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اعزاز دولت اور حکومت اُس کے اپنے قبضے میں آ گئی۔ جنابیوں کی تواضع، غربا اور مساکین کی دھکیری اور بھوکے شکموں کو کھانا کپڑا دینے میں ملنے باپ کا پیرو تھا اُس نے اپنے بہادر سپاہیوں کی محبت میں بادیہ پیمائی کا سلسلہ بھی جاری رکھا جس نے اُس کی جسمانی قوت اور جرات کو اور بڑھا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے بہت سے قیمتی تحائف جمع کئے اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر اپنے چچا سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اُس نے اُس وقت تک اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی جب تک وہ خلیج کے خیمے کے پاس نہ پہنچ گیا۔ خلیج کے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُس نے اس کی خاطر تواضع کا بڑا اہتمام کیا۔ کیونکہ اُس نے اپنے بھتیجے کی قابلیت اور شجاعت کی باتیں کئی موقعوں پر سنی تھیں۔ خالد جیدہ سے بھی ملا۔ اُس نے اُسے سلام کیا اور پھر گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی کو چومایا۔ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی اسی کی طرح مو ہے۔ جیدہ کی رفاقت میں اُسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی اور وہ دس دن تک اپنے چچا کے ہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں اُس نے شمسواری اور سپہگری کے کتنے ہی مقابلوں میں حصہ لیا۔ اُدھر جیدہ کا یہ حال تھا کہ جب سے اُس کی نظر خالد کی شجاعت اور حسن پر پڑی تھی وہ سو جان سے اُس پر نثار ہو چکی تھی۔ اُسے نیند نہ آتی تھی، اُسے کھانا پینا بھول گیا تھا اور اُس کی محبت اس درجہ بڑھ گئی تھی اور اُسے اپنا دل یہاں تک خالد کے قبضے میں نظر آتا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا ملے میری ماں، اگر خالد مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میں اُس کی جدائی میں مر جاؤں گی، اُس کی ماں نے جب یہ سنا تو اپنی بیٹی پر اُسے بڑا رحم آیا۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ناراض ہونا بے کار ہے۔ اُس نے کہا ”جیدہ، اپنے جذبات کو چھپاؤ اور غم سے اپنے آپ کو نجات دو۔ تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، کیونکہ خالد ہمتناری پسند کا لڑکا ہے اور اُس کی رگوں میں ہمتناری قوم کا خون دوڑ رہا ہے۔ اُسی کی طرح تم خوبصورت اور دلربا ہو اور اسی کی طرح تم بہادر اور شمسواری میں فرو ہو۔ کل صبح جب اُس کی ماں ہمارے ہاں آئے گی تو میں سب معاملہ اُس کے سامنے پیش کر دوں گی، پھر ہم جلد ہی ہمتناری شادی خالد سے کر دیں گے اور آخر کار ہم سب اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔“

ظہیر کی بیوی آنے والی صبح کا انتظار کرتی رہی۔ جب خالد کی ماں اُن کے ہاں آئی تو وہ اپنی بیٹی کو اُس کے پاس لے آئی۔ جیدہ کے لیے لیے بال کندھوں پر پڑے تھے۔ حسن کی اس تصویر کو دیکھ کر خالد کی ماں ششدر رہ گئی، اور کہنے لگی: ”کیا! یہ تمہارا بیٹا جندر نہیں ہے؟“ جیدہ کی ماں نے کہا: ”نہیں! یہ جیدہ ہے۔“ ماہِ جن کو دیکھو وہ طلوع ہو چکا ہے۔“ پھر اُس نے وہ تمام باتیں سنائیں جو اُس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان بچے کی تذکیر و تانیث کو چھپانے کے متعلق قرار پائی تھیں۔ خالد کی ماں نے حسن کی حیرت ابھی کم نہ ہوئی تھی جواب دیا: ”میری پیاری بہن ملکِ عرب کی تمام بیٹیوں میں جو اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں میں نے کبھی اس سے زیادہ پیارا چہرہ نہیں دیکھا۔ اس کا نام کیا ہے؟“ جیدہ کی ماں نے کہا: ”میں ہمتیں بتا چکی ہوں کہ اس کا نام جیدہ ہے اور اس راز سے ہمتیں آگاہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں یہ حسن و جمال کا تحفہ تمہیں پیش کروں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں اور اس طرح پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں“ خالد کی ماں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا اور کہنے لگی: ”جیدہ کی رفاقت یقیناً میرے بیٹے کو بہت مسرور کرے گی۔ وہ فوراً اٹھی اور خالد کو تلاش کر کے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اسے بتا دیا اور جیدہ کے حسن و جمال کا خاص طور پر ذکر کرتی رہی اُس نے کہا ”مجھے اپنے ایمان کی قسم، اے بیٹے، میں نے جیدہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہ کبھی صحرا میں دیکھی ہے اور نہ کبھی شہر میں۔ کوئی چیز اپنے حسن میں اس سے زیادہ کامل نہیں ہے اور کوئی چیز اس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ دلکش نہیں ہے۔ جلدی کرو میرے بیٹے اور اپنے چچا سے مل کر اُس کی لڑکی کو اپنے لئے ہانگ لو۔ اگر وہ تمہاری استدعا کو قبول کر لے تو یقیناً تم خوش قسمت ہو گے۔ جاؤ اور جلد سے جلد اُسے حاصل کر لو۔“

یہ الفاظ سن کر خالد کی آنکھیں جھجک گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ متفکر سا ہو گیا، پھر اُس نے کہا: ”اتاں، میں یہاں اب اور نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے اب اپنے سواروں اور فوجیوں سمیت یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔“

مجھے اب جیدہ سے کچھ نہیں کہنا، مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کا مزاج اور جس کا فلسفہ غیر معین ہے، اُس کی سیرت اور اس کا طرزِ کلام استو کام اور استقلال سے عاری ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سپاہیوں کے درمیان گزاری ہے جن پر میں اپنا روپیہ صرف کرتا ہوں اور جن کے ساتھ مل کر میں نے اپنی سپاہیانہ شہرت حاصل کی ہے۔ اب یہی جیدہ کی میرے لئے محبت، سو یہ ایک عورت کی کمزوری ہے، ایک نوجوان لڑکی کی۔“

پھر اُس نے اپنا زہ بکتر سپن لیا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا، چچا کو خدا حافظ کہا اور اسی وقت اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ظہیر نے پوچھا: ”آخر اس جلدی کے کیا معنی ہیں؟“ خالد نے کہا: ”میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔“ او

گھوڑے کو ایڑ لگا کر یکایک صحرا کی وسعت میں کود پڑا۔ خالد کی ماں بھی وہ تمام گفتگو جو اُس کے اور خالد کے درمیان ہوئی تھی جیدہ کو بتانے کے بعد ایک اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

جیدہ کی حساس روح نے اس تحقیر کو بڑا محسوس کیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوب گئی۔ اُس کی فینڈا لگئی اور اُس کی بھوک نازل ہو گئی کچھ دن کے بعد جب اُس کا باپ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں پر ایک حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو اُس کی نگاہ جیدہ پر پڑی۔ اُسے یوں اندر دہ اور پڑ مردہ دیکھ کر اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے سوچا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ یقیناً پھر اپنے آپ میں آجائے گی۔

ابھی ظہیر نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ جیدہ نے جو اپنے آپ کو موت کے بالکل قریب سمجھ رہی تھی اور جس کی ادا اسی اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی اپنی ماں سے کہا ”اماں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مر رہی ہوں، دانا خالیکہ یہ کم سجت خالد اپنی زندگی کی قوتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر خدا مجھے قوت سے نو میں مانتی ہوں کہ اسے موت کے قدر و غضب کا تجربہ کراؤں اور اُس کے درد و کرب کا مزہ چکھاؤں“ یہ کہہ کر وہ ایک شیرنی کی طرح اُٹھی، اُس نے زرہ پر پنی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ماں سے کہنے لگی کہ میں شکار کے لئے جا رہی ہوں۔ تیزی سے اور بغیر کہیں ٹھہرے وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کو طے کرتی ہوئی اور اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو بڑھاتی ہوئی خالد کی قیام گاہ میں پہنچ گئی۔ چونکہ اُس نے بھیس بدل رکھا تھا اس لئے کسی نے اُس کو نہ پہچانا اور وہ اُس خیمے میں داخل ہو گئی جو اجنبیوں کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ اُس کے خود کی آنکھیں حجازی سواروں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ غلاموں اور خادموں نے اس کا استقبال کیا اور اس طرح اُس کی خاطر و مدارات کی بجائے وہ ملک کی کوئی بہت عالی رتبہ شخصیت تھی۔ اُس رات جیدہ نے آرام کیا، لیکن دوسرے دن فوجی وزرشوں میں اُس نے حصہ لینا شروع کر دیا، بہت سے بہادروں کو دعوتِ مقابلہ دی اور اپنی کاردانی اور بہادری کی ایسی نمائش کی کہ دیکھنے والے جبرت زدہ رہ گئے۔ دوپہر سے بہت پہلے اُس نے خالد کے سب بہادروں سے اپنی فوقیت تسلیم کر لی۔ خالد خود اُس کی شجاعت کا نظارہ کرنے آیا، اور جب اُس نے اُس کا کمال فنِ ملاحظہ کیا تو وہ حیران رہ گیا، او اپنے آپ کو اُس کے مقابلہ کے لئے پیش کیا۔ جیدہ فوراً مقابلے کے میدان میں آگئی اور پھر دونوں لڑائی میں گتھ گتھ۔ ایک ایک کر کے انہوں نے حملے اور مدافعت کے تمام داؤں آزادالے یہاں تک کہ رات کے سامنے اُن پر چھانے لگے۔ جب وہ جدا ہوئے تو کسی کو کوئی مضرت نہ پہنچی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ فریقِ غالب کون ہے۔ یوں جب جیدہ تماشا بہوں پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ لوگ

اپنے سردار کو ایک اجنبی کے ہاتھوں مجبور دیکھ کر کچھ جزبہ سے ہو رہے ہیں۔ خالد اپنے حریف کے لئے ہر ممکن خاطر و مدارات کے احکام دے کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ اُس کا دل آج کے صبح کے خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ جیدہ تبیں دل تنگ خالہ کے ہاں مقیم رہی۔ ہر صبح وہ مقابلے کے میدان میں آدھکتی اور جب تک رات نہ ہو جاتی وہ اپنے ہتھیار ہاتھ سے نہ رکھتی۔ اُس نے ان مقابلوں سے خوب لطف اٹھایا مگر اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُدھر خالد نے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھا، کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کون ہے اور کس قبیلے سے ہے۔ چوتھے دن صبح کے وقت جب خالد حسب معمول اپنے گھوڑے پر چڑھ کر باہر نکلا اور مہمانوں کے خیموں کے پاس پہنچا تو اُس نے جیدہ کو بھی ایک گھوڑے پر سوار دیکھا۔ اُس نے اسے سلام کیا اور اُس نے سلام کا جواب دیا۔ خالد نے کہا ”اے شریف عرب، میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں گو میں اب تک اظہارِ نیاز و مہنڈی سے قاصر رہا ہوں لیکن اب میں اُس خدا کے نام پر تجھ سے التجا کرتا ہوں جس نے تجھے یہ فوٹ اور چستی عطا کی ہے مجھے بتا کہ تو کون ہے اور تیرا تعلق کس بادشاہ سے ہے کیونکہ میں نے تیرے جیسا بہادر جنگجو آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے بتائیں تجھ سے عاجزاً درخواست کرتا ہوں کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بیتاب ہوں۔“

جیدہ مسکرائی، اور خود کو اُدھر اٹھاتے ہوئے اُس نے جواب دیا ”خالہ میں ایک عورت ہوں جنگجو نہیں ہوں میں تیرے چچا کی بیٹی جیدہ ہوں جس نے اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کیا تھا اور اپنا آپ تجھے دے ڈالنے کی خواہش کی تھی مگر تو نے انکار کر دیا۔“ اپنے اُس غرور میں جو تجھے اپنی تلوار کے باعث ہے۔“ یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑا۔ ایڑ لگائی اور ہوا کی رفتار سے اُسے اڑاتی ہوئی اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

خالد حیران پریشان اپنے خیمے میں واپس آگیا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کیا کرے اور نہ جانتا تھا کہ اُس بیتاب محبت کا جو یکایک اُس کے سینے میں لہریں لینے لگی ہے کیا انجام ہوگا۔ وہ اپنے اُس جنگجو یا نہ ذوق اور اپنی اُن سپاہیانہ عادات سے سخت بیزار ہو گیا جنہوں نے اُسے اس رنج و اندوہ کے کرب و اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورتوں سے اُس کی نفرت یکایک محبت سے بدل گئی۔ اُس نے اپنی ماں کو بلا کر سب ماجرا کہہ سنایا۔ ماں نے کہا ”میرے بیٹے یہ تمام حالات ایسے ہیں کہ جیدہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزیز ہونی چاہئے، مگر نفوذی دیر صبر سے انتظار کرو، تاکہ میں جا کر اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ منہ سے لے لوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک اونٹ پر سوار ہو گئی اور صبح اُس اُن نفوذی قدم پر پڑی جو جیدہ کے گھوڑے کے سموں سے ریت پر بن گئے تھے۔ جیدہ نے گھڑ بچ کر تمام واقعہ سن و سن اپنی ماں کو سنا دیا تھا۔ خالد کی ماں نے آنے ہی اپنے آپ کو ظہیر کی بیوی کی جھولی

میں ڈال دیا اور اپنے بیٹے کے لئے جیدہ کا رشتہ مانگا کیونکہ ظہیر ابھی اپنی مہم سے واپس نہ لوٹا تھا۔ جب جیدہ نے اپنی ماں سے خالد کی درخواست کو سنا تو اُس نے کہا: ”کبھی نہ ہوگا خواہ مجھے اس کے لئے موت کا جام ہی کیوں نہ پینا پڑے۔ جو کچھ اُس کے خیموں کے پاس واقع ہوا اُس کا مقصد محض غم و اندوہ کی اُس آگ کی پیاس کو بجھانا تھا جو میرے سینے میں شعلہ زن تھی اور میری روح کو جھلے ڈالتی تھی۔“

یہ الفاظ سن کر خالد کی ماں مایوس واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی جسے جیدہ کی جدائی میں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ دفعۃً اُٹھ کھڑا ہوا اور مضطربانہ اپنی نسبت جیدہ کے خیالات دریافت کرنے لگا۔ جب اُس نے جیدہ کا جواب سنا تو اُس کا اضطراب حد سے گزر گیا۔ اور جیدہ کا انکار اُس کے سمندر شوق پر ایک اوتارِ زیارہ ہو گیا۔ اُس نے کہا: ”میرے میری ماں، میں کیا کروں مجھے اس دام سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔“ اُس نے جواب دیا: ”مگر یہ کہ تم اپنے تمام شہسواروں کو اکٹھا کرو اور اُن دوسرے قبائل کے بہادروں کو بھی جو تمہارے حلیف ہیں اور اُس وقت تک انتظار کرو جب تمہارا چچا اپنی مہم سے واپس آجائے، اور پھر اپنے آدمیوں کو لے کر اُس کے پاس جاؤ اور ان سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اُس سے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے تو اُسے تمام قصہ سنا دو اور اپنا دامن پھیلانے رکھو یہاں تک کہ وہ تمہارے مطالبے کو قبول کرے۔“ اس تجویز نے خالد کے غم کو کسی قدر کم کر دیا۔ جو نہی اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا چچا گھر واپس آگیا ہے اُس نے اپنے رؤساء خاندان کو اکٹھا کیا اور اپنی کہانی انہیں کہہ سنائی۔ وہ سخت حیران ہوئے اور معدی کرب جو خالد کا بہادر ترین رفیق تھا یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ”یہ عجیب بات ہو کیونکہ ہم تو ہمیشہ سے ہی سنتے آئے تھے کہ تمہارے چچا کے ماں ایک بیٹا ہے جس کا نام جندرب ہے مگر حقیقت آج کھلی۔ اور یقیناً تم ہی ایک شخص ہو جو اپنے چچا کی لڑائی پر سب سے بڑھ کر حق رکھتے ہو۔ اس لئے ہمارے لئے بہترین طریقِ عمل یہ ہے کہ ہم سب اُس کے سامنے جا کر اپنے سر جھکا دیں اور اُس سے اپنے خاندان میں واپس آنے کی التجا کریں اور کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کسی اجنبی کو نہ دے۔“ خالد کچھ اور سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھ اُن ایک سو بہادر سواروں کو جو بچپن سے محارب اور ظہیر کے ساتھ پہلے اور ہوش تھے اور پہلے سے زیادہ قیمتی تحائف لے کر روانہ ہوا اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک وہ قبیلہ سعد میں پہنچ نہ گیا۔ سب سے پہلے خالد نے اپنے چچا کو جنگ سے اُس کی کامیاب واپسی پر مبارک باد پیش کی۔ خالد کی اس دوبارہ آمد پر سب سے زیادہ حیرت ظہیر کو تھی، خصوصاً جب اُس نے اپنے بھتیجے کو تمام امرا و اعیان کے ساتھ دیکھا۔ اُسے سالن گمان بھی نہ تھا کہ خالد کے دوبارہ آنے میں اُس کی بیٹی جیدہ کا بھی کچھ تعلق ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ

اُسے صرف وطن واپس چلنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ ظہیر نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی اُن کے لئے خیمے جیسے کئے اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ اُس نے اونٹ اور بھیڑیں فوج کرنے کا حکم دیا اور اُن کی ایک عظیم الشان دستہ کی اور تین دن کے لئے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام اُن کے لئے کر دیا۔ چوتھے دن خالد نے کھڑے ہو کر اپنے چچا کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے بعد جیدہ کے رشتے کے لئے درخواست کی اور اپنے ملک کو واپس چلنے کی التجا کی۔ ظہیر نے کہا کہ جند رکے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں لیکن خالد نے جو کچھ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ دیا اور جو کچھ اُس کے ساتھ گر چکا تھا بتا دیا۔ یہ باتیں سن کر ظہیر شرمندہ ہو گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر وہ خیالات میں غرق رہا اور یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں اُس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا ”میرے بھائی میں اس راز کو زیادہ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میری بیٹی کی شادی اب خالد ہی سے ہوگی کیونکہ ہر اُس شخص سے جسے میں جانتا ہوں میں خالد ہی کو اُس کے لائق پاتا ہوں۔“ اُس نے اپنا ہاتھ خالد کو پیش کیا جس نے فوراً اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خالد کے اکابر و اعیان اس معاملے کے گواہ تھے۔ پانچ سو بھروسے سیاہ چشم اونٹ اور تین کی منتخب ترین پیداوار سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ جمیز قرار پائے۔ لیکن قبیلہ سعد پر جن کے پاس ظہیر کا قیام تھا اس معاملہ کا کوئی بار نہ تھا۔

جب اس بات کے متعلق ظہیر نے اپنی بیٹی کی منظوری کے لئے سوال کیا توجیدہ کی طبیعت اپنے باپ کے اس طریق عمل پر درہم برہم ہو گئی۔ مگر جب اُس نے لڑکی کو چھٹی طرح سمجھا دیا کہ وہ اب اُسے بن بیا نہیں رکھنا چاہتا تو اُس نے کہا ”آبا، اگر خالد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اُس وقت تک اس کے خیمے میں داخل نہ ہوگی جب تک وہ میرے بیاہ پر اُن اونٹوں میں سے ایک ہزار اونٹ حلال نہ کرے جو اس وقت تلوار کے دھنی“ قاسم بن مالک کی ملکیت میں ہیں۔“ خالد نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ لیکن اُس کے انسروں اور سپاہیوں نے اُس وقت تک ظہیر کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اُس نے تمام مال و اسباب اپنے وطن کو منتقل ہونے کی خاطر جمع نہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ تیاریاں ختم ہوئیں خالد ایک ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر مم پر روانہ ہو گیا اور اُن کی مدد سے اُس نے قبیلہ عامر کو مغلوب کر لیا۔ درتلوار کے دھنی“ کو اُس نے تین دفعہ زخمی کیا، بہت سے بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا، اُن کو لوٹا اور اُس سے بہت زیادہ مال غنیمت اُن کے ملک سے لے گیا جتنا جیدہ نے طلب کیا تھا۔ مال و دولت سے لدہ ہوا اور فتح کے نشہ سے سرشار وہ واپس آیا۔ مگر جب اُس نے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا توجیدہ نے اُسے اپنے پاس بلا کر الفاظ کہے، ”اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے میری فرمائشوں کو پورا کرو اور جو عہد میں تم سے کرتی ہوں

اُس پر قائم رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کے دن کسی ذمی رتبہ آدمی کی بیٹی، جو اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئی ہو میرے اونٹ کی مہارت تھائے۔ وہ ملک کے کسی معزز ترین رئیس کی بیٹی ہو تاکہ اُس دن میں عرب کی معزز ترین بیٹی بھی جاؤں، خالد نے مان لیا اور اُس کی خواہشات کے حصول کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسی روز وہ اپنے سماریوں کو لے کر چل کھڑا ہوا اور سرزمینِ یکر کو تلاش کرتا ہوا بہت سے میدانوں اور وادیوں کو طے کر گیا یہاں تک کہ وہ ملکِ حجاز میں پہنچا۔ اس جگہ اُس نے معاویہ بن مفضل کے قبیلہ پر حملہ کیا۔ وہ طوفان کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا، اور مدافعیین کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین اُس وقت اُس نے عمیرہ بنتِ معاویہ کو گرفتار کیا جب وہ راہِ فرار اختیار کرنے کو تیار تھی۔

اُس نے اپنی بیخ کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے بہادر سپاہیوں کی سب مدافعت بے کار ہو گئی، اور وہ بھاگ کر منتشر ہو گئے۔ اس علاقے کے عربوں کی تمام دولت اُس نے چھین لی اور پھر گھر کی طرف رخ کیا۔ مگر وہ اُس وقت تک اپنے خیموں میں داخل نہ ہوا جب تک اُس نے وہ سارا مال و دولت اکٹھا نہ کر لیا جسے وہ صحرا کے مختلف مقامات پر چھوڑ آیا تھا۔

جوان لڑکیاں جھانجھیں اور کسی قسم کے دوسرے سازبجاتی ہوئی اُس کے آگے آگے چلتی تھیں۔ سارا قبیلہ خوشیاں مناتا تھا اور جب خالد ظاہر ہوا تو اُس نے بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے تقسیم کئے اور رفیقوں اور دوستوں کو اُس دعوت پر مدعو کیا جسے وہ اپنی شادی کی تقریب میں تیار کر رہا تھا۔ شادی پر اس علاقے کے تمام عرب بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ شراب و کباب کی فراوانی سے اُس نے انہیں سُرست کر دیا۔ لیکن جس وقت سب مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے خالد اپنے ساتھ دس غلاموں کو لے کر شیریں و شیرنیوں اور اُن کے بچوں کے شکار کے لئے جنگل کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا تاکہ اس تقریب کے مہمانوں کے لئے ایک انوکھی ضیافت کا سامان مہیا کرے۔

لیکن جیدہ کو کسی طرح پہلے ہی سے اُس کے ارادہ کا علم ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زہر بکتر میں چھپا لیا اور گھوڑے پر چڑھ کر تیز تیز خالد کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ سبھی جشن کے تین دن باقی تھے کہ ایک غار میں اُن دونوں کا سامنا ہوا۔ وہ ایک وحشی درندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور ایک شدید حملے کے ساتھ چلا کر بولی بولے عرب! اپنے گھوڑے سے اتر جا اور اپنی زہر بکتر اتار ڈال اگر تو نے ذرا بھی لیت دلع کی تو میرا یہ نیزہ ابھی تیرے سینے سے پار ہوگا“ خالد نے اُس کے مطالبے کے جواب میں فوراً مدافعت کا ارادہ کر لیا۔ ذرا سی دیر میں ایک شدید جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ یکشمکش ایک گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ پھر خالد کو اپنے حریف

کی آنکھوں میں ایک ایسی بات نظر آئی کہ وہ ڈر گیا۔ وہ پھر اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا اور لڑائی کی جگہ سے ہٹ کر اُس نے کہا ”میں تجھ سے دینِ عرب کا واسطہ نہ کر پوچھتا ہوں، مجھے بتا کہ تو اس صحرا کا کون سا بطلِ جلیل ہے، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تیرا جملہ اور تیرے وار مجھ سے روکے نہیں جاتے۔ تو نے میرے ارادوں کو اور میری ملی خواہشوں کو خاک میں ملا دیا ہے“ یہ الفاظ سن کر جبید نے اپنا خود اوپر اٹھایا تاکہ وہ اس کا چہرہ دیکھ لے۔ اُس نے کہا ”خالد کیا اُس لڑکی کے لئے جس سے تجھے محبت ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ وحشی درندوں کا شکار کرے تاکہ عرب کی بیٹیاں سیکھیں کہ اس کے واحد اجارہ دار جنگوں میں لڑنے والے مرد ہی نہیں ہیں؟“ اُس چپختی ہوئی ملامت پر خالدمشرم میں غرق ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا ”خدا کی قسم جبید تیرے سوا اور کوئی مجھے مغلوب نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا اس ملک میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے تجھے دعوتِ مقابلہ دی ہو یا بس مجھ ہی پر تجھے اپنے زور و قوت کو ثابت کرنا تھا؟“ جبید نے کہا ”خدا کی قسم میں اس صحرا میں اس لئے آئی ہوں کہ وحشی درندوں کے لشکار میں تیری مدد کروں، تاکہ تیرے سپاہی تجھے بیوی کے انتخاب پر طعنہ زنی نہ کر سکیں۔ یہ الفاظ سن کر خالدم جبید کی جرات اور عزم پر حیرت اور تعجب سے مبہوت رہ گیا۔

پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور ایک غار میں داخل ہو گئے۔ خالدم نے دو خونخوار جانوروں کو اسیر کیا اور جبید نے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو مارا۔ یہ مہم انجام دے کر انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور جبید خالدم کی ہمراہی پر خوش تھی۔ اُس نے کہا ”اور میں تمہیں اُس وقت تک اپنے خیموں سے جانے کی اجازت نہیں دوں گی جب تک کہ ہماری شادی نہ ہو جائے“ پھر یکایک وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے اپنی جائے سکونت کی طرف چل دی۔

خالدم اپنے غلاموں کی طرف بڑھا جنہیں وہ کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا، اور اُس نے انہیں درندوں کی اٹھاکر خیموں کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے کہ خالدم نے کیا کیا ہے انہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ خالدم تمام بہادروں سے بڑا بہادر ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور جو لوگ آتے تھے اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ دو شیرزہ کنیزیں جھانجھیں سجائی تھیں، غلام اپنی تلواریں ہوا میں ہلاتے تھے اور نوجوان لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہتی تھیں۔ اس نشاط و سرور کے درمیان خالدم اور جبید کی شادی ہوئی عیمہ بنتِ معاویہ دلمن کے اونٹ کی مہار تھلے ہوئے تھی اور عورتیں اور مرد جبید کے نام کو بلند کر رہے تھے۔

منصور احمد

جستجوئے حق

جنہیں علمِ حقیقت ہے عمل ہے مدعا اُن کا
 جو دل رکھتے ہیں سینے میں خدا ہے منتہا اُن کا
 ضمیر ایمان ہے جن کا جنہیں حاصل ہو یکسوئی
 اُنہیں کعبے سے کیا؟ دل اُن کا ہے قبلہ نما اُن کا
 کسی کو کیا ضرورت ہے کسی کی رہنمائی کی؟
 خود اپنے رہنما ہیں جو خدا ہے رہنما اُن کا
 جنہیں دشت جہاں میں زندگی راہِ ترقی ہے
 اُنہیں منزل سے کیا مطلب؟ سفر ہے مدعا اُن کا
 خوشی ہو غم ہو کچھ ہو زندگی یہ ہے کہ خوش رہے
 جو خوش رہتے ہیں خوش اُن سے ہمیشہ ہی خدا اُن کا
 جنہیں ہے آرزو حق کی جنہیں ہے جستجو حق کی
 خدا ہے مبتدا اُن کا خدا ہے منتہا اُن کا
 یہی راز حقیقت ہے خودی بھی بے خودی بھی ہو
 جو بیخود ہیں خودی میں وہ خدا کے ہیں خدا اُن کا

ب

رات کی خاموشی میں

رات کی خاموشی میں تنگ و تاریک جھونپڑی کی گلا گھونٹنے والی ہوا کے اندر فرشِ خاکی پر لیٹے ہوئے کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اب ایسی نیند سو جاؤں کہ پھر نہ اٹھوں۔ گناہ کا ہارسینے پر لئے ہوئے اس طرح غائب ہو جاؤں کہ دنیا اور دنیا والوں کے لئے کوئی نشانِ عبرت بھی باقی نہ رہے۔ مگر صبح جب صبح قیامت کے استقبال کو اٹھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روزمرہ کا سورج اپنی آتشیں شعاعوں کے ساتھ پھر ایک مرتبہ مجھے دنیا کی راز جو لگا ہوں کے سامنے عریاں بدفِ استہزا بنانے کے لئے چمک رہا ہے اندھیری راتوں کو جب جھکڑ کی خوفناک نندی اور آندھی کا زور بدن میں سننا ہٹ پیدا کر دیتا ہے، بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ جب بارش اور اولوں کے طوفانی شور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خبیث، روئیں تختِ الثریٰ سے نکل کر کائنات کو اپنی لرزہ انگیز چیخوں سے ترو بالا کر ڈالیں گی میں اپنے پر نگاہ ڈالتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ انسان کا دل ان طوفان زدہ عناصر سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ "انسان کا دل" میں نے غلط استعمال کیا۔

اپنے پر کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

وہ جنہیں زندگی کی تلخ کامیوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی گلشنِ حیات میں ٹنگے نکلے، کلیاں چمکتی اور نوا سنجانِ چمن کو نغمہ سیرانی میں مصروف دیکھا۔ جن کے کان سازِ زندگی سے صرف نغمہ ہائے عشرت ہی سننے کے عادی ہے۔ جن کی سماعت نو صغیر کی دلدور صداؤں سے ہمیشہ محفوظ رہی آہ وہ بھی انسان ہیں۔ اگر یہی "انسان" ہیں تو کیا اس لفظ کا اطلاق ان سوختہ سامانوں پر بھی ہو سکے گا جن پر آسمان کے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہے۔ جنہوں نے آنکھ کھولی تو زندگی کے باغ میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی اور جوں جوں دن گزرتے گئے بادِ خزاں کے تند جھونکوں سے پتے گرتے اور پھول مرجھاتے چلے گئے جن کی امید کی کلی کھلنے سے پیشتر ہی مصائب کی گرم لونسے جلا کر خاک کر دی۔ جن کی کشتی حیات سفر کی شروع منزل میں حوادث کی سخت چٹانوں سے ٹکڑا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ خوش نصیب جن کی آنکھیں اشکِ خونا ب اور دل بارِ الم سے آزار ہیں کیونکہ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کا دل بھی ان طوفان زدہ عناصر کی طرح بجائے خود ایک پُر خروش طوفان ہے

وہ بیدار بخت ہستیاں جن کے لئے ہزار ہزار ہزار سن اور ستر سو سالیں نہیں ثابت ہوتا کیا جانیں کہ ایک طوفانِ زندہ جل کو پہلو میں لے کر سونا گویا کا نٹوں کا لیٹنا اور دھکتے کو ٹکوں پہ جلنا ہے۔

اکثر ارباب اسی طرح آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں۔ صبح کے انتظار میں نہیں کیونکہ فکرِ فردا اور غمِ ماضی تو میری جان کے قاتل ہیں۔ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں اور اندر ہی اندر مرجاتی ہیں خیالات آتے ہیں اور کسی کے کان یا زبانِ قلم تک پہنچنے سے قبل ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ رات کے اختتام پر سپیدہ عمر نمودار ہو کر حیاتِ نازہ کا پیغام دیتا ہے۔ ہر شب آسمان پر تیووتا ربا دل چھلے رہتے ہیں اور کائنات ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مدفون رہتی ہے لیکن اُس وقت بھی گاہے گاہے بجلی چمک کر زمان و مکان کو، ایک لمحہ کے لئے ہی ہی پُر نور کر جاتی ہے۔ مگر آہ میرا مطلعِ حیات !!! !!! !!! سالہا سال گزر جانے پر ایک امید گرہاں، ایک فریبِ نفس میں مبتلا ٹٹکی لٹکائے دیکھ رہا ہوں کہ شاید اس کے افقِ تاریک پر بھی کوئی روشنی جلوہ گر ہو۔ مگر جہاں میری اور تنہائیں لا حاصل ثابت ہوئیں یہ آرزو بھی بھتی نظر آرہی ہے۔

میرے آقا عین اُس وقت جب میں صبحِ مسرت کی شاد کا میوں سے ہلکارا ہونے والا تھا تو نے مجھے شامِ غم کی حسرتوں سے دوچار کر دیا۔ جامِ عشرت میرے لبوں تک پہنچنے پہنچتے تلخا ہِ حیات میں متبدل ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں ہر شخص کو آگ اور پانی کے طوفان میں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی کی تکمیل ہوتی ہے سب صحیح۔ لیکن ایسے تہی دستاں قسمت بھی تو ہیں جو تکمیلِ حیات کے اس مرحلہ سے گزرتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو گئے یا موجوں کا لقمہ بن گئے۔ جاڑا، گرمی، برسات، بہار، خزاں رنگِ رلیاں منانے والوں کے لئے قدرت کے مختلف اللون مظاہر ہیں جن سے بہ لحاظِ موسم بدلستکی کے لوازمات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر غم کا ایک ہی موسم ہے۔ غمگین دلوں کے لئے وقت بدلتا نہیں گردش کرتا ہے۔ کتنی برساتیں آئیں اور گرگرتیں مگر میرا دیدہ ہمارا نہ تھا۔ بادل آتے کھل کر برسے اور برس کر کھل گئے لیکن ادما کی کالی گھٹائیں نہ چھٹیں۔ گرمی کی حدت دنیا کو نمونہ جہنم بنا کر سردی میں تبدیل ہوتی گئی مگر اُس تپش کا کیا علاج جس نے میری جانِ ناتواں کو شعلہ زار اور روحِ نزار کو آتشکدہ بنا رکھا ہے۔

اے آقا میں تجھ سے شہزادے عشرت کا طالب نہیں میں حیاتِ مستعار کے چند دنوں کو جھوٹی خوشیوں سے بھر لینا نہیں چاہتا۔ میں نیرے پاس نہ کایت لے کر نہیں آیا کہ کیوں مجھ سے کم استعداد والے لوگ سودر الطاف واکرام بن رہے ہیں۔ میں کون کہ تیری تقسیمِ انعامات پر حرف گیری کروں؟ مل اس دنیا سے فانی میں،

جہاں روزِ محشر سے قبل ہی نفسا نفسی کا عالم طاری ہے۔ اطمینان کا ایک سانس چاہتا ہوں۔ قلب کو وہ کیفِ سردی عطا کر جو رنج و راخت، دکھ اور سکھ کو یکساں برداشت کر لے اور شکوہ زبان پر نہ آئے۔ تیری رضا سے اپنی رضا وابستہ کر لوں۔

مجھے دوست دشمن، کسی سے گلہ نہیں۔ ہر چند کہ اپنوں کی بیگانگی اور دوستوں کی بے مروتی نے کئی مرتبہ خون کے آنسو لائے۔ تُو جو لطف و احسان کا سرچشمہ اور انوار و تجلیات کا منبع ہے مجھ سے یہ کار کے قلبِ حزن کو، جو کثرتِ عصمیاں سے اپنی درخشانی کھو چکا ہے، لمحاتِ قدسی کے ایک پر تو سے منور کر دے۔ تیری ذاتِ میری حدِ نگاہ سے بھی بلند اور اتنی پاکیزہ ہے کہ یہ گنگناہ اس کا تصور بھی کرنے کا اہل نہیں۔ گمراہِ سخن اقرب کہہ کر کشتِ امید کو سرسبز کرنے اور بالوسِ دلوں کو ڈھارس دینے والے، ہمیں دیوانہ وار تیری طرف دوڑتا ہوں۔ ناچیز کو دامنِ شفقت میں چھپا لے۔ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کر لیتا ہے۔ ریت کا حقیر ذرہ ریگِ زار میں سماتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے۔ میں بھی ہر چند کہ کون و مکان کی بے پناہ پھنسیوں اور عالمگیر و معنوں میں گم کردہ راہِ مسافر کی طرح بھٹک رہا ہوں، تیری جانب دوڑوں گا۔ اگر سمندر کی لہریں چاند تک پہنچ سکیں گی اگر دیدہ و مجس کی بے نوری دیدارِ عیب سے روشن ہو سکے گی اور اگر بلبلِ سبز چاک کو بہارِ جاوداں کی دائمی مصلحت کبھی نصب ہو سکے گی تو شاید میں بھی، آہ میں بھی ایک دن اپنی ذات کو جو میری روح کے لئے بوجھل اور روح کو جو میری ذات کے لئے بارِ گراں ہے، تجھ میں فنا کر کے مفقودِ حیات پاسکوں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

عاشقِ بٹالوی

زبانِ خدا کے اسرار کا خزانہ ہے تم اس پر خاموشی کا قفل لگاؤ۔ ————— لقمان

تمام خزانوں سے بڑا خزانہ ہنر ہے ————— سقراط

سب سے بڑھ کر آسان بات دوسروں کو صلاح مشورہ دینا ہے ————— تھیلز

کون تمہیں بازو دھتا ہے؟ کون تمہیں غلام بناتا ہے؟ تمہاری اپنی خواہش! ————— سوامی ام تیہتھ

محمد داؤد

ضبطِ نفس

اکثر لوگ "ضبطِ نفس" "مشکست آرزو" اور "فنائے خودی" کی مصطلحات کے متعلق نہایت مبہم اور غلط خیالات رکھتے ہیں۔ بعض لوگ اور بالخصوص ایسے لوگ جن کی طبائع کا میلان قیاسیات کی طرف ہوتا ہے ضبطِ نفس کے مسئلہ کو کوئی مسئلہ نابعد الطبیعیات سمجھتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو زندگی اور اس کی تمام قوتوں کو معدوم کر کے جمود پیدا کر دینے کی سعی کو ضبطِ نفس کا مرادف سمجھتے ہیں۔ یہ غلط اور پریشان خیالات جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں انہی کی ذاتی کوششوں سے دور ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی کو سچائی کی تلاش ہو تو اس کی تمام لاطائل قیاس آرائیاں اس مسئلہ کو اپنی حقیقی شکل و صورت میں پیش کر کے نہایت آسانی سے رفع کی جاسکتی ہیں۔ اپنے نفس پر قابو پانے اور اسے مغلوب کر لینے کا مسئلہ نہایت سادہ ہے۔ اس قدر سادہ اور قابلِ عمل کہ ایک بچہ سالہ سچے جس کے دماغ پر قیاسیات مذہبیات اور فلسفیانہ خیال آرائیوں کے گرد و غبار کا پردہ ابھی نہیں پڑا ان سن رسیدہ لوگوں سے جن کی لوحِ دل سے پیچیدہ مسائل کے غبار نے تمام سادہ اور خوبصورت سچائیوں کو محو کر دیا ہے زیادہ آسانی سے اس کی کنہ کو پہنچ جاتا ہے۔

خودی کو فنا کر دینے کے یہی معنی ہیں کہ روح سے اُن تمام عناصر کو خارج کر دیا جائے جو تشنہ، جنگ، مصائب، امراض اور آلام کے پیش خیمہ ہیں۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ کسی امن پر درصفت حمیدہ کو تباہ کیا جائے، مثلاً جب ایک آدمی کو غیظ و غضب یا غصہ آنے لگے اور وہ کوششِ خاص سے اس کو ضبط کرے اور صبر و محبت کا ملے تو اس کے اس عمل کو ضبطِ نفس یا شکستِ خودی سے تعبیر کریں گے۔ ہر شریف آدمی خواہ وہ اس حقیقت سے انکار ہی کیوں نہ کرے اس پر جزوِ اعلیٰ کرتا ہے۔ اور جو شخص اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے اور ہر ایک خود غرضانہ خیال کو مٹا دیتا ہے حتیٰ کہ اس میں صرف الہیانہ صفات باقی رہ جاتی ہیں وہ اپنی خودی کو مٹا دیتا ہے اور صداقت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔

خودی جو مٹانے کے قابل ہے ان دس بے قیمت اور رنج زا عناصر سے مرکب ہے، شہوت، نفرت، لالچ، حظِ نفس، خود غرضی، ہنجر، غرور، شک، بد اعتقادی اور فریب۔ ضبطِ نفس سے مراد یہ ہے کہ ان دس ذیل عناصر کو بالکل معدوم کر دیا جائے۔ اس سے انسان میں تربیتِ ذات، عمل اور پاکیزگی، صبر و تحمل، تواضع، انشراح،

خود اعتمادی، بے خوفی، علم عقل، علم اور محبت جیسی صفات حمیدہ کے تحفظ کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صداقت انہی دس صفات سے مرکب ہے۔ اور جو شخص ان صفات کے دائرہ میں زندگی بسر کرتا ہے وہ صداقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ خود صداقت کا جسم بن جاتا ہے۔ اول الذکر دس عناصر کے اجتماع کا نام خودی یا نفس ہے، اس کے جوکس آخر الذکر دس صفات کے مجموعہ کو صداقت کہتے ہیں جو انسان کو بے نفس، دائمی حقیقی اور زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ضبط نفس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی شریفانہ بھی اور متحملانہ صفت کو تباہ کیا جائے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ غیر شریفانہ جھوٹی اور مرذیل خصلت کو معدوم کر دیا جائے۔ یہ بھی غلط ہے کہ انسان ضبط نفس سے مسرت، بہجت اور خوشی کھو بیٹھتا ہے۔ نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ صفات حمیدہ کے دائرہ میں رہ کر ان چیزوں کو ہمیشہ کے لئے پالیتا ہے۔ ضبط نفس خوشی کی حرص کو ترک کرنے کا نام ہے نہ کہ خوشی ہی کو۔ یہ مسرت کی ہوس کو تباہ کرتا ہے نہ کہ مسرت کے وجود کو۔ یہ محبت طاقت اور اقتدار کی خود غرضانہ تمناؤں کا خاتمہ کرتا ہے۔ نہ کہ محبت طاقت اور اقتدار ہی کا۔ ضبط نفس ان تمام چیزوں کو قائم رکھتا ہے جو بنی آدم کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہیں اور انہیں رشتہ اتھاو و مودت میں منسلک کر دیتی ہیں۔ ضبط نفس جو دودھوت کی پرستش سے ہٹا کر بلند ترین، شریف ترین، موثر ترین اور پائیدار عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ شخص جس کے افعال مذکورہ دس رذائل پر مبنی ہوں اپنی قوتوں کو اپنی تخریب پر ضائع کرتا ہے اور اپنی روح کو محفوظ نہیں رکھتا، لیکن وہ شخص جس کے افعال کی محرک ثانی الذکر دس صفات ہوں نہایت دانائی سے صحیح راستہ پر گامزن ہے اور اپنی روح کو برقرار رکھتا ہے۔

ایسا شخص جو مذکورہ بالا دس رذائل کی تنگ دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے تسلیم و رضا کے اصول میں کوئی کشش نہیں پاتا اور تمام روحانی حقائق کی طرف اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ اور حق کی آوازوں پر نیند گزشتہ ہے کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسلیم و رضا کے معنی یہ ہیں کہ ذات کو بالکل مٹا دیا جائے اس کے برعکس وہ شخص جو ان دس آسمانی صفات کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیتا ہے اس اصول کے حسن و شوکت کو بخوبی دیکھ سکے گا، اور اسے جانتا جاوے گا کہ سرچشمہ قرار ہے گا۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ جب بنی نوع انسان نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا تو صنعت و حرفت، تجارت و حکومت غرضکہ زندگی کا ہر شعبہ ہائے پاک و صاف ہو جائے گا اور عمل، مقصد اور ادراک تباہ ہونے کی بجائے خوب بڑھیں گے اور زندگی کی کلفت انجیر کشاکش دور ہو جائے گی۔

شفیع و اکبر

معارفِ محبت

کھو گیا ہوں یہ ان نظاروں میں ڈھونڈتا ہوں تجھے بہاروں میں
 کچھ نہ سمجھا کہ صبح کو غنچے مہنس کے کیا کہ گئے اشاروں میں
 دیکھنا ہے کہ فرش کیوں ہیں گل چھپ کے بیٹھوں کالا زاروں میں
 اوس برسا رہی ہے کیوں موتی کون پھرتا ہے سبز نالوں میں
 بزم کی بزم بے قرار ہے کیوں کون بیٹھا ہے بے قراروں میں
 کھینچے لیتا ہے دل کو اور کوئی یکشش خود ہے ان ستاروں میں
 تیرا ہی گیت گاتی ہے ہر شے کیا ترنم ہے آبشاروں میں
 جب نظر اور اوپر اٹھتی ہے دل نہیں لگتا چاند تاروں میں
 آنسوؤں میں سفینہ دل ہے بہا جاتا ہوں جو بہاروں میں
 تیری ممنون ہر خلش دل کی لطف گلزار کا ہے خاروں میں
 تھے اکیلے نہ صبح کے تارے تُو بھی تھا صبح کے ستاروں میں
 صبح ہوتے ہی کلیں کھلنے لگیں نہ رہا راز، راز داروں میں
 پایا ہر بزم میں تجھے یکتا تُو مگر ایک ہے ہزاروں میں

بندۂ غیبر تو نہیں گویا!

ہوں اگرچہ گنابگاروں میں

گویا جہان آبادی

ایک بالائے مستی کے مصائبِ زندگی

یا سنجیدہ خاتم کاروز ناچہ

اے دوست! کیا تو کبھی آئینے میں اپنا منہ دیکھتا ہے؟ میں تو دیکھتی ہوں! اکثر میں گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہتی ہوں اور غور سے اپنے چہرے کو اس میں دیکھتی ہوں۔ اور حیرت کرتی ہوں! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اُس کو الٹ دیتی ہوں اور غور سے اس کی پشت کو دیکھنے لگتی ہوں! میں وہ راز معلوم کرنا چاہتی ہوں جس کو بد نصیب آئینے کے وجود کا انحصار ہے! مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرخ سینہ دہری آنکھ سے میری طرف دیکھتا ہے۔ گویا وہ مجھ سے واقف ہے اور ہم کلام ہونا چاہتا ہے!

صبح سے شام تک میں ہزاروں سوال آئینہ سے کر لیتی ہوں۔ آہ! اگر کوئی جواب نہیں ملتا! ایک دھواں سا دل میں اٹھتا ہے اور وہیں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ میں کیوں پیدا ہوئی تھی؟ مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں! اب اودھنا جب لوگ میرے کمرے کے پاس سے گذرتے ہیں۔ میری نوکرائی نصیرن اور ملازم رحیم۔ اور مجھ کو آئینہ سے بات کرتا دیکھتے ہیں تو مجھ کو دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں! کیا اس میں کوئی حقیقت ہے؟ ہرگز نہیں! کبھی میں اپنے آپ کو کسی صوفے پر پھینک دیتی ہوں اور اپنے سر کو نرم ٹکیوں میں ڈال دیتی ہوں باوجود اتنی کوشش کے مجھ کو اپنی ہستی کا راز معلوم کرنے میں ناکامی ہوتی ہے! میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی ہو لیکن کیا میں اٹھاسی کی بھی ہو جاؤں گی؟ آہ جس وقت یہ خیال آتا ہے میرے دل میں ایک الجھن اور بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ قدرت کے سر بہتہ بھیدوں کو معلوم کرنے کے لئے دل کی آنکھ زیادہ تجسس ہو جاتی ہے! آہ کیا میں چھیا سٹھ برس کی بھی ہو سکوں گی.....؟ اکثر میں نے آئینہ سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کبھی میں سوتے سوتے چونک پڑتی ہوں اور بے اختیار پوچھنے لگتی ہوں کہ میں ننانوے برس کی کب ہو گئی؟ موجود جانے.....!

دوسرا دن

آج میں ایک خوشنما پھول کے پاس سے گزری تھی۔ وہ ساحلِ دریا پر ایک لہراتے ہوئے شاداب

کے برابر.....! میں خزاں کی پتیوں کو باد پریشاں کے جھومکوں پر دیوانہ وار ناچا دیکھتی ہوں! کاش میں ایک پتیا ہی ہوتی!

یہی نہیں۔ میری خوشیوں کو پامال کرنے کے اور بہت طریقے اُن کو آتے ہیں! آہ! مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ کھاؤ! چنانچہ کل انہوں نے مجھ کو ایک انناس کھلا دیا جس نے میری تمام آندوؤں کا ناس کر دیا! امین! اس کا مزہ اور خوشبو تمام عمر نہیں بھول سکتی!

نیادن!

میرادل دھڑکتا ہے! آج ایک آدمی میرے پاس سے گزرا! وہ سچ مچ پاس سے گزر گیا! میں نے اپنی کھڑکی سے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھیت کے کنائے کنائے جا رہا تھا جہاں میرے خوبصورت گوبھی کے پھول کے پودے لگے ہیں! چلتا ہوا وہ کیسا اچھا معلوم ہوتا تھا! سہت قد اور فربہ جسم بونچے کے باعث اس میں میرے پھول کی بہت مشابہت نظر آتی تھی! خوبصورتی میں وہ خوشنما گوبھی کا عکس معلوم ہوتا تھا! اُس کے ہاتھ میں ایک اسٹول تھا اور اُس کی کمر پر ایک میز لٹکی تھی۔ وہ سنگار کا دھواں اڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے ایک دخانی انجن سے دھواں اٹھتا ہو! اُس کے انداز رفتار میں کیسی دلکشی تھی! کیا میں اس سے محبت کرتی ہوں؟ نہیں کہہ سکتی! ابھی نہیں!.....! محبت ایک نازک پورے کی مانند ہوتی ہے! کوئی اس کو بڑھا نہیں سکتا! آہ! اُس کے گندمی رنگ کے چہرہ پر دوڑتی ہوئی مسکراہٹ ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے دھان کے کھیت پر بھاگتی ہوئی شہابِ ثاقب کی روشنی! میں نے گلدان سے نکال کر ایک گوبھی کا پھول اُس پر پھینکا۔ آہ! مگر وہ اس پر نہ گرا! تب میں نے پیاز کی پتیاں رجن میں رچ جانے کے بعد بھی خوشبو باقی تھی! اُس پر پھینکیں۔ مگر اُن کو ہوا کے ظالم جھونکے اڑا کر لے گئے!

نئی کل!

میری زندگی کے خشک باغ میں آخر بہار آئی! اُجڑے چمن کو محبت کی شگفتگی نے شاد و آباد کر دیا! آج میں نے اُس کو پھر دیکھا.....! اس سے بات کی.....! وہ لہریں مارتے ہوئے دریا کے کنائے اپنے اسٹول پر عالمِ عورت میں بیٹھا تھا۔ اسٹول پر بیٹھا وہ اتنا ہی اچھا معلوم ہو رہا تھا جتنا اپنی نازک شلخ پر سوتا ہوا میرا پسندیدہ پھول اس کے سامنے میز پر تصویر بنانے کا فریم تھا۔ جس میں وہ پہاڑ کے قدموں پر پڑے ہوئے شاہِ بڑ کے خشک سایہ دار درختوں کے نیچے چرتے ہوئے بار برداری کے ایک ایسے کوہستانی چرند ہے

کی تصویر بنارہا تھا جس کے سر سے بے ثباتی دنیا اور گردش افلاک کے باعث سینکڑے لڑگئے ہوں۔ اُس کے ایک ہاتھ میں مقصورہ کا پاپوش برش تھا۔ سامنے کئی قسم کے رنگوں کی کوبرا پالش کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ڈبیاں بھی تھیں! میں نے اُس سے بات کی! اب تو مجھ کو اُس کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا! اُس کا نام.....! میرا دل حرکت کرتا ہے.....! میں لکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں لکھ سکتی.....! پھر کسی وقت.....!

اُس کا نام مرزا گاؤ زبان بیگ تیموری لنگوی ہے.....! وہ کالے اور بادامی رنگوں سے کیسی اچھی تصویر بنارہا تھا.....! میں دیر تک کھڑی دیکھتی رہی! اپنے تئیں سنبھالتے ہوئے میں نے اپنے دل میں اس سے یوں کہا: "اس تصویر کے بنانے کا کیا راز ہے؟ کیا یہ کشمکش وجود کی تصویر ہے جس کو مرقع قدرت کی زیبائش کے لئے تصویر کی مدد سے بنا ہے ہو؟ موجودات عالم کے رازوں کو جاننے والے مصور! مصور! فطرت و غم کے قابل استاد! کیا یہ تصویر بہشت بریں کے کسی نادر و نفیس جانور کی ہے؟ اُس نے پُر معنی طور پر جو "دیا" نہیں! میں نے غور سے دیکھا واقعی اُس کا لہجہ تھا! میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف پُر اسرار نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہمارا راز ہے گا!"

* * * * *

ہر صبح میں دریا کے کنارے مرزا گاؤ زبان بیگ تیموری لنگوی دیکھا پیارا نام ہے، کے پاس جاتی ہوں وہ خاموش تصویر بناتا رہتا ہے۔ میں پاس بیٹھی رہتی ہوں اور اس طرح ہم دونوں باتیں کرتے ہیں! میں جو کچھ سوچتی ہوں۔ جو کچھ پڑھتی ہوں۔ جو کچھ جانتی ہوں! جو کچھ محسوس کرتی ہوں! جو کچھ کھاتی ہوں! جو کچھ پہنتی ہوں! سب حال اُس کو سناتی ہوں۔ وہ بے پروائی کے ساتھ خاموش بیٹھا تصویر بناتا رہتا ہے گویا ہم تن گوش ہے اور میری باتیں سن کر کسی گہرے خیال میں مستغرق ہو گیا ہے!

بعض مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ میری کوئی بات سن ہی نہیں رہا ہے.....! ہم روز اسی طرح باتیں کرتے ہیں!

اس طرح تبادلہ خیالات اور علمی مباحثوں سے مجھ کو اندازہ ہوا ہے کہ اُس کے سامنے میں ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کل میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ "مولا ناروم کی رباعیات میں کوئی خوبی ہے؟" اُس نے جواب دیا "نہیں! علمی تحقیق، علمی گفتگو اور نئی معلومات سے بھی کیسا فائدہ ہوتا ہے!"

* * * * *

آج گاؤ زبان نے مجھ سے نشانی مانگی تھی! میں نے اُس کو خوشی سے اپنے جوتے کا تسمہ نکال کر دے دیا

ما۔ مگر اُس نے کہا: ”نہیں!“ اور منہ کر کے میرا پیروں کا برد چلے گیا! میں اُس کے اس مصلحت آمیز برتاؤ اہوشیدہ سبب سمجھ گئی۔ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اُس کی نظروں میں میری اتنی ہی وقعت ہے جتنی ایک معمولی مخیال جتنی کی نظروں میں ایک میرے کی.....!

اس سے دودن پیشتر! * * * * *

آج صبح اُس نے دوسری نشانی مانگی! میں نے اپنے منہ وچھے سے ایک اشرفی لاکر اُس کو دے دی اور ماکہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ہم دونوں کے پاس اُس کی یادگار رہ سکے! لیکن گاؤں زبان نے کہا ”نہیں!“ میں اُس کے خیالات کا مفہوم سمجھ گئی۔ وہ اشرفی کو اس لئے نہ توڑنا چاہتا تھا کہ ہماری محبت ہمیشہ سالم رہے اور کبھی نہ ٹوٹے! وہ بہت دور اندیش ہے! اب وہ اشرفی کو ہم دونوں کے بدلے اپنے ہی پاس رہنے دے گا!

آج سے بعد * * * * * کل سے پہلے!

آج اُس نے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسری اشرفی بھی ہے؟ اُس کی سادہ باتیں مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں!

نہ آج نہ کل! * * * * *

آج میں نے دوسری اشرفی لاکر اُس کو دے دی! اُس کی خواب آلود آنکھیں محبت کی خوشی سے چمک اٹھیں! اس کے عوض اُس نے مجھ کو تانبے کا ایک مضبوطی سکے دیا ہے۔ گو یا ہماری محبت سونے کی طرح پاک ہے اور تانبے کی طرح مضبوط! میں اس کے اعلیٰ جذبات اور وسیع خیالات کی داد دیتی ہوں!

گزشتہ برسوں کے دودن بعد! * * * * *

مجھ پر خوف طاری ہے کہ میری شادی کا دن قریب آگیا اور منہم نواز خاں آتا ہوگا! مجھے زیادہ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں گاؤں زبان اس کو مار نہ ڈالے! وہ اس قدر خاموش رہتا ہے کہ میں ڈرتی ہوں وہ منہم کا نہ معلوم کیسا شکر کرے! میں کانپتی ہوں!

آنے والی کل سے ایک دن پہلے! * * * * *

میں نے گاؤں زبان سے منہم کے متعلق کہہ دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ سرحدی فوج میں افسر ہے اور یہ کہ اُس سے میری سنگینی ہو چکی ہے۔ پہلے تو گاؤں زبان کو اس کا سننا ہی گوارا نہ تھا! اُس کے چہرے کی گھبراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کو خوف ہے کہ کہیں اُس کو بہت زیادہ غصہ نہ آجائے! چنانچہ اُس نے اپنا سامان سنبھالنا

شروع کر دیا۔ تب میں نے اُس کو سمجھایا کہ معنوم کے آنے میں ابھی عرصہ ہے! اُس کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہونے لگے! اس خیال سے مجھ کو خوشی ہوئی کہ اُس کا غصہ فرو ہوگا!

بالکل نیا دن! * * * *

آہ! معنوم کے آنے میں صرف پندرہ دن رہ گئے! اب زندگی عبث ہے! رات میں نے اپنا خاتمہ کرنے کی کوشش بھر کی تھی۔ اب مجھ کو جینے کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ نایاب شے، محبت، جس کی مجھ کو عرصے سے تلاش تھی مجھ کو مل گئی ہے! میں نے اپنے پلنگ کے پاس بھرے ہوئے کارٹوسوں کا ایک ڈبر رکھ لیا تھا! صبح کو اٹھی تو میں زندہ تھی! وہ بھی میرا کام تمام نہ کر سکے! میں جانتی ہوں اس کا کیا مطلب ہے! اس کے معنی ہیں کہ اب میرا اور گاؤں زبان کا خاتمہ ایک ساتھ ہی ہوگا!

گذشتہ دن سے ایک دن بعد! * * * *

آج میں نے گاؤں زبان سے کہا ہے ہم دونوں کو چاہئے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ اُس نے عجیب نظر سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس نے راتے دی کہ پہلے مجھ کو اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہئے بعد ازاں وہ میری قبر کا جاوہ کش بن کے "بھوک ہڑتال" سے اپنے آپ کو فنا کر دے گا! مگر مجھ کو پسند نہیں کہ وہ اتنی بڑی قربانی کرے! میں نے اُس کو صلح دی ہے کہ تم دریا کے کنارے اپنے گھلے میں پھانسی ڈال لو! میں ہر طرح مدد کے لئے تیار ہوں! وہ اس پر غور کرے گا۔ اگر اُس نے پھانسی نہ ڈالی تو گولی ضرور مارے گا!

بعد ازاں! * * * *

انٹوس گاؤں زبان ابھی زندہ ہے۔ وہ کہنے لگا کہ "میں رسی خریدنا بھول گیا۔" بیچارے نے کئی بار اپنے دل میں گولی ماری۔ مگر ہر بار نشانہ خطا گیا اور گولی سر میں لگی! اور اس کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا!

قبل ازاں! * * * *

گاؤں زبان اور میں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے! اس بارے میں ہماری تمام خودکشی کی کوششیں رائگان گئیں اب ہم معنوم کے آنے سے ایک دن پہلے کہیں باہر چلے جائیں گے! جب وہ آئے گا تو ہم کو نہ پائے گا۔ . . . میں اپنے پیارے کو بھی کے پھولوں اور باغ کی چڑیوں درختوں، پتوں اور مکھیوں کو خدا حافظ کہہ دوں گی!

قیامت خیز شام! * * * *

کس دل سے میں ان واقعات کی تفصیل بیان کروں جن کو میں قلمبند کر رہی ہوں! آہ میرے تعلم کی نیک کاہنتی

ہے! جس بات کا سخت خطرہ تھا آخر وہی ہوئی! اب میں زندہ رہ کر کیا کروں! آہ! پروردگار! کیسا خوفناک بیان ہے! میں اور گاؤں زبان کھڑے تھے۔ میں اُس کو اپنے زیورات کا صندوق دے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی محبت اور زندگی بھی۔ اتنے میں معنوم کو آتے دیکھا! وہ اپنے فوجی لباس میں کیسا شاندار معلوم ہو رہا تھا! پہلی کی طرح یہ خیال میرے دل میں کوند گیا کہ دنیا کیسی بے ثبات ہے اور نا پائیدار! اگر گاؤں زبان نے معنوم کو قتل کر دیا تو ابھی ذرا دیر میں اُس کا خون آلود جسم فرشِ خاک پر ایک بے جان چیز کی مانند خاموش او بے حس و حرکت پڑا ہو گا! میں چلائی، رگ گاؤں زبان بھاگو۔ اگر تم ذرا دیر اور ٹھہرے تو ضرور تم اُس کو قتل کر ڈالو گے!“

گھاؤں زبان نے معنوم کو ہاتھ پکڑا دیکھا۔ اُس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا! میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے وہ بھاگا! جب وہ بھاگ رہا تھا تو کیسا شمع اور رفیع الخیال معلوم ہو رہا تھا! صد آفرین ہے تجھ کو اے بہادر دل ولے انسان! تو نے ایک ہم جنس کی زندگی کو بچانے کے لئے غصہ کی مطلق پروانہ کی اور اس طرح اپنے جذبات کی بڑی قربانی کر دکھائی۔! مگر معنوم نے دوڑ کر اُس کو پکڑ لیا! گاؤں زبان بہادری کے ساتھ لڑنے لگا۔ آہ!

جب دو مرد آپس میں لڑتے ہیں تو کیسا ہیبت ناک نظارہ ہوتا ہے! معنوم نے ذرا دیر میں گاؤں زبان کو اوپر اٹھالیا اور کوٹ سے پکڑ کر اپنے گرد کئی دفعہ گھمایا۔ یہاں تک کہ کوٹ پھٹ گیا اور گاؤں زبان ایک دھماکے کے ساتھ گھاس میں جاگرا! اُس کے گرنے کی آوازیں وہی نغمہ تھا جس کی آواز کے تپھوں پر گرنے سے پیدا ہوتا ہے!

پھر معنوم نے اپنے فوجی بورٹ سے اُس کی لکڑی اس طرح چھوڑا جیسے کوئی شہریر لڑکا مظلوم فٹ بال کو تنگ کرتا ہے! پھر اُس نے تصویر کے تختہ کو اٹھا کر اُس کے سر پر پٹکا! تختہ خج جانے کے باعث اُس کے گلے میں ہار کی طرح آویزاں ہو گیا! آہ! اس وقت گاؤں زبان کیسا بہادر معلوم ہو رہا تھا! اُس کے گلے میں تختہ لٹکا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہادر راجپوت سورما کے گلے میں ڈھال! تب معنوم نے اٹھا کر اُس کو دریا میں پھینک دیا! میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ کنول کے پھول کی طرح پانی پر شیر نے لگا! وہ نظارہ میں کبھی نہ بھولوں گی!!

* * * * *

میری شادی معنوم سے ہو گئی ہے اور اُس نے دہلی میں میرے لئے ایک عالیشان کوٹھی خرید لی ہے!

اب وہ کمانڈران چیف کا ایڈیکانگ مقرر ہو گیا ہے۔ ہاں جس وقت گاؤں زبان کنول کے پھول کی طرح

سطح آب پر تیر رہا تھا اس وقت مغموم ہوٹل جا کر اس کے کمرے سے میرا تمام وہ سامان واپس لے آیا تھا جو سفر کے خیال سے میں نے وہاں بھجوا دیا تھا۔ اب بھی میں سوچتی ہوں تو مجھ کو خیال آتا ہے کہ گارڈز بان گوشتی میں بہتا ہوا جہنا میں جا ملا ہوگا! اور جہنا سے نکل کر گنگا میں پہنچا ہوگا! آخر بہتا بہتا طویل سفر کے بعد خلیج بنگال میں جا ملا ہوگا!

لکھنا لکھ بے خبر نمود زراہ و رسم من نہ لہا“

پاس سے گزرنے والے جہازوں کے مسافر اگر غور سے دیکھتے ہوں گے تو اس میں اب بھی گو بھی کے پھول کی خوبصورتی کا تمام عکس موجود پاتے ہوں گے!!

شاہد حسین بی، اے

ایک کشمیری گیت

ہائے میرا محبوب میری شاخ حیات میں محبت کی آگ لگا کر چپکے سے چلا گیا۔
میری قسمت کا ستارہ اس وقت بلند ہوگا جب میرا محبوب میرے صحن میں آجائے گا۔
میرا محبوب چلا گیا۔ میں اُسے کہاں تلاش کروں۔ اے سکھی اس کو مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ جب میرے باغِ جوانی میں بسنت کے دن آئیں گے تو اس کی بہار کون لوٹے گا؟
ہائے وہ جوانی پھر نہ آئے گی جو تیر کی طرح نکلی جا رہی ہے۔
اس کا جینا کس کام کا جس کے ساتھ اس کا محبوب نہ ہو۔ وہ ہاتھ مل کر کھپتاتے گا کہ ہائے تیر کی طرح میرا جو بن نکل چلا۔

جو مر گئے وہ اس دنیا کی تمام مصیبتوں سے چھوٹ گئے بیٹی کے ساتھ مٹی مل جائیگی۔ ہائے جو بن تیر کی طرح نکل گیا۔
اس جوانی پر غور نہ کرو یہ زمانہ سوچنے کا ہے۔ یہاں سے جانا ہے یہ سوچ کر تیار ہو جو بن تیر کی طرح نکل گیا۔
مندرجہ بالا گیت جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے کشمیر میں بہت مشہور ہے۔ کشتیوں پر ملح، کھیتوں اور کھیلانوں میں کسان اور بوجھ ڈھونے والے مزدور اس گیت کو خوب جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔

اعظم کرپوری

تجلیات

قدر آموزِ وفا خونِ شہیدِ داں ہوگا ہم نہ ہونگے نہ سہی تُو تو لپشیاں ہوگا
 ہر نظر پرودہ بر انداز ہے چھپنے والے تو کہاں جا کے نظر والوں ہی نہیاں ہوگا
 چارہ فراموشی عبث، فکرِ سکوں بے حاصل درد ہی بڑھ کے ہمارے لئے دریاں ہوگا
 موت آئی نہیں اور یاد تری بھول چلی کون اب حالِ دل زار کا پُرساں ہوگا
 پھر بہار آئی کھلے پھول چلی بادِ مراد مژدہ پھرتا جب گر چاک گریباں ہوگا
 اے جنوں ہوش سوازا دیا خوب کیا اب غمِ حبیب نہ اندیشہ داماں ہوگا
 یوں ہواک قطرہ خوں شورشِ محشر بہ کنار دل جسے کہتے ہیں وہ آپ کا اریاں ہوگا

یوں تو دنیا میں ہزاروں ترے دیوانے ہیں

کہیں مجھ سا بھی کوئی بے سرو ساماں ہوگا

تُو جہاں سگیم تاز

بچے اور بوڑھے

ہر شب سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے۔ وہ سب ایک کمرے میں ایک تخت پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے ننھے دماغوں میں آتا بجا کرتے۔ اور دھندلی کھڑکی میں شام کی تیرگی خواب آلود آنکھوں سے انہیں جھانکتی رہتی۔

ہر کوئے سے خاموش سائے اپنے ساتھ عجیب و غریب حکایات اور کہانیاں لئے ہوئے اوپر کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آتے۔

اُن کے دماغ میں جو کچھ آنا کہہ ڈالتے، لیکن اُن کے دماغ میں صرف بہار اور روشنی کی محبت اور امید افزا داستانیں ہی آتی تھیں۔ سارا مستقبل اُن کے لئے ایک مسرت ناک تعطیل کا روشن دن ہوتا تھا۔ الفاظ زبان سے نکلتے تھے۔ نہایت آہستہ۔ ہر گوشیوں کے لباس میں ستورا اور صرف نصف سمجھ میں آتے تھے اُن کے قصوں کی نہ ابتدا ہوتی تھی نہ انتہا، اور نہ اُن میں تسلسل ہوتا تھا۔ بعض اوقات چاروں بچے ایک ساتھ بول اُٹھتے، لیکن ایک کی وجہ سے دوسرا گھبراتا نہ تھا۔

بچے ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ دھندلی سی چاندنی میں، سب سے چھوٹے چار سالہ تان شیک اور سب سے بڑے دس سالہ لوئی کا کی شکلوں میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔

اس شام کو ایک ایسی خبر جسے وہ نہ سمجھ سکتے تھے ایک ایسے مقام سے جسے وہ نہ جانتے تھے اس فردوسی فضا میں پہنچی اور اُس نے کہانیوں اور لطیفوں کا خاتمہ کر دیا۔ ڈاک سے انہیں یہ خبر ملی تھی کہ اُن کا باپ سرزمین اطالیہ میں چل بسا۔

”لیکن وہ کب واپس آئیں گے؟ تان شیک نے تعجب سے پوچھا۔

لوئی کا نے اُسے کہنی مارتے ہوئے مغموم لہجہ میں جواب دیا: ”وہ کس طرح واپس آ سکتے ہیں جب کہ وہ خدا کے ہاں چلے گئے؟“

یژن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے

اور اُس کے آگے کچھ نہ دیکھ سکتے تھے۔

”میں بھی جنگ پر جا رہا ہوں“ میٹی جی نے بلا غور و خوض زور سے چلا کر کہا۔

”تم ابھی بہت چھوٹے ہو“ تان شیک لہجہ میں بولا۔

سب سے زیادہ لاغر، نازک اندام اور نحیف ملک نے، جو اپنی ماں کے بڑے دو سالے میں لپٹی ہوئی تھی،

اور ایک مسافر کی گٹھری معلوم ہوتی تھی، اپنے نرم اور دھیسے لہجہ میں کسی پوشیدہ مقام سے پوچھا ”جنگ کیسی

ہوتی ہے، مجھے بھی بتاؤ میٹی جی“

میٹی جی نے مطلب یوں سمجھا یا: ”سنو جنگ اس طرح کی ہوتی ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے

پر چاقو سے حملے کرتے ہیں، تلواروں سے قتل کرتے ہیں اور بند و قوں سے مارنے ہیں۔ جتنا زیادہ کوئی مارے اور

قتل کرے اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہی جنگ ہے“

”لیکن وہ لوگ کیوں قتل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہیں؟“ ملک نے پوچھا۔

”شہنشاہ کے لئے“ میٹی جی نے کہا۔ اور سب چپ ہو گئے۔

پھر فوراً ہی میٹی جی نے اپنے خیالات یکجا کئے: تاکہ اُس خاموشی کو دور کرے جو اس وقت ان پر

بارگزر رہی تھی۔

”میں بھی دشمن کے خلاف لڑائی پر جا رہا ہوں“

”دشمن کیسا ہوتا ہے؟ کیا اُس کے سینک ہوتے ہیں؟“ ملک کی کمزور آواز نے فوراً سوال کیا۔

”درحقیقت اُس کے سینک ہوتے ہیں۔ ورنہ پھر وہ دشمن کیسے ہو سکتا؟“ تان شیک نے منت

اور کسی قدر غصہ سے جواب دیا۔ اور اب خود میٹی جی بھی صحیح جواب نہ جانتا تھا۔

”میں نہیں سمجھتا۔“ کہ اس کے سینک ہوتے ہیں۔ ”اُس نے رکتے رکتے آہستہ سے کہا۔

”اُس کے سینک کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ ہماری طرح ایک انسان ہے، لوئی کاٹنے کا۔

”مگر صرف یہ بات ہے کہ اس میں روح نہیں ہوتی“

”و چند لمحوں کے بعد تان شیک نے پوچھا۔ ”لیکن جنگ میں آدمی خدا کے ہاں کیسے چلا جاتا ہے؟“

”لوگ اُسے جان سے مار ڈالتے ہیں،“ میٹی جی نے جواب دیا،

”اور تان شیک نے میرے لئے ایک صندوق لانے کا وعدہ کیا تھا“ تان شیک انگلیں لہجہ میں بولا۔

”وہ بندوق کیلے لاسکتے ہیں، جب کہ خدا کے ہاں چلے گئے“، لونی کانے کسی قدر سختی سے پوچھا
 ”اور لوگوں نے انہیں جان سے مار ڈالا؟“ تان شیک نے سوال کیا۔
 ”ہاں جان سے“، لونی کانے جواب دیا۔

معصومیت اور بچپن سے آلودہ اور حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں میں سے سکوت اور غم تاریکی میں گھونرے
 لگا۔ کسی نامعلوم فضا میں — دماغ اور دل میں محسوس نہ ہونے والی فضا میں۔

اس وقت جھونپڑے سے باہر ایک بچہ پران کی دادی اور دادا بیٹھے تھے۔ آفتاب کی آخری
 سرخ اور سنہری شعاعیں گھنے درختوں میں سے گذر کر باغ میں آ رہی تھیں۔ شام نہایت پرسکون تھی، مگر ایک
 مسلسل رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً یہ بچوں کی جوان ماں کے گریہ و بکا کی آواز تھی۔ دونوں بڑھئی
 جانیں مکرخمیدہ ایک دوسرے سے ملی بیٹھی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ اس طرح پکڑے ہوئے تھے
 جیسے عرصہ دراز کے بعد یہ موقع ملا ہو۔ وہ دونوں آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، ان کی آنکھیں آنسوؤں
 سے محروم تھیں اور وہ کچھ نہ بول سکتے تھے۔

مختصر عابدی

غم خوشی کے نقش قدم پر رو بے پاؤں چلتا ہے۔

خیال عمل کی روح ہے۔

قسمت ممکنات پر سنہستی ہے۔

انسان فانی ہے مگر غم ابدی۔

بہترین استاد وقت ہے، بہترین کتاب دنیا۔

نیکی کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اُسے صحیح طریق پر کرنا چاہیئے

چالاک آدمی اچھے ہوتے ہیں مگر بہترین نہیں ہوتے۔

ہر پہلو میں ایک ہی دل ہے۔

غزلیات

جی سے جانا ہی ہوش میں آنا مجھ سے کہتی ہے بخودی میری
 غش بھی آتا نہیں خبر لینے کتنی بے کس ہے کسی میری
 قصہ غم دراز ہے میرا اور کوتاہ زندگی میری
 بن گئے وہ عدد کی بمع روٹ موت ہے اب تو زندگی میری
 کون ان کو منا کے لے آئے مجھ سے روٹھی ہے زندگی میری
 بھول کر آگئے ہو زبست پر دیکھتے جاؤ بے کسی میری
 دل کو نا لے میں ات کو آس یوں ہی کھتی ہے زندگی میری
 خاک سمجھے گا مدعی شائق

اک مست ہے شاعری میری

سید محمد کاظم علی شائق

کسی صورت مجھے قرار نہیں طاقت درد انتظار نہیں
 کون سی چیز ہے جو دنیا میں مست صہبائے حسن بیا رہیں
 طور پر حسن کی جھلک سی ہے برق مضطرب نہیں شرار نہیں
 کہہ رہی ہر خزاں کی پامالی رنگ ہستی کا اعتبار نہیں
 جب شگفتہ نہ ہو کلی دل کی لطف رعنائی بہار نہیں
 ہاتے دشت جنوں کی فیرنی آبلہ پاموں اور خار نہیں

دعویٰ عشق ہے غلط تہمت

دل اگر رشک لالہ زار نہیں

محی الدین تنہا

بہار گلشن ہستی کا اعتبار نہیں خزاں نہیں ہر اگر آجکل بہار نہیں
 طے ہیں سب کی نشانی میں باغ نامی وہ کونسی ہے ترنا جو یاد گار نہیں
 بنا گئی نگہ و آس میں راز فرقت وہ آنکھ ہاتے جواب ہوا انتظار نہیں
 عدم ہواں مجھے لائی مجھے آزادی جہاں کہ اپنی طبیعت اختیار نہیں
 ہونے دوش پر کھی ہو خاک کھٹے شہید عشق کا لاشہ زیر پا نہیں
 دفا کا حمد وہ کرنے میں مج سے میں چاہوں
 نگاہ یاس نہ کہنے کہ عنت بجا نہیں

علی حسنین تیار دلولوی

جان و دل ہم تیار کرتے ہیں اس طرح ان کو پیا کر کرتے ہیں
 ان سے امید، وفا کی نہیں دل جو لے کر فگار کرتے ہیں
 تیرے طعنوں کے یہ رقیب آخر کیوں مے دل کے پار کرتے ہیں
 آبلے دیکھ اپنے وحشی کے یہ خزاں کو بہار کرتے ہیں
 کر کے وعدہ بھی یہ جواب آیا

آپ کیوں انتظار کرتے ہیں

اندرجیت شرما

مدعی ہے کہ عاشقی میری دشمنی ہے کہ دوستی میری
 میں اڑاتا تھا چٹکیوں میں نہیں اب اڑاتے ہیں وہ ہنسی میری

محفلِ ادب

ادیب آقا ہے یا غلام؟

جب یونانیوں کی آزادی چھین گئی اور رومی اُن پر حکمران ہو گئے تو ادب آقاؤں کے دعب سے گر کر غلامی کے دعب پر آ گیا۔ یونانی ادب فلسفہ کے مالک اور ڈرامے کے بانی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کو اس نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ قوم کی اصلاح کے طریقے نکالنے، اس کی حکومتوں کو منظم کرنے، اس کے اخلاق کی سطح کو بلند کرنے اور اُسے ترقی کی طرف لے جانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ تم ارسطو یا افلاطون کا مطالعہ کرو تو ان میں سے ہر ایک کو ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعیت کی دشواریوں کو دور کرنے کی فکر میں مبتلا پاؤ گے جو دل سے چاہتا ہے کہ اُن کے اخلاق وسیع اور ان کی حکومتیں با نظم ہو جائیں۔ تم ان میں سے کسی کو بھی ایک غلام کی طرح نہیں پاؤ گے جو عوام سے چاپلوسی کرے۔ قوم کو دھوکے میں رکھے اور اُن کی برائیوں کو بھی اچھا بتائے۔

بہر حال جب رومی یونانیوں پر غالب آ گئے اور انہیں یونانی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بچوں کو اس کی تعلیم دینے کی خواہشات بڑھنے لگیں تو رومی اس مقصد کے لئے کثرت سے یونانی غلام خریدے اور اپنی اولاد کو اُن کے سپرد کرنے لگے۔ اور اس طرح یونانی اہل ادب غلام ہو کر رومی بچوں کے استاد بن گئے۔ یہ شاگرد اپنے معلم کی باتیں ضرور مانتے اور اس کی نصیحتیں بھی قبول کرتے۔ لیکن اسی طرح جیسے ہم اپنے ڈرائیور کی بات مان لیتے ہیں جب وہ ہم کو قریب ترین راستہ بتاتا ہے یا جس طرح ہم اُس قلی کی رستے پر چلتے ہیں جو ہمارا اسباب اٹھائے ہم کو ریل پر سولہ کرانے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی وقتی اطاعت اور ایک قسم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا ضمیر کتنا رہتا ہے کہ ہم ان دونوں سے بالا و بزر ہیں۔ اس حالت کا اثر لازمی طور پر معلم پر بھی ہوا اور اُس نے محسوس کیا کہ اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں تعلیم دینے اور بات بات پر ٹوکنے والا استاد ہونے کے بجائے ایک خوش باش مصاحب ہونا زیادہ ضروری ہے۔

پھر ازمنہ و سلی کا دور آیا جس میں عرب اور اہل فرنگ مذہبی پیشوا خلیفہ یا پوپ کے خود مختار نظام حکومت کے لحاظ سے اور ادب کی یک رنگی کے اعتبار سے تقریباً برابر ہو گئے اور دونوں کا ادب مذہبی اور دنیاوی آقاؤں

کی خوشامد میں آقا ئی رتبے سے سگر کر غلامی کے درجے میں آگیا۔ علاوہ انہیں اس دور میں ادب اور دو بڑی قسموں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک قسم دینی ضروریات کو پورا کرتی، دوسری ضروریات زندگی کو۔

ادب کا جو حصہ ضروریات زندگی کے لئے وقف تھا وہ آقا ئی کے اُس بلند مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا جو قدیم یونانی اہل قلم کا مرکز تھا بلکہ غلامی کے اُس درجے میں اترا یا جس میں یونانی ادیب غلام ہو کر اتر آتے تھے۔ بنی عباس کے زمانے میں جس طرح بغداد میں نیم کو غلاموں کی ایک بڑی جماعت ملے گی جس نے ادب حاصل کر کے اپنی ساری عمر اپنے آقاؤں کی مدح گوئی میں صرف کر دی اسی طرح انہیں ایام میں اٹلی میں بھی تم ہرامیر کے پاس ایک شاعر کو اُس کی مدح سرائی میں رطب اللسان پاؤ گے۔ غرض کہ ازمنہ وسطیٰ میں مشرق اور مغرب کے تمام اہل ادب اسی رنگ پر جا رہے تھے اور اس خیال نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی کہ اُن کی سب سے بڑی مهم اور اُن کا سب سے اہم فرض دولت مندوں اور آقاؤں کو خوش کرنے تک محدود ہے۔ یہاں تک کہ وہ قوت آگیا کہ ادب امر کے اثر سے ایک حد تک آزاد ہو گیا اور اہل ادب کو امر کی مدح سرائی سے نجات ملی۔ لیکن اب انہوں نے اپنے ناظرین کو محظوظ اور مسرور کرنا اپنا فرض قرار دے لیا اور اس طرح حریری اور ہمدانی جیسے خوش گویند اور نقالوں کی خاصی تعداد پیدا ہو گئی جس نے الفاظ کے ذریعے سے وہی کر دکھا یا جو مجلسوں میں لوگوں کا دل بہلائے اور بہنہ لانے کے لئے بھڑپتے اور بھانڈ اپنے حرکات کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔

بعد ازاں یورپ کی سیدارمی اور ترقی کا دور آیا اور اُس نے قدیم ادب کے ناخداؤں کو زندہ کرنا اور دانا ادب کو غلامی کے گرو وغبار سے پاک کرنا شروع کیا۔ آخر میں یورپ کے جدید ادب میں آقا ئی کا رنگ جھلکنے لگا اس دور کا انشا پر داز تم کو بہنہ لانے کے لئے مہتا ہے سامنے نہ چوپائے کا روپ بھر کر آسکتا ہے اور نہ تم کو خوش کرنے کے واسطے بھانڈ پن دکھا سکتا ہے بلکہ وہ تم کو اس حقیقی دنیا کے ایسے سبقوں سے آشنا کرتا ہے جن سے تم کو بسا اوقات درد مند بنادیتا ہے اور تم اسی درد مندی میں لذت اور مزاحموس کرتے ہو کیونکہ تم کو اس طرح درد مند بنانے سے انشا پر داز کا مقصد محض مہمتیں صاحب بصیرت اور روشن ضمیر بنانا ہے جس سے مہتا ہے لئے اس دنیا میں احتیاط کے ساتھ ترقی کرنے کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

مگر ہم میں اب تک اہل قلم کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بہ نسبت آقاؤں کے غلاموں کے مرکز سے زیادہ قریب ہے جس کی ساری ہمت شوخی نقالی اور گراں ذیل الفاظ تک محدود ہے۔ میں بعض خاص حالات میں لفظی آرائش اور مرعوب کرنیے والی صنعت ترمیم کے فائدوں سے انکار نہیں کرتا۔ اگرچہ میں خوب جانتا ہوں کہ سونے کا

کتور اسادہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ایک حسین و جمیل مہتی لباس سے عریاں اور برہنہ ہو کر ہی زیادہ جاذبِ نظر اور فتنہ انگیز دکھائی پڑتی ہے اور ریشمی کپڑا نقش و نگار کے بغیر ہی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے، لیکن سونا اور ریشم ہر شخص کو دستیاب نہیں ہو سکتا اور سینکڑوں عورتوں میں شاید ہی ایک دو کے جسم کی بناوٹ ایسی ہو جو عریانی میں زیادہ حسین و جمیل معلوم ہوتی ہوں چونکہ کوئی سادہ چیز اُس وقت تک بھلی نہیں معلوم ہوتی جب تک کہ وہ کسی مادہ سے اعلیٰ طرز کی نہ بنی ہو اور لغت ہماری ہر ضرورت کو سادہ اور حسین مادہ سے اعلیٰ طرز پر پورا نہیں کر سکتا اس لئے ہم کو کبھی کبھی لفظی نقش و نگار اور اچھوتا اسلوب بیان اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کا بالکل مخالف ہوں کہ انشا پرداز کی ساری ہمت صرف الفاظ کی ندرت، عبارت کی شگفتگی اور طرز بیان کی شوخی پر صرف ہو جائے۔ اور وہ اپنے ناظرین کے سامنے ایک غلام کے رتبے میں رہ جائے جو صرف ان کو مسرور کرنے اور راضی رکھنے پر قناعت کر لے۔ میری تمنا ہے کہ ہر ادیب اپنے آپ کو آقاؤں کے درجہ میں رکھے اور اپنے ناظرین کا فائدہ اُن کی تعلیم اور اُن کی رہنمائی اس کو مد نظر ہے۔ مگر یہ رتبہ وہی ادیب حاصل کر سکتا ہے جو عالم موجودات میں اپنی بصیرت اور بصارت کو کافی وسعت دے۔ اور وسعتِ نظر اسی انشا پرداز کو نصیب ہو سکتی ہے جو انسان اور اس کی تاریخ، اس کی اصلیت، اس کے حاضر و مستقبل، اس کے رسم و رواج، اس کی جہالتوں، اس کے قصے کہانیوں، اس کے علوم و آداب اور اس کی تہذیب و تمدن کا مسلسل اور گہرا مطالعہ کرے۔

یہی چیزیں ایک ادیب کا موضوع ہیں اور ہر ادیب پر لازم ہے کہ خود ان کی تعلیم حاصل کرے اور اپنے ناظرین کے سامنے انہی کو پیش کرے تاکہ اُس کا ادب غلاموں کے ادب سے ممتاز ہو کر آقاؤں کا ادب ہو جائے۔

(سلامہ موسیٰ مصری)

”ادبی دنیا“

کیفیات

کوئی نہیں پچتائے والا	مر جائے مر جانے والا
محفل میں بیٹھے گا کیوں کر	خلوت میں شرمائے والا
میں روکوں لیکن کیا روکوں	جائے گا گھر جانے والا
صبر مرا بے کار نہ جائے	تڑپے وہ تڑپانے والا
اپنا دل ہلاؤں کس سے	ہے کون آنے جانے والا

وہ نہ ملیں مجھ کو مل جائے کوئی جی بہلانے والا
ہم نہ کریں گے ترکِ محبت سمجھا کیا سمجھانے والا
دل وہ شے جو جس کا شاکی کھونے والا پانے والا
سب سے مشکل بات یہی ہے زندہ ہو مر جانے والا
کیا سمجھے اسرارِ محبت دل دے کر بچپانے والا
جان مری ہے جانے والی دل ہے اُن پر آنے والا
پھولوں کا مرجھانا، دیکھے کلیوں پر اتر آنے والا
کب سنتا ہے میری آہیں باتوں سے گھبرانے والا
یامیں ہوں یا میرا دل ہے روز نیا غم پانے والا

نوح مرا کافی یہ پتہ ہے
وہ طوفان اٹھانے والا

”چمن“

گرمی

کالے کالے بھونرے پھر کنول کے پتوں کے نیچے سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے! اور بزبطوں
کی سرخ چونچلوں میں پکے پکے شہتوت نظر آ رہے ہیں۔
اونچے اونچے پہاڑوں پر اب وہ سبزی نظر نہیں آتی۔ بادامی رنگت کی گھاس اُگی ہوئی ہے۔
جنگلوں کے ریلے پھولوں پر شہد کی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور بجریاں پہاڑوں کے دامن میں سوکھی
گھاس چباتی نظر آتی ہے۔
گرمی کے دن آگئے! — وہ دن جو شاعر کے خواب کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں اور مشک کی طرح
گرم ہوتے ہیں۔

اومعبود! معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشنیاں پیدا ہونے کے دن ہیں! کہ ہر طرف اک محبوب نور برس رہا ہے!

جیسے درِ فردوس پر برس رہا ہو +
گھرے نیلے آسمانوں سے اک روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ جو سمندر، پہاڑ اور پوری زمین کو چمکا رہی ہے +

گرمی کے دن آگئے!
پھر آفتاب بلند ہو ہو کے چمکے گا۔ پھر جنگلوں میں خرگوش خوش ہو ہو کے ناچیں گے!
دوست! دیکھو۔ گرمیوں کے شفاف آسمان پر ستارہ کیسا جگمگا رہا ہے جیسے کم سن بہن کی آنکھ میں روشنی کا نپ رہی ہو۔

خو نصورت پرندوں کے پروں پر آفتاب کی تیز کرنیں کیسی پھیل رہی ہیں! جیسے ہلکی ہلکی برف پہاڑوں پر سے پھسل رہی ہو۔
گرمی کے دن آگئے +

ہر طرف اک نور کا دریا لہریں مار رہا ہے +

”تہذیبِ نسواں“

سمندر کی آخری تان

شہرت و اقتدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں نا آشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کر کے میری نظر کے سامنے ہیں جو ان چیزوں میں بے ہوئے ہیں۔ منہس بول کر جیتے اور زندگی کو ساز و شرت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلائے! اب یاس و حواں، ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے سفیر بن گئے ہیں۔ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رو رو کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تاہم کھٹکے ہوئے پاؤں نیند کی طرح مجھ پر چھا جائے، ہو اکی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پرواز روح پر ٹوٹ جائے“ (شیلی)

”محبکہ عثمانیہ“

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ اسلام۔ یہ کتاب عہدِ حاضر کے مشہور ادیب اور مورخ علامہ محی الدین خیاط مصری کی مستند اور جامع تاریخِ اسلام کا اردو ترجمہ ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فلسفہٴ تاریخ کی ماہیت، تاریخ کے مآخذ اور رسولِ کریم صلعم کے سوانحِ درج ہیں۔ دوسرے حصے میں خلفائے راشدین کے حالات میں تیسرا حصہ خلافتِ بنی امیہ کے حالات ہیں ہے، چوتھا حصہ خلافتِ بنی عباس اور پانچواں تاریخِ اندلس پر مشتمل ہے۔ ترجمہ مولانا مولوی ابوالمحمود محمد حاد خاں صاحب فاضلِ ادبیات نے کیا ہے۔ زبان ایسی سلیس اور عام فہم ہے، کہ عورتیں اور بچے بھی براہِ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اصل کتاب قریب قریب تمام ممالکِ اسلامیہ میں بطورِ نصابِ تاریخ رائج ہے، اور یہ اُس کے مستند اور مفید ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ کتابتِ طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ ہر حصے میں ضروری نکتے بھی شامل کئے گئے ہیں قیمتِ مع محصول پانچ روپے مقرر ہے۔ مدارسِ اسلامیہ اگر بطورِ نصاب لکچ کرنا چاہیں تو ان کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ میجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

اربابِ شرِ اردو، از مولوی سید محمد صاحب قادیانی، اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو شرفیوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس موضوع پر پہلی کتاب ہے، قابلِ ہولف نے اسے نہایت محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا ہے۔ سو اسو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا کہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ چند ادا کو اکٹھا کر کے ان سے انگریز اہلکاروں کے لئے آسان زبان میں درسی کتابیں لکھوائی جائیں چنانچہ شرِ اردو کے یہ ارباب ملک کے مختلف حصوں سے یہاں جمع ہوئے اور انہوں نے قصص، تاریخ، قواعدِ زبان، اظہارِ اور مذہب پر ایسی ایسی کتابیں لکھیں کہ اردو شر کی بنیاد قائم ہو گئی۔ اس تذکرہ میں تقریباً میں ایسے اربابِ شر کے حالات اور ان کے کارناموں کی تنقید درج ہے اور ہمارے خیال میں تاریخِ ادبیاتِ اردو کا یہ ایک اہم باب ہے، لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی کتاب بہت اچھی ہے۔ حجم ۳۰ صفحات مجلد کی قیمت دو روپے۔ مکتبہٴ ابراہیمیہ امداد باہمی سٹیوین روڈ حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

چمنستان۔ اس نام کا ایک نیا مصورا دینی رسالہ ماہِ اگست سے مولوی محمد فضل خاں صاحب اور سید ظفر ہاشمی صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ دوسرا نمبر اسے سامنے جس میں نظم و نثر کے نہایت شستہ نمونے جمع کئے گئے ہیں ایک رنگین ایک بک نمک تصویر بھی رسالہ کی زیرِ قلم، حجم ۲۴ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے۔ سینئر چمنستان "اموت سرے منگاتیے۔

حشر و خبر ای ۱۳۶۳
اٹھوا گر نہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی

دوڑ وازمانہ چال قیامت کی علی گیب

دہلیوں

يَا كَارِعِلَا وَصِيْرُ أَنْبِيَا حَبِشِينَ مِيَا مُحَمَّدِيَا وَصَاهِبَايَا مَرْمُ

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

فأما

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی، اے (اکسن) بیرسٹر ایٹ لار

حامد علی خاں - جی، اے

جائنت ایدیتھ

فہرست مضامین

جلد ۱۶

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء شروع

تصویر :- داستان گو

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	رباعیات	بشیر احمد	۸۲۱
۲	جہاں نما		۸۲۲
۳	افسانہ	منصور احمد	۸۲۶
۴	تصویر :- داستان گو		
۵	اکبر اعظم	جناب لانا سید حسن صاحب بنی ہلے، ایل ایل بی (علیگ) ایڈووکیٹ	۸۲۷
۶	پیران سالوس (رباعیات)	حضرت جوش ملیح آبادی	۸۳۲
۷	طنز و شاعری	جناب لانا فضا احمد صاحب بدایونی، ایم اے (علیگ)	۸۳۳
۸	مسافر	فلک پیم	۸۳۹
۹	درس عمل (قطعہ)	جناب حکیم آزاد انصاری مدظلہ العالی	۸۴۵
۱۰	مبادی سیاسیات	جناب مولانا مارون خاں صاحب شروانی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ	۸۴۶
۱۱	تقاضائے وفا (نظم)	حضرت اکبر سروری لکھنوی	۸۵۹
۱۲	جزیرہ جادو	جناب مولوی محمد امجدی صاحب صدیقی (علیگ)	۸۶۰
۱۳	میں حیران ہوں!	جناب فیاض محمود صاحب گیلانی بی اے	۸۶۳
۱۴	جام مصبائی (رباعیات)	جناب عبد السمیع صاحب پال آٹھ صبیانی، ایم اے ایل ایل بی	۸۶۶
۱۵	دیوار پر چہرہ (افسانہ)	حامد علی خان	۸۶۷
۱۶	غزل	حضرت ذوقی	۸۶۸
۱۷	نیند کا غلہ (افسانہ)	جناب سید مشتاق شرف صاحب قادری	۸۷۲
۱۸	تراژ گویا (نظم)	جناب خضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی	۸۸۱
۱۹	دولت یا محبت (افسانہ)	منصور احمد	۸۸۳
۲۰	غزلیات	حضرت صفدر، زریا، پرش، شہاب	۸۸۶
۲۱	مختل ادب		۸۸۷
۲۲	مطبوعات جدیدہ		۸۹۲

رباعیات

(۱)
ہم وہ ہیں کہ فاشی سخن ہے ہم کو
خلوت ہی ہماری انہیں ہے ہم کو
وہیلے کیسے ہے اپنی دنیا بے خیال
ویرانہ ہی ویرانہ وطن ہے ہم کو

(۲)
کوچھ بھی بیاں ہو شک و ترس میں جو ہو
کوچھ بھی کہیں ہے بحر و بر میں جو ہو
انسان کی روح میں ہے ایک ایک علم
کیا کچھ نہیں سب کچھ ہے شکر میں جو ہو

(۳)
آواز گشت ہے کوئی نہ کوئی آبادی
بر بند ہے کوئی نہ کوئی آزادی
پاکیتی ہے ادق سے جس کی فریاد
ظلمت میں ہے کوئی نہ کوئی فریادی

(۴)
گوش میں ہے جو تودہ سپاہ بن
اپنے ہی فلک کی ٹوٹ اوتارہ بن
پر وہ ہے جس ہ میں کچھ آرام نہیں
منزل پہ پہنچنا ہے تو آوارہ بن

جہاں نما

شناقا

امریکا کے تعلیمی طریقوں میں ہمیشہ یہ مقصد ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو تقویت پہنچائیں اور سب لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ ایشیا اور یورپ کے بالمقابل امریکا کو جمہوریت کی نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ یہاں ہندوئیت میں ہم جمہوریت کے اُس عظیم الشان کارخانے کا تصور بھی اپنے دماغوں میں نہیں لاسکتے جس کے ماتحت بدرہل کے امتداد اور ریاست کے عمدہ دار بھی عوام کی رلے سے منتخب ہوتے ہیں۔ مگر امریکا میں عام انتخاب کا دستور جاری ہونے سے پہلے ہی تعلیم عام ہو چکی تھی۔ حکومت ہند ملک کی تعلیم پر کل ۸۰ لاکھ روپیہ خرچ کرتی ہے لیکن امریکا میں صرف ایک یونیورسٹی پر ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے۔

بہت دیر تک امریکا کے تعلیمی طریقے بھی انگریزی امارت کی روایات سے متاثر رہے۔ لیکن امریکا نے نئے آئین و ضوابط کی سرزمین ہے اور وہاں کی جدید جامعات نئی ذہنیت کی پیداوار اور ملک کے جمہوری آئین و روایات اور عادات کا نتیجہ ہیں۔

امریکا میں صرف مدرسے اور کالج ہی ایسے ادارات نہیں ہیں جو لوگوں کی تہذیب و تربیت کا کام کر رہے ہیں، بلکہ میسڈوں اور ایسے طریقے ہیں جن سے امریکا عام تعلیم اور مدنی علم کو اپنے کروڑوں فرزندوں کے لئے پھیلا رہا ہے۔ ان تمام طریقوں میں شناقا غالباً سب سے حیرت انگیز ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے شناقا محض نیویارک کی ایک جھیل کا نام تھا۔ لیکن آج یہ لفظ اُس بُرست ترین مدنی طاقت کی نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعہ سے دیہاتی اور رقبہ جاتی آبادی کو دنیا کی موجودہ عظیم الشان دماغی ترقیات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

نصف صدی گزر چکی ہے کہ امریکہ کے بعض بڑے بڑے معلموں اور شہریوں نے جھیل شناقا کے چرچہ فضا کناروں پر گرمیاں گزارنے کے لئے اپنے خیمے گاڑے۔ تقریروں، انصا بوں اور مختلف قسم کی دلچسپیوں کا اہتمام کیا گیا، اور بڑی عمر کے آدمی اور کاروباری لوگ جو اوائل عرصہ کالج کی تعلیم سے محروم رہ گئے تھے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آنے لگے۔ تقریریں ہر مضمون کے متعلق ہوتی تھیں اور طالب علم کو علم کے جس کسی شعبہ سے دلچسپی

ہوتی وہ اس کا مطالعہ کر سکتا تھا۔ معلمین کا طرزِ بیان نہایت آسان ہوتا تھا اور کتابیں ان تقریروں کا نہایت موزون و مناسب ضمیمہ ہوتی تھیں۔ رات کو نلج راگ اور دوسرے کھیل تماشے ہوتے تھے اور ہر شخص اپنے ذاتی کے مطابق ان میں حصہ لے سکتا تھا۔ بعد میں اسی جھیل کا نام جس کے بلوریں پانیوں کے کنارے یہ لوگ آجمع ہوئے تھے اس نئی عضویت کو دے دیا گیا۔

امریکن، ہندوستانیوں کے برعکس نئے خیالات کو قبول کرنے میں ہمیشہ تیار رہے ہیں۔ ہر نئی بات انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے چنانچہ شتاوا کا طریقہ تعلیم تمام جمہوریہ میں نہایت سرعت سے پھیلا۔ آج جس قصبے اور جس گاؤں میں جاؤ شتاوا کی روشنی ہزاروں گھروں کو منور کرتی نظر آتی ہے۔

موجودہ شتاوا ایک مختلف چیز ہے۔ اس نے اب کتابی اور انفرادی تعلیم کی منزل سے گزر کر ایک سالانہ قومی میلے کے خطبات، راگ اور ناٹک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ڈاکٹر سدھندرا بوس اس کے موجودہ مقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں:-

”شتاوا کا ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار کرنا بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا مقصد قلب کو وسیع کرنا ہے اور اس لئے اس میں اسفار، ادبیات اور سائنس پر خطبات پڑھے جاتے ہیں۔ پھر زندگی کے لطیف رخ کو بھی اس وقت تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جب تک نیا میں محسوسیت، شاعری اور آرٹ کا وجود ہے۔ ہر شخص کے لئے یہاں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ مذہب، تعلیم، تفریح ان تینوں کا نام شتاوا ہے۔ لوگ روزانہ زندگی کے بار آور فرائض یک قلم اتار کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور شتاوا میں آ شامل ہوتے ہیں۔ تفکر و تدبر کے لئے، سیر اور نظائے کے لئے، تفریح و تہنہ کے لئے اور اس طرح وہ اپنے قلب اور جسم کو سکون دیتے اور تازہ دم ہونے کے لئے ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں۔“

جدید شتاوا کے جلدی مسلسل دس روز تک جاری رہتے ہیں صبح سیاسی، مذہبی اور ادبی موضوعات کی تقاریر کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ بچے کھیلتے ہیں تیسرے پہر موسیقی شروع ہوتی ہے اور نمدانی اور مین الا قوامی مسائل پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ شیکسپیر کے کھیل، رقص اور دوسری تفریحات رات کے پروگرام میں شامل ہوتی ہیں۔

لیکن امریکا کے رہبرانِ تعلیم نے محسوس کیا ہے کہ صرف ایک یا دو بڑے بڑے مقامات پر ایسی تقریریں اور نمائشیں کافی نہیں ہیں کیونکہ اس طرح جمہور کا ایک نہایت قلیل تناسب ان میں حصہ لے سکتا ہے۔

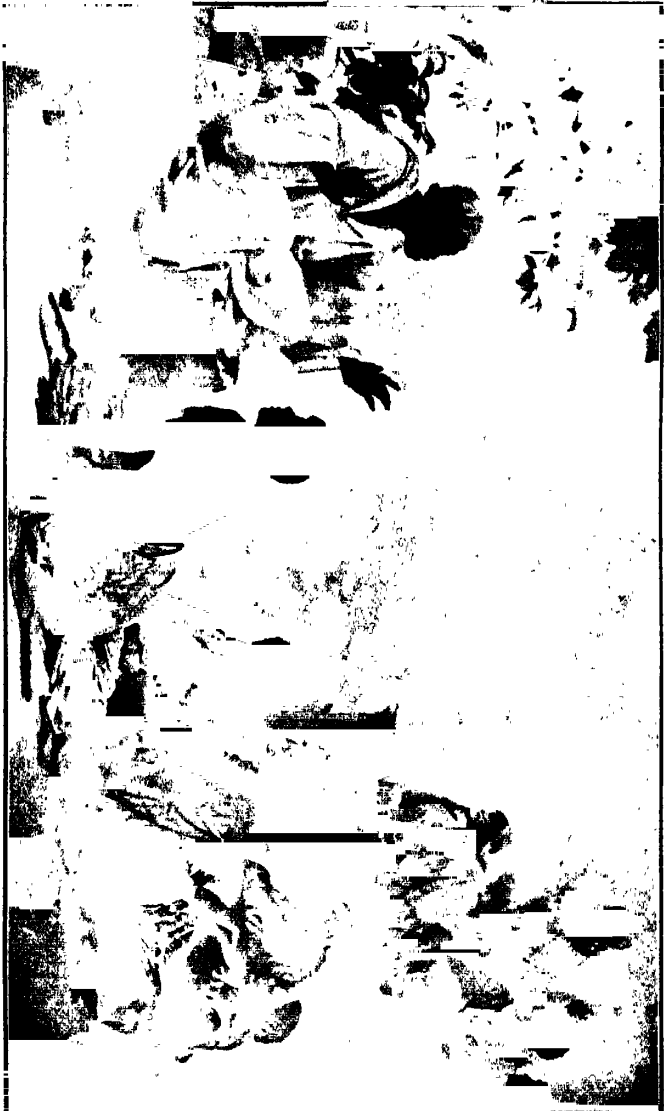
ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے، چنانچہ ہر بات میں اُن کے پیش نظر حضرت مسیح کا نمونہ ہوتا ہے، ان کی کوئی جائیداد نہیں ہے اور وہ اپنی خدات کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔ ان کے اخراجات مشترک ہیں اور وہ معاشرہ کے غریب ترین افراد کے پہلو پہ چلو بہتے ہیں، اپنے گھروں کا کام خود کرتے ہیں، جھاڑو دیتے ہیں اور کھانا چن لیتے ہیں۔

اس سلسلہ کا نام کرٹا سیوا سنگ ہے اور اس کے افراد بالکل رومن کیتھک پادریوں کا سا لباس پہنتے ہیں جو ایک نہایت معمولی کپڑے کا سفید جفتہ ہوتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ اس برادری نے جن میں ہندوستانی بھی شامل ہیں اور یہ سب اکٹھے ایک آشرم میں رہتے ہیں ہندوستان میں جنم لیا ہے اور یہی اس کا گھر ہے۔ ان میں کچھ شادی شدہ گھر لے بھی ہیں۔ یہ اُن کے مقاصد کے حامی اور اُن کے کام میں مددگار ہیں لیکن انہوں نے ابھی آخری قسم نہیں اٹھائی۔ ہندوستانی اور یورپی ایک ہی جگہ رہتے رہتے اور اکٹھے عبادت اور خدمت کرتے ہیں۔ سب نے بڑا دیادی اعزاز جو اس برادری کے بڑے بڑے ارکان کو ملتا ہے، اور یہ ارکان غیر شادی شدہ ہوتے ہیں، یہ ہے کہ وہ زعفرانی رنگ کا جفتہ پہن سکیں جو ایک طویل امیدداری کے بعد عطا ہوتا ہے۔

صحافت اور خواتین

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے شعبہ خواتین کا حال ہی میں ایک جلسہ ہرٹائیٹس لیڈی آغا خاں کے مکان پر ہوا۔ ایں جہین نے صحافت اور خواتین کے موضوع پر تقریر کی۔ مسٹر میک کنزی صدر تھیں۔

یورپ اور امریکا کی موجودہ صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جہین نے بتایا کہ خواتین نے وہاں اخبارات اور رسائل کی پیداوار میں کس طرح حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تقریباً تمام اخبارات میں بعض خاص باتیں عورتوں کے پسند کی بھی ہوتی ہیں، اور یہ باتیں عورتوں کے لئے عورتوں کی جمع کی ہوئی اور لکھی ہوئی ہوتی ہیں جو صحافت کے تقریباً ہر شعبہ میں پہنچ چکی ہیں۔ یہاں تک کہ اشتہارات بھی ایسی وضع و ترکیب سے شائع کئے جاتے ہیں کہ وہ گھر کی مالکہ اور مصارف کی مختار کو مسحور کر سکیں۔ ہندوستان کی ترقی کے ساتھ ہی ایسی مطبوعات کی مانگ بڑھ جائے گی جو خواتین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی، جو امریکا اور یورپ کی مطبوعات سے سبقت لے جائیں گی۔ اور اگلے دس بیس سال میں ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان کے زنانہ رسائل مغرب میں مقبول ہو رہے ہیں۔ مگر ہندوستان کی صحافت میں خواتین نے اپنا دخل پیدا کر لیا جیسا کہ انہوں نے مغرب میں کیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے اثرات ترقی و تہذیب کے لئے مدد و معاون ثابت ہونگے۔



دانشان کور

GALETTA
ART 98 WOMEN
L'AMORE

افسانہ

تیری کمائی کسی ایزدی نغمے کی طرح نرم رو ہے — ہومر

اُس کی کمائی ایسی ہے جو بچوں کو کھیل سے اور بڑوں کو آرام سے روکے رکھتی ہے — مرفلپ سٹنی

یہ داستان کبھی پرانی نہ ہوگی — ہنری فیلڈنگ

حقیقت کے رخ سے میں نقاب نہیں اٹھا سکتا،
میں تو تمہیں افسانہ سناتا ہوں کہ میں نے خود اسے یوں ہی سنا ہے — سروالٹر سکاٹ

افسانہ ادب کی شاعری ہے — مادام نیکر

افسانہ شاعری اور مصوری کا پھوڑ ہے — ڈرائیڈن

کہاؤ کہ دل کو خوش کرنے کے لئے کمائی سچی معلوم ہونی چاہئے
وہ بڑھل، دلچسپ، مختصر اور انوکھی بھی ہونی چاہئے؛
اور جب کبھی دو ان قوانین سے انحراف کرتی ہے،
عقل مند ہو جاتے ہیں اور بیوقوفوں کو داہ داہ کے لئے چھوڑ دیتے ہیں — شلنگ فلیٹ

مجھے وہ کمائی ملنے سے نفرت ہے جو ایک مرتبہ کسی جاچکی ہو — ہومر

منصور احمد

اکبر اعظم

یہ دلچسپ مضمون فرانسیسی تشرق کرادے دو (Carra de Vaux) کی کتاب ”مفکرین اسلام“ (Les Penseurs de l'Islam) جلد اول (ص ۶۷-۷۴) سے رسالہ ہمایوں کے لئے براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب سے ہم قبل ازیں چند مضامین رسالہ اردو میں خیام، عطار، سعدی اور حافظ کے متعلق شائع کرا چکے ہیں۔

”تاریخ عالم کی بعض شخصیتیں اپنی عظمت و خوبی کے لحاظ سے ہمیشہ مومنین کی جذب نظر اور غور و بحث کا مرکز رہیں گی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بادشاہوں میں بلاشبہ یہ رتبہ ہندو عہد میں ”اشوک“ کو اور اسلامی عہد میں اکبر کو حاصل ہے۔“

کرادے دو نے اکبر کو مفکرین کی جماعت میں شمار کیا ہے، اور زیادہ تر اسی نقطہ نظر سے اُس کی سیرت سے بحث کی ہے۔ اکبر کے متعلق بے شمار اہل قلم اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کر چکے ہیں، لیکن کرائے دو

(سید حسن برنی)

کا یہ مختصر مطالعہ بھی خالی از حجت و لطف نہیں ہے

با عظمت مغلوں میں سب سے عظیم الشان اکبر جس نے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک سلطنت کی، فی الواقع ایک مفکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس نے اپنی سلطنت کے مختلف اقوام و مذاہب کو ایک حکومت اور تقریباً ایک ہی مذہب کے تحت میں لانے کے مسئلہ پر غور کیا تھا۔ اس کام کی دشواری بہت بڑی تھی، جس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں نسل اور ذات کے تعصبات کس قدر قوت رکھتے ہیں۔ اکبر نو جوانی ہی سے اس مسئلہ کے مذہبی پہلو میں نہایت دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ تقریباً ہمارے زمانہ کے تھیساؤنی اور جدید مسیحائی (Neo-Christian) جماعت کی طرح مذاہب کی تالیف یا کم از کم اتحاد کا خواب دیکھتا تھا، جس میں مختلف ملتیں ایک وسیع وطن تصور کے ماتحت جمع ہو جائیں۔ اس غرض سے اُس نے ایک قسم کی مذہبی مجلس قائم کر رکھی تھی۔ اپنے مستقر فتح پور سیکری میں، جو عمارت کے بہترین نمونوں سے پُر ہے اُس نے مختلف فرقوں کے نمائندوں کو بلایا، اور اپنے سامنے مباحثے کرائے۔ اُس نے سیوی فرقہ (Jesuites) کے عیسائیوں کو بلا کر انہیں اپنے مذہب کے لئے ایک چھوٹا

ساگر جانا سننے کی اجازت دی۔ اب بھی وہ کمرہ موجود ہے جس کے وسط میں ایک ستون اور گوشوں سے آگراس ستون پر مل جانے والی گیلریاں ہیں، جہاں یہ مجالس منعقد ہو کر تھیں۔ اس کا نام ”معبادت خانہ“ تھا۔ مقررین نہایت آزادی سے تقریریں کرتے تھے۔ ایک سیرت بھکار کا بیان ہے کہ بادشاہ یہاں مشکک ہو گیا۔ اکبر نے ان بھکار شیعہ پراکتفا نہیں کی۔ وہ صبح آٹھ بجے تک تنہائی میں عام مسائل زندگی اور خاص فرائض شاہی پر غور کیا کرتا تھا۔ اکبر کا مخصوص مذہب، جو کہ ایک طرح کا مختلف خیالات سے انتخاب کیا ہوا ”ہمہ اوستی مسلک“ (Pantheisme Eclectique) ہے بہت کم کامیاب ہوا۔ اُسے صرف ایک درجن قبیعیں نصیب ہوئے جو گمراہی کے لوگ تھے، اور کوئی فرقہ قائم نہ ہو سکا۔ ہندوستانی اسلام کو البتہ اس منصوبہ سے نقصان پہنچا۔ کلمہ شہادت سکے اور خطبہ سے نکال دیا گیا، بچوں کے نام پیغمبر کے نام پر نہیں رکھے جاتے تھے۔ مسجدیں خالی ہو گئیں اور بعض میں فوجیوں کے لئے بائیں بنادی گئیں۔ مذہب اسلام کے احکام کے خلاف جو زندہ چیزوں کی تصاویر ممنوع قرار دیتے ہیں، اکبر نے اپنے محل میں ایسے مناظر جو عیسائی اور بدھ مذہب کی روایات سے ماخوذ تھے، نقش کرائے۔ الیکساندر سیور (Alexandre Severe) کا بیان ہے کہ اُس نے یسوع اور بدھ کی موتیں اپنے کمرہ میں رکھ چھوڑی تھیں۔ سول حکومت میں رواداری و ایٹلاف کا اصول زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اکبر کے

عہد اکبر کی لاندہی اور بدعات کے متعلق پورے مصنفین بالعموم مبالغہ سے کام لیتے، اور اکثر ناواقفیت یا غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکبر کا مذہب طویل اور گہری بحث کا محتاج ہے جس کے لئے اس وقت موقع نہیں ہے، لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اکبر کی زندگی میں مختلف مذہبی دور گزرے ہیں۔ ابتداً وہ ہندوستانی معیار سے (اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ معیار چنیداں بلند نہ تھا) پچاس مسلمان مانا جاتا تھا۔ ابو الفضل اور فیضی کے اثر سے اکبر کے خیالات میں تغیر پیدا ہوا۔ ایک زمانہ آزاد مشربی، تشکک اور ہمہ اوستی و ہمہ دوستی میں گزرا۔ لیکن خود اکبر اور اُس کے مذہبی مرشد و معلم ابو الفضل اور فیضی اسلام کی بندش سے کبھی آزار نہیں پہنچے، بالخصوص اسلامی تصوف کا ان پر نہایت زبردست اثر رہا۔ اسلامی تصوف کی وسیع مشربی ہی کے تحت میں وہ تمام دنیا کے مذاہب کا خیر مقدم کرتے رہے۔ ابو الفضل فیضی اور اکبر ہندوستانی مسلمانوں مثلاً تنگ دل مگر استباہ زلماء عبدالقادر کی نظروں میں ہمیشہ مطہون رہے، اور انہیں لوگوں کے مبالغہ آمیز بیانات سننے بعد کے مورخوں میں بہت کچھ غلط فہمیاں پیدا کرویں۔ یورپین مورخوں نے اپنی تھقیل کی مدد سے اور بھی رنگ آمیزیاں کیں جس کی وجہ سے اکبر کی سیرت کے بیان میں صداقت سے انحراف ہو جاتا ہے۔ اخیر عمر میں اکبر کے خیالات میں بدو مل ہو گیا تھا، اور اُس کی موت یقینی طور پر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر باقی حاشیہ صفحہ ۸۲۷ پر دیکھئے

دوش بدوش اس اصول کی تعلیم اُس کے وزیر اور دوست ابو الفضل نے بھی دی جس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

انتظام سلطنت میں اکبر نے ایک سابق غیر مغل پادشاہ شیر شاہ کے کام کو جاری رکھا۔ کچھ ہی عرصہ پھر اُس پادشاہ نے ہندوستان میں نہایت دانشمندی کے ساتھ سلطنت کی تھی۔ وہ مغلوں کا دشمن تھا۔ خراج شاهی زیادہ عدل کے ساتھ قائم کیا گیا اور مالگذاری مقرر کرنے میں اور کمسوں کی نگرانی میں زیادہ انصاف برتا گیا۔ وہی اصول اب تک چلے آتے ہیں۔ ایک راجہ کی لڑکی سے عقد کرتے وقت اکبر نے دو ٹکس جو ہندووں کی نول آزاری کا موجب تھے معاف کر دیئے۔ ایک تو وہ ٹیکس جو اُن جاتریوں کو دینا پڑتا تھا جو جاترا کے لئے برہمنوں کے تیرہ کی جگہوں پر جاتے تھے، اور دوسرا ٹیکس جزیہ تھا، جو اسلامی فقہ کی رو سے غیر مسلموں کو دینا پڑتا تھا۔ اکبر نے مقامی سکوں کے مسئلہ پر بھی توجہ کی۔ اُس نے مقامی سکوں کو ممنوع قرار دیا، مردہ سکوں میں اصلاحیں کیں، اور رائج الوقت سکوں کی قیمتیں قائم کیں۔ اخلاقی حیثیت سے اُس نے جنگی قیدیوں پر سختی کرنے کی ممانعت کی اور اپنے ایک رضاعی بھائی کو جو مجرم تھا اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ اُس نے سستی کی رسم کو خلاف قانون قرار دیا۔ اکبر کا ایک دوسرا بڑا کارگذار ملازم، سپہ سالار ٹوڈرل تھا، جو ایک لائق فوجی افسر اور ایک ممتاز ہارسر تھا۔ اُس نے اس عہد کے انتظامی کام میں بڑا حصہ لیا۔ باغی راجاؤں کے خلاف مسلسل فوج کشیوں کے دوران میں جن میں وہ ہمیشہ کامیاب رہا، اس نے ایک سلسلہ ایسے مالی انتظامات کا سرانجام دیا، جو کہ بہترین ماس مالیات ہی کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ اُس نے اٹاک کی ایک صحیح فہرست بنائی، جو روٹشد کی دادرسی کے لئے سہولتیں کالیں بند و بست انیس برس تک کے لئے کیا، اس کا خیال رکھا کہ اس دوران میں ٹیسرے یا مقامی عہدہ دار کوست اندازی نہ کر سکیں، بعض چھوٹے عہدہ دار کم کئے، کاشتکاروں کے لئے نقد اور غلہ کی تقاوی مقرر کی، محصلوں کو ہر سال حساب پیش کرنے کا حکم دیا، ماہوار حساب خزانچی کو دیا جاتا تھا، مصائب مثلاً زلزلہ باری و طغیانی کی فوری اطلاع کی جاتی تھی، تحصیل سال میں چار مرتبہ ہوتی تھی۔ یہ ہیں وہ خاص خاص انتظامات جن کا نفاذ گویا کسی زمانہ

(بقیہ ماضی صفحہ ۸۲۸ پر) اسلام سے کبھی دست بردار یا بے تعلق نہیں ہوا۔ اسی وسیع مشرب کے زمانہ میں جب کہ فتح پور سیکری میں عبادت خانہ تعمیر ہونا تھا فتح پور سیکری کی شاہی مسجد بھی بنائی جا رہی تھی جو اکبر کے عہد کی بہترین عمارت ہے۔ حکومت کا اسلامی نظام (قاضی، مفتی، امام خطیب) برابر قائم رہا۔ بجز اس کے کہ دربار کے چند آدمیوں کے خیالات میں ہیجان ہوا، ہندوستان کے اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ تصادیر کا رواج عمارت وغیرہ میں پہلے سے بھی تھا۔

حال کے دلغے کیا تھا۔

انقلاباتِ ملکی کی عمدگی کے ساتھ ہی اکبر کا عہد فنون کی ترقی کے لئے ممتاز ہے۔ شمالی ہند میں عالی شان تعمیرات موجود ہیں جو اکبر نے بنوائی تھیں۔ آگرہ کا قلعہ جواب بھی ہماری سامنے موجود ہے، اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اکبر نے صنائع کی طرف بھی خاص التفات کیا۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ اُس نے توپوں کو بہتر بنایا، ایک نئی قسم کی گاڑی ایجاد کی اور ایک ڈنڈا توپوں کے صاف کرنے کے لئے بنوایا۔

سلطان جہانگیر نے جو اکبر کا بیٹا اور جانشین اور خود بھی ایک ممتاز شخصیت تھا، ایک ترک یاروز نامی چھوڑا ہے، جس کا طرزِ تحریر عالی، سہل و درخشاں ہے۔ اس کتاب میں اکبر کی سیرت اور اُس کے خیالات کے جاننے کے لئے بعض قیمتی مقامات ہیں۔ جہانگیر ابتداءً آگرہ میں اپنے باپ کے بعد اپنے تخت پر بیٹھنے کا حال لکھتا ہے اُس نے ایک سکھ چلایا، جس کا مضمون یہ تھا:-

”اے آگرہ میں مسکوک کیا، خسر و عالم، مہا فطرتِ دنیا، پادشاہ نور الدین جہانگیر بن شاہ اکبر نے“
وہ لکھتا ہے:-

”اس موقع پر میں نے اُس تخت کا استعمال کیا جو میرے والد نے بنوایا تھا، اور جس کی آرائش ایسے شاندار طریقہ پر کی گئی تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ میں نے سال نو کا جشن منایا اُس وقت آفتابِ برج محل میں تھا۔ اکبر نے ایک نیا سنہ ایجاد کیا تھا، جو کہ اعتدالِ ربیع سے شروع ہوتا ہے۔ وہ آگ اور سورج کی تعظیم کرتا تھا۔ ابو الفضل لکھتا ہے:- پادشاہ کا خیال ہے کہ آگ اور روشنی کی تعظیم کرنا ایک مذہبی فرض ہے“

جہانگیر نے بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے اکبر کی رواداری کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ خلا وہ بعض دیگر کئے وہ ایک یہ واقعہ لکھتا ہے کہ اکبر کی زندگی میں راجہ ان سنگھ نے ایک مندر تعمیر کرایا، جس پر پانچ کروڑ چالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا! خاص بت کے سر پر ایک تاج تھا، جس میں جواہرات جن کی قیمت کل مسارف کا بار حوالہ جہتی تھی لگے ہوئے تھے۔ اس بت کے گرد اگر داور بت بھی تھے جو سونے سے بنائے گئے اور مصرعِ تلخ پہنچے ہوئے تھے۔ جہانگیر نے اکبر سے پوچھا کہ آپ ان بت پرستی کی کارروائیوں کو کیوں نہیں دیکھتے۔ اکبر نے جواب دیا سائے میرے عزیز بیٹے! میں جانتا ہوں کہ میں ایک نہایت طاقتور بادشاہ ہوں اور دنیا میں خدا کا سایہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ خدا کی رحمتیں تمام مخلوق پر بلا امتیاز نازل ہوتی ہیں۔ میں اپنے عالی رتبہ کے فرائض میں کوتاہی کروں گا اگر میں اپنی مرحمت و نوازش کو ان لوگوں سے جو میری حمایت میں ہیں دریغ رکھوں گا۔ میں تمام انسانی اقوام، تمام خدا کی مخلوق کے ساتھ صلح کر چکا ہوں۔ یہ میں کس طرح روارکھ سکتا ہوں کہ ایک دوسرے کو ستائے یا دستِ رازی کرے؟“

جہانگیر کا بیان ہے کہ جوانی میں اکبر لڑائی میں سے مستغنی نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ خدا کی بزرگوں کا ایسا مخلصانہ و منکسرانہ احساس رکھتا تھا کہ باوجود زبردست افواج، بے شمار مصیبت جنگی ہاتھیوں، بے نظیر خزان اور عظیم الشان سلطنت کے جس کی شان پر فوقیت نہیں لے جاتی جاسکتی، مالک ہونے کے وہ کبھی اُس بے زوال ہستی کو فراموش نہیں کرتا تھا جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔ ہمیشہ یہ الفاظ اُس کی زبان پر رہتے تھے۔

”ہر حال میں اور ہمیشہ تمام انسانوں کے ساتھ صلح رکھ اور ہر حال میں پوشیدہ طور پر اپنی آنکھیں اور اپنا دل اپنے رفیقِ ازلی کی طرف رکھ“ اُس کی سیرت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ تمام مذاہب کے ساتھ کامل دوستی رکھتا اور جب موقع ملتا ہر جماعت کے نیک اور روشن دل بزرگوں کی صحبت اختیار کرتا تھا۔

اکبر فی الواقع جمائے زمانہ کے تھیا سونی خیالات کے بانیوں میں سے ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا طرز عمل اُس کا نقطہ خیال حتیٰ کہ اُس کے الفاظ دوبارہ لے لئے گئے ہیں۔ اُس نے مختلف مذاہب کے ایسے جذبات کو جو کہ پاکیزہ و عالی معلوم ہوئے منعقب کر لیا تھا، لیکن عقاید کے متعلق وہ مشکوک تھا اور ایسے بیرونی مراسم کی جو اسے نامناسب معلوم ہوتے تھے کھلی ہوئی مخالفت کرتا تھا۔ مثلاً اسلام کی رسومِ ختنہ اور کتوں کا ناپاک سمجھا جانا اور ہندوؤں کی رسمِ سستی۔ بلاشبہ اکبر دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ہے جو مذہبی خیالات کے میدان میں پیدا ہوئیں جو خیالات اُس نے ہندوستان میں آج سے تین سو برس پہلے ظاہر کئے تھے وہ ہمائے زمانہ میں بھی ہمیں نئے معلوم ہوتے ہیں۔

اکبر کا مقبرہ سکندرہ میں ہے۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ اکبر میانہ قامت سنہرہ رنگ، سیاہ ابرو، سیاہ چشم تھا۔ اُس کا جسم ”شیر کا“ تھا، سر بڑا، بازو اور ہاتھ لمبے تھے۔ اُس کی آواز بلند تھی۔ اُس کا انداز گفتگو اور اطوار و عادات نہایت شائستہ اور متنازع تھے۔ ہندوستان کی آبادی نے اُس کی یاد کو محفوظ رکھا ہے ہندوؤں کی قومی شاعری نے اُس کے کام کی وسعت، اُس کی بہادری، اُس کی عالی ظرفی اور اُس حمایت کو جو اس نے اُن کی قوم کے ساتھ دکھائی پیش نظر رکھتے ہوئے بطور اپنے ملک کے ایک سربراہ اور وہ سورما کے اُسے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

سید حسن برنی

پیرانِ سالوس

(۱)
جہم ہیں میں ستریں ٹہنے والے
طوفان میں خود غنیمت کہنے والے
واند کہ اک وہاں بنڈن کیلئے
ظاہر میں خدا کا نام لینے والے

(۳)
نہی کی ہمیں راہ تباہی سے
اندسے ہر وقت ڈراتے رہے
تبہج آگ کی روشوں میں رہے مٹنے
اور شوق سے بالِ غیر کھاتے رہے

(۲)
ایمان جو سینوں پر فدا کرتے ہیں
شعلِ دل و دہریں کیا کرتے ہیں
پہرے نگروں سے غافل ہو کر
عبیدوں کو مریدوں کی ٹکا کرتے ہیں

(۲)
وہ دشمن تیرے ہیں، غمِ غنیمت ہے
بھگت وہ بڑی ہیں، غمِ گنہگار ہے
کچھ وہ کل اپنے ہیں مجھ سے بیخود
گر یادِ خدا ہیں، اور غمِ بند ہے

جوشِ لہجہ آبادی

طنز و شاعری

سب جانتے ہیں کہ ہماری شاعری کا جزوِ اعظم ہمیشہ سے غزل ہی ہے۔ غزل کے لغوی معنی ہیں صیث عشق باز نال۔ اس اعتبار سے غزل یا تغزل کی بنیاد جن مضامین پر ہے وہ عموماً وصف معشوق، آرزوئے وصال، شکایتِ فراق، رشکِ رقیب، مذمتِ ناصح، زارِ ہملی، شکوہٴ چرخ، طنز و تعریض، چھید چھاڑ وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ متاخرین نے غزل کو اس قدر ہمگیر و وسیع بنادیا کہ تصوف، فلسفہ، اخلاق، غرض کوئی مبحث ایسا نہ تھا جو تخلیقِ غزل میں داخل نہ ہو گیا ہو، مگر قدما نے غزل کو اُس کے حدود سے متجاوز نہ ہونے دیا اور غلط مبحث سے اجتناب کیا۔ یہ فارسی شاعری کا حال تھا۔ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ فارسی شاعری کے انحطاط کا دور تھا۔ اس لئے شعرائے اردو کے سامنے جو نمونہ تھا وہ فارسی کے شعرائے متاخرین کا کلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا کی غزلوں میں رہہ ہٹنا بعض متقدمین شعرائے فارسی کی سادگی، اثر، جوش، صدقِ جذبات کم نظر آتا ہے اور تصنع اور تکلف زیادہ۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ امر فی نفسہ اچھا تھا یا بُرا۔ مگر کم از کم غزل میں تغزل کی شان باقی نہیں رہی۔

تغزل کے اجزائے ترکیبی میں جیسا کہ اوپر غرض کیا گیا ایک چیز طنز و تعریض بھی ہے جو اردو شعرا کے کلام میں شاذ و نادر نظر آتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم اسی موضوع پر بحث کرنی چاہتے ہیں۔

طنز (طنشہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو تلی کٹی سنا کر دل کا بخار نکالا جائے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اشتعال سے کراہی مطلب برآری کی جائے۔ کلام میں تعریض سے کام لینا ایک طرِ توشاغر کی نازک خیالی کی دلیل ہے۔ دوسری طرف اُس کی قدرتِ زبان کا ثبوت۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اساتذہ اردو میں مومن خاں سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ یہ منجملہ اُن چند خصوصیاتِ شاعری کے ہے جن میں وہ متفرد اور اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز ہیں۔ چونکہ اُن کے کلام پر رائے لکھنے والوں نے بیشتر اُن پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اور اُن میں مومن کی اس خصوصیت پر اجمالی تبصرہ کیا جائے۔

مومن کو قدرتِ شاعری غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کبھی روشِ عام پر چلنا پسند نہ کیا۔

نزدکیت خیال اور ندرت اسلوب میں اُن کے ہم عصروں میں صرف غالب اُن کے شریک کے جاسکتے ہیں اگرچہ شریک غالب نہیں۔ مومن کی غزل حقیقی سنے میں غزل ہوتی ہے۔ اور تغزل کی محدود درجہ لانگاہ کے باوجود اُن کی نادرہ کار طبیعت اس میں وہ نقش آرائیاں کرتی ہے کہ نگار خانہ چین کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے خیر یہ محض تو کسی آئندہ فرصت پر اٹھا رکھنی چاہئے، اس وقت اُن کے طنزیہ اشعار سے غرض ہے۔

ملفوظ ہے کہ طنز میں کبھی شکم حقیقت کو مستزبانہ انداز میں شکایتاً پیش کرتا ہے اور کبھی امرِ غیر حقیقی کو غیرت دلانے کی نیت سے بطور حقیقت بیان کرتا ہے۔ ذیل کے اشعار سے طنز کا اندازہ ہوگا

محبوب نے اگر عاشق بیمار کو قتل کر دیا ہے۔ شاعر اس پر یوں چٹکی ملتیا ہے۔

غیر عبادت سے بُرا مانتے قتل کیا اُن کے اچھا کیا

معشوق نے عاشق پر اتنے ستم کئے کہ اب آسمان کو بھی رحم آنے لگا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم اس قدر ظلم نہ کرتے تو چرخ بے مہر کو ہرگز رحم نہ آتا۔ اب گویا تمہارا ستم کرم ہو گیا۔

رحم فلک اور مرے حال پر تو نے کرم لے ستم آرا کیا

لوگ کہتے ہیں کہ اُس (معشوق) نے عاشق کو خاک میں ملا دیا۔ مومن کو اس سے انکار ہے۔ دیکھنا کس منہ سے انکار کیا ہے جس میں ہزار طعن و طنز پنہاں ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مٹی نہ دی مزار تلک آ کے اُس پہ بھی کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

ناصح نے کہیں کہہ دیا تھا کہ عشق کا انجام کار وصال ہے۔ مومن وصال کے لفظ سے خاص فائدہ لیتے ہیں

ملاحظہ ہو۔

فراتے ہیں وصال ہے انجام کار عشق کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا

دوسرا شعر اور سنئے،

نام وصال سنتے ہی ہوتا ہے مضطرب کیونکہ کون اسے مرے مرنے کا غم نہیں

رقیب اپنے لئے عمر راز کی دعا مانگ رہے ہیں۔ شاعر اپنے تجربے کے مطابق عمر راز کو طول زمانہ ہجر کا مترادف

سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔

عمر راز کی ہے رقیب کو آرزو دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار میں

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میلِ حال اس قدر زار ہے کہ سنگدل آدمی کے سوا دوسرا سننے کی تاب نہیں لاسکتا

سنگدل یا رقیب ہو سکتا ہے یا معشوق۔ مگر اس بات کو صاف صاف نہیں کہتا بلکہ تعریف سے کام لیتا ہے۔
ملاحظہ ہو

سنیں نہ آپ تو ہم بواہوس سے مال کیسں کہ سخت چاہئے دل اپنے مازداں کیلئے
عاشق نے اتفاق سے ایک دن نامح کی گفتگو کان دھر کر سن لی چونکہ دوران گفتگو میں معشوق کا ذکر آتا
تھا جی لگ گیا۔ اس واقعہ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کیا جی لگا ہے تذکرہ یار میں، عبث نامح سے مجھ کو آج تک اجنباب تھا
گو یا قول نامح صرف اس لئے قابل سماعت ہے کہ اس میں کہیں کہیں تذکرہ یا آ جاتا ہے۔ چارہ گر جوش
جنوں کا علاج کرنا چاہتا ہے۔ عاشق اس از خود رنگی کے عالم میں بھی کس منے سے چسکی لیتا ہے۔

کر علاج جوش وحشت چارہ گر لائے اک جنگل مجھے بازار سے
یعنی جس طرح بازار میں جنگل کی جستجو جنون ہے اسی طرح میرے جوش وحشت کا علاج بھی دیوانگی ہے۔ معشوق کی نظر
الغاف رقیب کی جانب دیکھ کر عاشق رسم و راہ الفت ترک کر دیتا ہے۔ اتفاق سے کہیں ملاقات ہوتی ہے مجب
رشک دشمن کا عند تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر عاشق کہتا ہے۔

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے میں نے ہی تم سے بے دفائی کی
غرض معمولی تغص سے مومن کے اشعار کا معتد بہ وعدہ ایسا ملے گا جس میں نہایت لیلیف نوک جھوک یا
پھیڑ چھاڑ سے کام لیا گیا ہے۔ ذیل میں اسی رنگ کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں جن کی تشریح کرتے ہوئے یہ
ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں ان کی لطافت کا خون نہ ہو جائے اس لئے یوں ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کیا پسند آئی اپنی جور کشی چرخ کے انتخاب نے مارا

جو پھر چلے اُس بے وفا سے تو جانوں کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

کس دن تھی اُس کے دل میں محبت اب نہیں سچ ہے کہ تو وعدہ سے خفا ہے سبب ہوا

دیکھ مضطر کہیں نہ پیرے دشمن پیر یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے زباں نکھ گئی مرجا کتے کتے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق
نامح ہی کو لے آؤ گرافسانہ خواں نہیں

ہم حال کسے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا تو یہاں صحبتِ نامح کا اثر ہے

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دھائے وصل
ظلم کہاں و گرنہ اثرِ میسری آہ میں
طنز و تلعیض سے ملتی ہوئی ایک اور طنزِ سخن ہے جس میں کوئی استادِ مومن کے قریب کیا معنی ان کی گرد کو بھی
نہیں پہنچتا۔ یعنی اس رنگ کے بھی وہی بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔ میں اس طرز کو مسکرا شاعرانہ سے تعبیر کرتا
ہوں۔ اس مکر سے مراد یہ ہے کہ مومن اپنے مقصود کو اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ مخاطب سمجھتا ہے کہ اس میں
مومن کا نہیں بلکہ خود میرا فائدہ ہے۔ اس اعتبار سے طنز و مکر ایک حد تک متحد المقصد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شاعر
پیچ سے اپنا مطلب بھالنا چاہتا ہے۔ چونکہ مومن کا تنزل حقیقی تنزل اور ان کا عشق وارداتِ قلب کا آئینہ ہے۔
اس لئے یہ نشو و نما اور بھی پُر لطف اور یہ شراب اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

شاعر کی یہ عینِ زمانہ ہے کہ محبوب اُس کی طرف مِلنفت ہو مگر وہ کیوں ہونے لگا۔ اس لئے اپنی خواہش
کو اس بہانہ سے بیان کرتا ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں از رو بکھنا
میری طرف بھی غمزہ غمت از رو بکھنا
یعنی قصداً مجھ سے اجتناب کرو گے تو غیرِ ناژ جائیں گے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ دیکھنا اُس
شعر میں کس طرح محبوب کو اشتغال دلا رہے ہیں۔

شعلہ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
یعنی میرے شعلہ دل کو چمک کا دعویٰ ہے، تم اگر جلوہ رخ دکھاؤ تو اس کا غرور مٹے۔ اسی طرح ایک شعر میں بہرِ دوح
کو غیرت دلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس منہ پہ اُس سے دعویٰ جن، اک ذرا نہیں
اے مہرِ روشنی مرے روزِ سیاہ میں
یعنی اگر تو میرے روزِ سیاہ (بد نصیبی) کو روشنی سے مبدل کر سکے تو دعویٰ حسن کرنا بھی تجھے زیب نئے۔
اگر محبوب سے عرضِ وصال کرتے ہیں تو حصولِ تمنا معلوم اس لئے دعوتِ مستم دیتے ہیں اور اس جیلہ سے
مطلب برآری چاہتے ہیں۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر مستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجران کا غم نہیں

چونکہ عادت کے خلاف ہر بات تکلیف دیتی ہے، اس لئے اگر مجھے تکلیف دینا مقصود ہے تو وصل سے بہتر ستم اور وصل سے بڑھ کر ایذا میرے حق میں اُور کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سستے سستے ہجر میں اب اذیت نہیں ہی اثر کو شاعر کی دعا سے دشمنی ہے، اس لئے شاعر نے ارادہ کیا ہے کہ آئندہ سے ہم ہجر کی دعا مانگا کریں گے تاکہ جو انگلیں اُس کے خلاف لے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یا رکی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
مرزا غالب نے بھی اسی مضمون کو باندھا ہے مگر بندش ذرا سست اور انداز غیر شاعرانہ ہو گیا ہے۔
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے (قالب)

اس رنگ کے اشعار مومن کے کلیات میں بکثرت ملتے ہیں۔ بخوفِ طوالت فرداً فرداً ہر شعر کی توضیح سے قطع نظر کر کے چند اور اشعار نقل کئے جاتے ہیں یقین ہے کہ قارئینِ کرام اس امر میں ہم سے متفق ہونگے کہ یہ شعرِ رنگ دوسرے اساتذہ کے کلام میں کہیں نہیں ملتا۔

مت رکھو گردِ تارکِ عشاق پر قدم پا مال ہونہ جائے سرائے باز دیکھنا

بے جرم پا مالِ عدو کو کیا گیبا مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

لذتِ جبر کشی نے مجھے شرم نہ کیا طعن کیا کیا اے اربابِ ستم دیتے ہیں

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھلا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

ہجرتِ تباہ میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ زہر غم پر حرامِ خوار تو گل نہ ہو سکا

فار بستہ پر شبِ ہجر سمجھاؤں کیونکو دل میں تہ ہے دہگل اندام اگر برس نہیں

جلایا آنشِ ہجراں نے دل کو ترے گھر میں لگی اے بے خبر آگ

خوینچِ رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی اب اور کچھ نکالنے آزار کی طرح

نعم کر خصمِ جانِ غیب نہ ہو سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

درباں کو آنے دینے پر میرے زکیعے قتل ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوہِ محرم نہ تھا
گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

نوک جھوک کرنے اور جلی کٹی سنانے کے لئے شعرانے واسوخت یا واسوز کا میدان تلاش کیا ہے اس کی ایجاد کا سہرا متناظرینِ شعر لئے عجم کے سر ہے۔ اساتذہ اردو نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ دادِ سخن دی ہے اور ترا طعن و تشنیع کی قوت اسی محدود موضوع پر صرف کی ہے۔ مومن جو علماً عشق (دیا ہوس) کی وادیوں میں مدتوں گردش رہے ہیں کیونکہ دوسروں سے پیچھے رہتے۔ بلکہ سچ پوچھتے تو ان کے واسوختوں نے اصلاً واسوخت کے منشاء سے ان کو پورا کر دیا۔ واسوخت تو درکنار ان کی بعض غزلوں پر بھی واسوخت کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم یہاں ان غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں اور صحت و عدمِ صحت مذاق کا فیصلہ اربابِ فہم پر چھوڑ کر مضمون کو ختم کرتے ہیں تاکہ غزل میں فرماتے ہیں۔

اب اُور سے لو لگائیں گے ہم	جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بر باد نہ جائے گی کہ ورت	کیا کیا تری خاک لٹائیں گے ہم
دل نہ لے کے اک اور لالہ مُرد کو	پھر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
لب کا ترے دعویِٰ مسیحی	مرا ورپہ آزمائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری	کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
گر خواب میں آن کر جگایا	سو تے مرے جگائیں گے ہم
بت خانہ چسپ ہو گو ترا گھر	مومن ہیں تو اب آئیں گے ہم

دوسری غزل کے چند شعر اور سنتے جائیے

تو یہ ہے کہ ہم عشقِ تنوں کا نہ کریں گے	وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
ٹھیرے ہر کہ زنجیر سے ٹھیرائیں گے دل کو	پد بہر ہی زلف کا سودا نہ کریں گے

پھر جائے نہ تا چشمِ صنم آجھ کے آگے
سیرِ چمنِ نرگسِ شہلا نہ کریں گے

مسافر

فلک فرسائیاں کچھ ہولکیں، جو باقی میں سوہوتی رہیں گی مگر آج ایسے مسافروں کا ذکر مقصود ہے جن کی عالم بالا تک قطعی رسائی نہیں۔ یہ شوریدہ سرسافریڈی دل کی طرح آتے ہیں، پھیلے ہیں، جو کچھ ملے اسے چٹ کرتے ہیں مگر پھر ایسے غائب ہوتے ہیں کہ گویا کبھی آئے نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان مسافروں کی زندگی کا مدار باہمی کشش پر ہے جس قدر ایک دوسرے سے برسرِ پرچاش رہیں اسی قدر ان کی گرم بازاری ہے۔ جہاں ان کا لڑائی و لگاؤ تھا وہیں یہ خود بھی کس پیرسی کے بوجھ تلے دب کرے۔

یہ مسافر عقائد ہیں۔ عالم بالا میں جبرائیل بچاے کے پر چلتے ہیں تو ان لڑاکوں کی کیا مجال؟۔ وہ جگہ جو تو میں سے خالی ہو، جہاں جو پہنچے وہ کچھ نہ رہ کر سب کچھ بن جائے عقائد کے جنجال سے آزاد ہے، وہ جگہ جو ہے مگر جس کا ذکر گناہ برتر از کفر ہے..... نہیں، نہیں! میں اپنے قارئین کو وہاں نہ کھینچوں گا۔ جسے وہاں جانا ہو وہ پہلے یہاں کے مسافروں کا حال سنے اور جب ان سے چھٹکارا ہو جائے (قطعی اور کٹی) تو پھر ممکن ہے کہ.....

دوست! پیارے دوست! کیا تم نے سمجھا کہ میرا فلم کیوں رکھا؟۔ یہ بھی اک عقیدہ ہے کہ ”عقیدہ نہ ہو“ میں ایسی ملک چیریوں سے کوسوں بھاگتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے عقائد سے محبت ہے اور مجھے اچھی طرح علم ہے کہ لنگڑوں کو تیمور ہوتے اور قیصروں کو بے دست و پا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لو اب سنو۔

(۲)

جب میں چھوٹا ہوتا تھا تو جادو میں اعتقاد خاص لاہور میں کافی زوروں پر تھا۔ ہر شخص کی زبان پر تھا ”جادو برحق جادو کرنے والا کافر“ اس زمانے میں بہت سی بیماریاں جو اب جراثیم کے سرخوپی جاتی ہیں جادو کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان کا علاج بھی جادو ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ کئی آدمی مشہور جادوگر تھے۔ ان کی خاصی دوکان چلتی تھی۔ مقدموں میں ہارجیت بعض دفعہ جادو کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ وہی لاہور اب ہے کہ نہ جادوگر ہیں نہ جادو۔ یہ پرانا اعتقاد اب موت کی طرف رنگ رہا ہے اور کوئی ایسا نہیں کہ اس بڈھے کے مرنے پر شادی لینے بیٹے کی آرزو رکھتا ہو۔

یہی ایک اعتقاد تھا کہ بڑے کامرنا خوشی کا موجب ہے۔ اب اول تو کوئی بڑا کامرنا نہیں چاہتا رسول کے طالب علموں سے اس کا حال پوچھا چاہئے، اور مرے بھی تو کس امید پر کوئی خوشی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہ اعتقاد بھی نہ بدق کے تیسرے درجہ میں مبتلا ہے۔ تعویذ باز بھی اپنے پرانے ایمان سے پھر سے نظر آتے ہیں جھاڑ پھونک، نگنڈے۔ ڈاکڑوں کی چاندی ہے۔ پیروں کے گھربک ہے ہنس مگر کیا مجال کہ کسی کمبخت آنکھ سے ایک آنسو بھی بہا ہو کہ تعویذوں میں اعتقاد اب بستر مرگ پر ہے۔

ایک سب سے بڑا اعتقاد تھا کہ ہاتھ کا دیا کام آتا ہے۔ کئی خضر نما بزرگوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھپ چھپ کر خیرات کرتے تھے کہ اس مولا کے نام کے سودے کا چرچا نہ ہو۔ اب جس چندہ دہندے کا نام ہیں خباہت میں نہ چھپے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا احسان فراموش ہے۔ یہ پرانا اعتقاد بھی چل بسا۔ وہ اندوالمونی پرست ہی نہیں تو مولا سے سودا کون کرے؟

تعجب ہوتا ہے کہ جب انسان اعتقادوں کے لئے زندہ میں اور اعتقادوں کی یہ حالت ہے کہ کچھ دن فیثیل بہ کر پھر وہ ایسے مرتے ہیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں رہتا تو کیوں اس قدر اعتقاد پرستی پر زور ہے؟ کیوں انسان اس قدر بے بس ہیں کہ بجائے اس کے کہ اپنے لئے زندہ رہیں وہ پسند کرتے ہیں کہ اپنے دامغوں کو منے والوں، اعتقادوں کی مزاریں بنائیں؟

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ تین چار پٹھے پرانے کپڑوں والے کمرے میں داخل ہوئے محض عاداتی تعظیم کے لئے کھڑا ہوا اور ان حضرات سے اشارے سے کہا کہ آپ تشریف رکھئے۔ بیٹھتے بیٹھتے ان لوگوں نے رسم تعارف ادا کی۔ ایک صاحب لجنے ”مجھے مسکین کا نام خیرات ہے“ دوسرے بزرگ بولے ”اس عاجز کو پیری مریدی کہا جاتا تھا تیسرے پرانے نے دبی زبان سے کہا ”مجھے خاکسار کو جاو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا“ چوتھے صاحب کچھ کہنے کو تھے کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا، ”حضرت تعارف تو ہوتا ہی ہے گا آپ بیٹھے تو سہی سلمان گھر ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اس قدر مختلف کیوں فرماتے ہیں؟ یہ جلد چونکہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو ان بزرگوں کے چہرے پر کچھ رونق سی نظر آئی۔ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ مجھ بد نصیب سے آج تک کوئی نیک کام نہ ہوا تھا۔ شاید یہی نیک کام آجائے کہ میں ان لوگوں سے اچھی طرح ملا ہوں۔

تھوڑی دیر تو ادرادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گردش ایام کی نسبت فقرے چپت ہوئے غرض کے بندوں کو بڑا بھلا کہا گیا۔ لوگوں کے ظاہر باطن کا پول کھولا گیا مگر آخر کاریہ وفد اپنے اصل مطلب پر آیا۔

جادو۔ نئے سٹر۔ ہم جو غفل ہوئے ہیں تو کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ اپنا وقت اچھایا برا ہم لوگ گزار چکے۔ بنیاد و دروہ ہے اور اگر ہم لاکھ معقول وجہ بھی آپ کی سائنس کے برخلاف پیش کریں تو بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم ہزار دفعہ کہیں کہ طوقی نہیں ہمہ درگوں خرمی ہمیں "سگر ہماری سنتا کون ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں خرخر ہی نہیں بلکہ براق ہے ان سے بحث فضول ہے۔ ہمیں یہ فخر کافی ہے کہ ہماری اترن سائنس کے ذریعہ سر ہے۔ ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کے لئے پنشن بھی میسر نہیں ہو سکتی تو آپ کم از کم یہ تحریک تو کریں کہ ہماری تمیز و تحفین تو ایک معقول طریقے سے کر دی جائے۔ اس سے زیادہ ہمارا کچھ مطلب نہیں۔ ہم اہل دنیا کی خدمت کرنے کرتے تھک گئے۔ خود اپنے آپ سے تھک گئے۔ ہم اب چلتے پھلتے مگر کیا آپ کی خود داری اس امر کی اجازت دے گی کہ آپ کے بزرگوں کے ہم نوالہ ہم ہیالہ اس غیر حالت سے مرین کہ ع

کوئی ہمایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

میں۔ (رسمی طور پر) بندہ پرورد اللہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہتے۔ بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں وہ میرے دل پر نقش ہیں اور کافر موجود یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا۔ ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈکا بجے گا۔

خیرات۔ آپ ہم سیکنوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کریں ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تمدن کے دام تزدیر پھیلانے جاتے ہیں کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں۔ صاف کیجئے۔ آپ کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فراموشی کہ قوم بچاری خلافت والوں سے طلاق لینے کے بعد یہ بھی تبلیغ تنظیم والوں کے گھر جا پڑی اور وہ لوگ پیسے کے پیر ہیں اب آپ کے لئے رقم آٹے تو کہاں سے؟

پیری مریدی۔ تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ جس باوفا نے آپ لوگوں کو لندن اور پیرس میں نہ بھلایا جس نے

دہاں سفید ہاتھوں پر بیعت کی ہو اور جو اخضر آنکھوں کے جادو سے نہ بچا ہو وہ آپ سے کیا بے اعتنائی کریگا، مگر آپ ہی ارشاد کیجئے کہ اب صورت ہو تو کیا ہو؟

جادو، خیرات، پیری مریدی۔ ایک زبان ہو کر نہایت یاموسی کے لمبے میں کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان ایسے گئے گذرے ہو گئے کہ ہمارے نام سے بھی بیزار ہیں۔

میں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ آپ نے فرمائیے۔ اب بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو آپ کا دم بھرتے ہیں مگر رفتار زمانہ کو تو دیکھئے۔

سب۔ تو ہم آپ سے کیا امید رکھیں؟

میں۔ مجھ بے بس کا زور چلے تو آج آپ سب کو مثل سابق تخت نشین کر دوں اور میری قوم کو بھی شاید غدر نہ ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذاہب و ہابی ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ کتے دینے میں لوگ دہابی ہو گئے تو لاہور بچائے پر کیا گلہ۔

سب۔ بڑی مشکل ہے سرنے آپ نہ دیں جینے کے پون لالے، ہم کریں تو کیا کریں۔

میں۔ حضرت۔ قرائن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو رحلت ہی کرنی ہوگی اور وہ بھی خفیہ خفیہ مگر شرط ایمان تو یہ ہے کہ لَا تَقْتَضُوا یعنی آپ کے دن پھریں اور پھر آپ اور میری قوم شیر و شکر ہو کر رہیں۔ سب۔ آپ نے رہا سہا بھی ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ گو ہم تھک گئے ہیں مگر ہم اب چلیں گے۔ روناصرف یہی ہے کہ اگر ہم کو ذرا بھی شبہ ہو کہ مسلمان بھی ہم سے غدار ہی کریں گے تو ہم آج سے کئی سو سال پہلے اس قوم سے پہلو تہی کرتے۔ افسوس ہے تو بس اس قدر کہ آپ نے بھی حق معصیت دیر نہ ادا نہ کیا۔ لیجئے۔ خدا حافظ

وہ بزرگ تو چل دیئے مگر ان کا آخری جملہ تیر کی طرح کھٹکا۔ میں ان کے پیچھے لپکا کہ انہیں بلاؤں، گلے سے لگاؤں اور یقین دلاؤں کہ اوروں کا تو ذمہ لینا مشکل ہے مگر جہاں تک میرا دم ہے ان کی عزت حرمت میں فرق نہ آئے گا۔ مگر وہ تھکے مسافر بلا کے گرم رفتار نہ کھلے۔ یونہی جھٹک سی دکھائی دی کہ وہ اسی گروہ میں مل گئے جس میں پرانے مصری، فرعون، اعتقاد پرانے یونانی، اعتقاد پرانے رومن، اعتقاد پرانے تورانی اعتقاد تھے بہت دیر تک کیلچہ موسا کیا مگر آخر شکر کیا کہ اب مسلمانوں کو بھی موقع ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ کیا تھا، یہ سوچیں کہ کیا ہو۔ مگر میرا شکر قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ جونہی میں مڑا تو پہلو سے ایک ناگوار نقشہ کی

آواز آئی اور وہ بزرگ جن کو اپنا تعارف کرانے سے میں نے ٹوک دیا تھا تھیں ایک آمیز لہجہ سے فرمے لگے آپ نے اُس وقت میری بات نہ سنی۔ مجھے بھیچان کا نام رولج ہے۔ آپ چند بوسیدہ اعتقادوں کا ٹکڑا جانے پر اس قبضہ کیوں ہیں؟ ابھی تو میرا تسلط قائم ہے۔ جب تک شادی بیاہ، ترکہ میراث اور روزانہ میل جول میں پرانے رسم و رواج قائم ہیں تب تک کیا ہو سکتا ہے؟ مشرقی انڈوں سے مغربی مرغے پیدا ہو چکے مگر میں آپ کو غلط سنانے کے لئے حاضر نہیں ہوا۔ میں جو ان جوان مرگول کے ساتھ مل کر آپ کے پاس پہنچا تو اس کی علت غائی صرف یہی تھی کہ آپ کو اس خطہ سے آگاہ کروں جو ذاتی طور پر آپ کو درپیش ہے۔ ایک دفعہ آپ میرا مقابلہ کر کے رک اٹھا چکے ہیں۔ اب آپ کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں غازی کمال پاشا کے خیالات کی توسیع ہو اور دعویٰ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے یہ خیالات اُس وقت سے ہیں جب ابھی کسی نے غازی پاشا کا نام بھی نہ سنا تھا۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ قوم کے لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملائیے اور اپنی مشرقی لکڑوں کوں کو جاری رکھتے۔

(۳)

جب یہ بڑھا اپنی بک بک ختم کر چکا تو مجھے خیال ہوا کہ رولج مذہبی عقائد سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جو چند مستورات اس بڑھے کا گلابا بنے ہیں صرف وہ اسے مذہب کے پھندے سے پھانسی دینا چاہتی ہیں حالانکہ رولج کی جان یہ ہے کہ جہاں اس سے لڑو میں وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہی ہر جانی روزانہ اخبار میں ایک اشتہار روانہ کیا۔

”ضرورت ہے۔ سخت ضرورت ہے۔ فوراً ضرورت ہے۔ ایسے خندہ پیہم کی جو ایک بڑھے کو ہنساتے ہنساتے اس کا دم نکال دے“

سائنس کی طرف سے جواب آیا کہ جناب میں میرے کارخانے میں اور سب کچھ ہے مگر ہنسی کی ساخت شروع نہیں ہوئی۔

مذہب کی طرف سے جواب آیا کہ اخیر میں بھی ہنسی سے امداد طلب کرنا مذہب کی توہین ہے۔
اس جواب پر تو لا حول پڑھا اور پھر شیطان کا خط شوق سے کھولا۔ لکھتے ہیں۔

”حضرت میرے ایک چیلے سے میرے دوسرے چیلے کو قتل کرنا چاہتے ہو! بڑے اُستاد ہو کہ مولویوں کے کام میں ابلیس کی اعانت کے مدعی ہو“

جب ابلیس سے بھی مایوس ہوا تو عقل کے پوسٹ کارڈ پر نظر پڑی۔ بڑی بی نے صرف ایک

جلد کھلا۔

”تم تو سوداگی ہو“

(۴)

مگر مجھے اس بڈھے مسافر کو ضرور اچھے جہان کا ٹکٹ لے کر دینا ہے۔ اور اس ٹکٹ کے دام و کم ہیں یعنی خندہ پیسہ۔ اس قدر اس بڈھے پر ہنسا جائے، اس قدر اسے ہنسا یا جائے کہ جہاں پیری مریدی کی قبر ہے وہیں اس کی بھی مٹی بن جائے۔

فلک پیمایا

یاد

مجھے یاد کرنا جب میں یہاں سے چلا جاؤں
دور دراز کے خاموش اور سنان ملک میں۔
جب تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے سکو گی
اور نہ میں جاتے جاتے مڑ کر پھر رک سکوں گا۔
مجھے یاد کرنا جب وہ دن گذر کر دور ہو جائیں گے
جب ہم تم اپنے مستقبل کے لئے لطیف منصوبے باندھ کر تے تھے۔
صرف مجھے یاد کرنا تم جانتی ہو
کہ اس وقت مدد اور التجا کا وقت ختم ہو چکا ہو گا۔
لیکن اگر کچھ عرصہ کے لئے میری یاد فراموش ہو جائے
اور اس کے بعد میں پھر یاد آ جاؤں، تو سوچ نہ کرنا۔
اگر موت کی تاریکی اور قبر کے ڈراؤنے تغیرات کے خیالات
میرے گزشتہ جذبات کا ایک شمشہ بھی تمہارے دل میں باقی چھوڑیں
تو کہیں بہتر ہے کہ تم مجھے بھلا کر مسکرا دو
بجائے اس کے کہ مجھے یاد کر کے رنجیدہ ہو۔
(روز پٹی)

محسن عبداللہ

دریں عمل

علامہ سراقبال

ساحل افتادہ گفت گرچہ بے رستم لیک نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتہ تیر خرابید و گفت ہستم اگر میروم، گر نہ روم نیستم

ترجمہ از آزاد انصاری

کسی کنارہ ساکن نے بحر سے یہ کہا اگرچہ خلق ہوئے مجھ کو مدتیں گزریں
مگر ہنوز عجب گوگو کا عالم ہے نہ زندگی ہی مسلم، نہ موت ہی کا یقین

سنا جو موج نے لہر کے یہ جواب دیا

”اگر رواں ہوں تو زندہ سمجھ، نہیں تو نہیں“

حکیم آزاد انصاری

مبادئی سیاسیات

باب ۸

حکومت کا حیضہ اقتدار

اس سے پچھلے باب میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ علی انتظام مملکت میں نہ تو مجرد انفرادی نظریہ سے ہی کام نکل سکتا ہے نہ مکمل اشتراکی نظریہ سے، بلکہ جب کسی ملک میں کوئی فریق برسرِ اقتدار ہوتا ہے تو سب سے پہلے اُسے غالبیت اور انتہا پسندی کو خیر باد کہہ دینا پڑتا ہے اور مملکت کے حسبِ حال حکومت کرنی پڑتی ہے۔ اسی باب میں یہ بھی سرسری طور پر دکھایا گیا تھا کہ آج کل ان ملکوں میں جہاں انفرادی اصول پر حکومت ہوتی ہے، ایسے اشتراکی انتظامات جیسے ریل، تار، ڈاک اور سرپرستی مصنوعات ملکی نظر آتے ہیں، اور اس کے برعکس روس جیسے ملک میں جہاں اشتمالیت کا دور دورہ ہے، اب حکومت اپنے اصل اصول سے ہٹ کر فائگی تجارت اور بیج و شری کی اجازت دے رہی ہے۔ موجودہ باب میں اس موضوع پر ذرا غائر نظر ڈالی جائے گی اور دونوں قسم کے ممالک میں حکومت کا دائرہ اقتدار متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مملکت کا مطمح نظر۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو انفرادی حکومت ہو یا اشتمالی، اس کا سب سے اہم، بلکہ بعض کے نزدیک تو شاید واحد کام یہی ہے کہ وہ حتی الامکان افرادِ مملکت کے سود و بہبود کی کوشش کرے بلاشبہ یہ مقصد یعنی بہبود کی کوشش نہایت ہی مبہم ہے، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مملکت والوں کے فائدہ کا تعین کون کرے گا۔ اس مسئلہ پر تو آئندہ بحث کی جائے گی، یہاں صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ حکومت خواہ کسی اصول پر کاربند کیوں نہ ہو، اُس کا ظاہری مقصد ملک والوں کی بہتری کی تلاش ہے، اور یہ فرق جو انفرادیت، اشتراکیت، اشتمالیت، سراج اور اتحادیت کے مابین نظر آتا ہے، دراصل مقصدِ آخری کا فرق ہے۔

بلکہ محض طرز کار کا فرق ہے، ایک فریق کتاب ہے کہ ملک کا مفاد اسی میں مضمر ہے کہ افراد کے خانگی معاملات میں حکومت کی دسترس ہو تو دوسرا یہ کتاب ہے کہ ملک والوں کے لئے بہترین طرز کار یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کر دیا جائے، بلکہ شاید مناسب یہی ہے کہ میرے سے حکومت ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بہر نہج اس موجودہ باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ آج کل کی حکومتیں کن کن امور کو اپنے حیطہ اقتدار میں سمجھتی ہیں، اور ساتھ ہی مختلف انفرادی اور اشتراکی حکومتوں کی مثالیں دی جائیں گی۔

مملکت کی شیرازہ بندی۔ حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حتی الامکان مملکت کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دے۔ اس کے لئے دو مختلف النوع فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، ایک تو اندرونی امن و امان اور تہذیب، دوسرے بیرونی دشمنوں سے ملک کو مومن و مصون رکھنا۔ گوان دونوں مقاصد کے لئے ایک ہی قسم کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دو فرائض دراصل مختلف النوع ہیں، اور غور کیا جائے تو اندرونی حفاظت کا کام بیرونی حفاظت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بیرونی حملوں سے بچاؤ کا انتظام ایک محض میکانیکی کام ہے یعنی اگر حکومت کو فوج کی ایک خاص تعداد یکجا کرنے پر دسترس ہو اور اس کے پاس کافی سامان حرب بھی موجود ہو تو وہ ایک بڑی حد تک بیرونی خطرات سے محفوظ رہے گی۔ لیکن مملکت کو اندرونی بغاوتوں کا شکار نہ ہونے دینا اور خود اپنی بقا کی تدابیر کرنا یہ اس لئے مشکل ہے کہ حکومت مملکت کی خادم ہے، اور مملکت جملہ باشندگان ملک کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جس میں بے چین اور شورش پسند عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فی نفسہ امن و امان اور ترتیب و تنظیم کوئی آخری مقصد نہیں بلکہ دراصل کسی آخری مقصد کے حصول کی تدابیر ہیں، اور وہ مقصد مملکت کے وقتی مصلح نظر کا حصول ہے جس طرح کسی چڑیا خانے میں ایک قسم کی تنظیم، جیل خانے میں دوسری قسم کی تنظیم، مدرسے میں تیسری طرح کی تنظیم، اور گہرانے میں چوتھی طرح کی تنظیم ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ملک کسی غیر قوم کا دست نجر ہو تو ایک طرح کی تدابیر امن، اور اگر آزاد ہو تو دوسری طرح کی تدابیر امن کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تنظیم کے معنی مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ دست نجر ملک میں تنظیم اور امن و امان سے مراد وہ کیفیت ہوتی ہے جس کے تحت ملک پر آسانی سے حکومت کی جاسکے، درآں حالیکہ کسی آزاد ملک میں اس سے مراد وہ صورت حال ہے جس میں باحسن وجوہ مفاد عامہ کے حصول کی کوشش ممکن ہو۔

الغرض حکومت اپنی حفاظت کی جو تدابیر عمل میں لاتی ہے اور اُس کے لئے افراد کو اپنے احکام ماننے پر مجبور کرتی ہے، وہ اسی وقت حق بجانب سمجھی جاسکتی ہیں جب اُن سے اُن کے مخصوص مطیع نظر کے حصول میں سہولت پیدا ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حکومت خواہی نخواہی افراد کے ہر نوع کے خیالات و اقوال کو منظم کرنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ اس کے برعکس افراد کی بہت سی ایسی حیثیتیں ہیں جنہیں انفرادی حکومت علی العموم چھوٹی بھی نہیں، مثلاً رسم و رواج، اخلاق و عادات، گو اُسے ان میں بھی مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے۔ عام طور پر اس کا کام یہ ہے کہ ہر فرد کو دوسرے افراد اور مجموعوں کی بے جا دست برد سے محفوظ رکھے، اس کے ذاتی امور میں بے جا دست اندازی سے باز رہے اور مملکت کو دوسرے ممالک سے آزاد رکھے۔ یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر حکومت ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اُسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ہے گا۔ مملکت کی اس کم از کم مداخلت کا تجربہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مختلف افراد کے باہمی تعلقات کا تعین معمولی دیوانی و فوجداری قوانین کے ذریعے سے حکومت اور افراد کے باہمی تعلقات کا تعین دستوری و فوجداری قوانین کی مدد سے اور مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کا تعین قانون بین الاقوام کے ذریعے سے کیا جاتا ہے لیکن حکومت ان ہی امور میں مداخلت کرنے پر قائل نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ اپنا دائرہ عمل وسیع کرتی رہتی ہے۔ حکومت کو ایک طرف مملکت سے گہرا تعلق ہے، اور دوسری جانب ہر سیاست حاکم کی ساختہ پر داخہ ہے اور اپنے جملہ فرائض کی انجام دہی میں اس سے مدد لیتی رہتی ہے، چنانچہ ملک کے تمام وسائل و پیداوار عملاً اسی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اگر حکومت چاہے تو بہت سے ایسے کام کر سکتی ہے جن سے ملک والوں کی حالت بہتر ہو جائے، اور انہیں اپنے ذاتی کاروبار میں مدد مل سکے۔ افراد کی بہ نسبت اس کے پاس روپیہ بدرجہا زیادہ ہوتا ہے، اس لئے وہ صنعت و حرفت، زراعت، تحقیقات و تنقص میں طرح طرح کے تجربے کر کے ان کی مدد سے پیداوار دولت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے، نیز چونکہ وہی سکہ سازی کا انتظام کرتی ہے اور عملاً ہر درآمد و برآمد و چنگی کا محصول وصول کرتی ہے اس لئے اگر چاہے تو ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کر سکتی ہے۔

فوج۔ بہرنج ملک کی حفاظت و انتظام کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری اور لا بد ہیں، ایک فوج، دوسرے روپیہ۔ علاوہ بعض مستثنیات کے آج کل کے زمانے میں تمام متمدن ممالک کی فوجیں خود اس ملک کے باشندوں

۱۵ باب ۵، ہمایوں، جون ۱۹۲۷ء

۱۵ بعض ممالک (مثلاً فرانس) میں ایک غیر ملکی رسالہ "ہوتا ہے جس میں وہ غیر ملکی بھرتی کئے جاتے ہیں جنہیں اس ملک کے خارجی طرز عمل سے ہمدردی ہو۔ فرانس کا غیر ملکی رسالہ جنگ ریف میں فرانس کے دوش بے دوش لڑا۔

پر مشتمل ہوتی ہیں، اور دو ممالک خواہ سیاسی معنی میں کتنے ہی آپس کی دوستی و بہو خواہی کا دم کیوں نہ بھرتے ہوں کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ ایک دوسرے کے شہریوں کو اپنی اپنی فوجوں میں شریک ہونے دیں۔ سو برس پہلے یہ معمولی بات تھی کہ کسی ملک کے شہری دوسرے ملک میں جائیں اور تنخواہیں مقرر کر کے فوج میں بھرتی ہو جائیں لیکن آج کل کی عام بین الاقوامی معاشی و سیاسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی ملک کسی دوسرے ملک کو اپنے معمولی رسالوں میں بھرتی نہیں مہنے دیتا بعض ممالک میں تو فوجی خدمت پر محض شہریت کے علاوہ دوسری شرائط بھی لگائی جاتی ہیں، مثلاً روس میں کوئی شخص جب تک اپنے ذاتی کسب سے براہ راست دولت میں اضافہ نہ کرتا ہو اُس وقت تک اُسے ملک کی حفاظت میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اکثر ممالک حاضرو میں صرف ملک والوں پر اعتماد دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح روس میں صرف وہی باشندے قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں جو ملک کے بنیادی اصول پر عمل کرتے ہوں، یعنی جو خود اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر اپنا پیٹ پالتے اور ملک کی دولت میں اضافہ کرتے ہوں۔ یہی کیفیت عروج دولت اسلام کے زمانے میں شریعہ مروجہ کی تھی، جس کے مطابق فوجی خدمت کے لئے ضرر مسلمانوں ہی کو مجبور کیا جاتا تھا اور اہل ذمہ یعنی غیر مسلموں کی حفاظت اور فوجی خدمت سے معافی کے معاوضے میں ان سے جزیہ لینے پر کفایت کی جاتی تھی۔ اکثر قدیم تمدن ممالک میں یہ قاعدہ رائج تھا کہ خطرے کے وقت حکومت جس کی شہری کو چاہتی مملکت کی حفاظت کے لئے طلب کر لیتی، اور چونکہ قواعد، تنظیم و ترتیب کا آج کل کی طرح رواج نہ تھا، اس لئے حکومت کو اس میں بہت آسانی ہوتی تھی۔ آج کل کی مرتب و منظم افواج کے دور میں بہت سے ممالک ایسے ملیں گے جن میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ جاری ہے، مثلاً فرانس میں ہر ۲۱ سالہ شہری کو ایک یا سو اس سال کے لئے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، اور حکومت جب چاہے ۵۲ سال تک کے شہریوں کو باضابطہ فوجی خدمت کے لئے طلب کر سکتی ہے، اسی طرح جاپان میں ہر شہری کو جس کی عمر ۱۷ سال سے تو متجاوز ہو لیکن ۴۰ سال سے بڑھ نہ گئی ہو، حکومت ملک کی حفاظت کرنے کے لئے قانوناً طلب کر سکتی ہے یہ سلطنت

۱۷ جزیہ کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کا تعین یا تو عہد نامے کے فیصلے سے ہوتا تھا اور نہ خلیفہ وقت اس کا تعین کرتا تھا۔ بہر حال یہ محصول و اہل اہل الذمہ یعنی غیر مسلموں کے حقوق، جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے میں مانگ لیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں پر فوجی خدمت لازمی تھی اور غیر مسلموں پر معاف تھی، چنانچہ اول الذکر پر ملک کی حفاظت کا پورا بار پڑتا تھا۔ جزیہ سے عورتیں، بچے، اندھے، مریض اور تارکان دنیا بری تھے۔ دیکھو عبد الرحیم ص ۱۷۰

برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ دو ایسی ہیئتیں ہیں کہ ان میں فوجی خدمت لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے، گو پچھلی جنگ عظیم میں برطانیہ عظمیٰ میں بھی چند سال کے لئے فوجی خدمت لازمی کر دی گئی تھی۔

روپیہ ملک کا انتظام چلانے کیلئے دوسری ضروری چیز روپیہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ کاروبار کی انجام دہی کیلئے باشندگان ملک پر محاصل عاید کرے ان محاصل کی نوعیت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ ہندوستان پر قدیم میں ہندوؤں کے عروج کے زمانے میں سرکاری آمدنی کے ذرائع محاصل درآمد و برآمد کے علاوہ زرو جواہرو، جنگلات، پیداوار باغات، پیداوار خورد و نوش، اور سرکاری اراضیات پر مشتمل تھے۔ شیوع اسلام کے بعد عہد خلافت میں مسلمانوں سے عشر، زکوٰۃ و خمس، اور غیر مسلموں سے جزیہ لیا جانے لگا۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل میں اس قدر ترتیب و تنظیم نہیں تھی جتنی آج کل پائی جاتی ہے، اور اکثر شاہان مغرب اجاروں و عہدوں کی خرید و فروخت، پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعے سے (جنہیں واپس دینے کا خیال بھی نہ ہوتا تھا) روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے۔ نائنٹھ حال کے متمدن ممالک کی آمدنی کا دار و مدار عام طور پر علاوہ محاصل درآمد و برآمد و محصول جنگی کے محاصل وراثت، اور محاصل آمدنی، زمینداری و مکانات پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دیئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہو جاتا ہے، مثلاً ڈاک، تار ٹیلیفون، کافذ مہور وغیرہ، اور آج کل پیٹنٹ کے جو قوانین رائج ہیں انہیں دراصل قدیم اجارہ فروشی کے باقیات تصور کرنا چاہئے بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیاء کے بنانے اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے۔ جیسے فرانس میں سگریٹ اور دیاسلائی، اور ہندوستان میں افیون۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں وفاقی حکومت رائج ہے، عام طور پر بعض محاصل مرکزی ادارت کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور بعض ریاستی ادارت کو تفویض کر دیئے جاتے ہیں؛ مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں محاصل درآمد و برآمد، محصول آمدنی و دیگر ہم جنس محاصل کے عائد

۷۵ دیکھو ارتھ شاستر، مترجم انگریزی ڈاکٹر شام شاستری، حصہ ۲، باب ۶

۷۵ اسلامی محاصل کے لئے دیکھو عبدالرحیم، باب ۱۱ عشر اس اراضی کی آمدنی کا دسواں حصہ ہوتا تھا جو مسلمانوں کی ملک ہو۔ اور خمس اس اراضی کی آمدنی کا پانچواں حصہ جو غیر مسلموں سے مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہو۔ خرید کے لئے دیکھو مائتہ نمبر و بالاخر ان ممالک سے وصول کیا جاتا تھا جو غیر مسلموں کے قبضے میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

۷۹ ”پیش کش“، ”جبری قرضوں“ وغیرہ کے لئے دیکھو گرین، ”تاریخ اہل انگلستان“، مترجمہ قاضی تلمذ حسین، (مطبوعات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) یا کوئی دوسری تاریخ دستور انگلستان۔

کرنے کا اختیار مرکزی ادارت کو حاصل ہے، اور محاصل مملوکات و دیگر براہ راست محکمات کو برائے منوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ برطانوی ہند میں مرکزی اور صوبہ داری مالیات کا دار و مدار دونوں ادارت کی باہمی تقسیم کار پر ہے، چنانچہ مرکزی ادارت درآمد و برآمد آمدنی، ریل، ہمار، ڈاک اور نمک پر محاصل عائد کرنے کے مجاز میں، اور صوبہ جتا مالگنداری، آبکاری، زراعت، جنگلات کا غنہ مہمور اور تحمیل کی مدات سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ معمول آمدنی میں جو اضافہ ہوتا ہے اس میں سے ۲۵ فی صدی اس صوبہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جہاں کی آمدنی میں وہ اضافہ ہوا ہو۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے ہر صوبہ کو ایک خاص رقم مرکزی حکومت کی مذکورہ پڑتی تھی، لیکن اب مرکزی محاصل میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

تنظیم۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مملکت ایک ایسا فطری ارادہ ہے جو ہماری زندگی کا جزو لا ینفک ہے اور اس کی ضرورت سب سے زیادہ اس لئے پیش آتی ہے کہ مختلف افراد کے مابین اور نیز ان کی اجتماعی اور انفرادی خواہشات کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے اور اس سے معاشرۃ انسانی کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس کا انسداد کر لئے۔ افراد اور مجموعوں کو مرتب و منظم کرے اور ایسے قوانین بنائے جن سے اس تصادم کا کم سے کم اندیشہ باقی رہ جائے، نیز اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دے۔ اس ترتیب و تنظیم کے لئے سب سے پہلے تو ملک کے حدود و اربعہ کا تعین اور ملک کے مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا کام ہوتا ہے جس کے بغیر کسی حکومتی ادارے کے لئے اپنے دائرۃ اقتدار کا تعین ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہر انسان کے جان و مال کو دوسروں کی دست برد سے بچانے کے لئے قواعد بنائے جائیں اور ایسی سزائیں تجویز کی جائیں جو دوسروں کے لئے باعث عبرت، اور ساتھ ہی (بشرط امکان) خود مجرم کے لئے باعث تنبیہ ہوں۔ ایسے محکمہ جات کا قیام بھی لازمی ہے جو ان قواعد یا قوانین کی خلاف ورزی یا افراد کے باہمی تصادم کی صورت میں حکم پانچ کا کام کرے اور ان قواعد کے مطابق تجویز کر کے اس کا نفاذ کر لے۔

مور فضلاء بالا سے معلوم ہوا کہ حکومت کے فرائض سہ گانہ ہیں یعنی ملک کو بیرونی حلوں اور اندرونی بے چینی سے محفوظ رکھنا، افراد کی بیش از بیش آزادی، مملکت کے حصول و قیام کی غرض سے خاندانی تعلقات، اہل دمال، تجارت و حرفت کے لئے قوانین بنا کر انہیں نافذ کرنا، اور ایسی عدالتیں قائم کرنا جو ان قوانین کے مطابق ان افراد سے باز پرس کر کے ان لوگوں کو پاداش کو پہنچائے جنہوں نے قوانین مروجہ کی خلاف ورزی کی ہو۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جن کے بغیر حکومت ملک کا انتظام چلا ہی نہیں سکتی۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آج کل کے زمانے کا عام رجحان یہ ہے کہ حکومت کی مداخلت کا دائرہ اقتدار روز بروز وسیع ہو رہا ہے، چنانچہ ان ممالک میں بھی جہاں انفرادی طرز پر انتظام کیا جاتا ہے، بہت سے ایسے امور حکومت کے دائرے میں آگئے ہیں جو نصف صدی قبل اس سے باہر تھے۔ انہیں آسانی و سہولت کی خاطر اختیاری فرائض کہنا مناسب ہوگا تاکہ ان کا لازمی فرائض حکومت سے امتیاز کیا جاسکے۔ اختیاری فرائض دو قسم کے سمجھے جاسکتے ہیں، ایک میں تو وہ امور شامل ہیں جو حکومت کی مداخلت کے بغیر برائے کار آتے ہی نہیں اور دوسرے جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بھی انجام پا سکتے تھے لیکن جن کا تعلق ایسی حالت میں افراد سے ہوتا۔ ثانی الذکر اہم میں مداخلت گویا اشتراکیت نما ہوگی، اور اول الذکر امور کی نگرانی نیم اشتراکی۔

نیم اشتراکی فرائض۔ سب سے پہلے نیم اشتراکی فرائض حکومت یعنی ان فرائض کو لیجئے جو حکومت کی مداخلت کے بغیر غالباً پورے نہ ہو سکتے یا کم از کم زیادہ وسیع پیمانے پر انجام کو نہ پہنچتے۔ آج کل کے زمانے میں حکومت نے اپنا فرض اس کو سمجھ لیا ہے کہ حتی الامکان باشندگان ملک کو بہتر بنانے اور ان کی معاشی حالت کو درست کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ اب شاید شکل سے کوئی ایسا عقیدہ پرست انفرادی شکل کا ہر سوٹ پسند کی طرح کلیتہً قبلے اصلاح کے مسئلے پر اعتقاد رکھتا ہو۔ آج کل کی انفرادی حکومتیں بھی اس کو کوشاں رہتی ہیں کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین وسائل بہم پہنچائیں، ان کی تندرستی کی نگہداشت رکھیں، گاؤں حفظانِ صحت کا انتظام کریں، جگہ جگہ شفا خانے کھولیں، تحقیقات و حکمیاتی تجسس کی خاطر مناسب متنبہات پر عجائب خانے اور نوادار خانے کھولیں اور کوشش کریں کہ ملک کے صنعتی حرفتی و زراعتی وسائل میں اضافہ نیز مستمدن اور ترقی یافتہ حکومتیں اعداد و شمار کا محکمہ بھی قائم کرتی ہیں تاکہ مختلف شعبوں اور محکموں کو ملک کی موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے اور اعداد و شمار کو پیش نظر رکھ کر وہ اس حالت کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جو زمانہ حال کی مستمدن انفرادی حکومتوں نے اپنے سرے لئے ہیں، اور اگر ان کو انجام دے دیں وہ کوشاں نہ ہوں تو یہ امور شاید سرے سے انجام ہی نہ پائیں، اس لئے کہ افراد کے وسائل اس قدر بڑھے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ان کا حلقہ اثر اس قدر وسیع ہے کہ وہ ان سب باتوں کو فرداً فرداً یا ہم متفقہ بھی بڑے پیمانے پر پورا کر سکیں۔ بلاشبہ امریکہ اور مغربی یورپ میں کچھلے چند سالوں میں بعض نہایت علم والا

رتیں اور کاروباری جتنے قائم ہو گئے ہیں جن کا سرمایہ کروڑوں اور اربوں روپیہ کا ہے، تاہم ان میں سے ایک صرف ایک مخصوص تجارت سے متعلق ہے، اور اس کا نصب العین مملکت کا مفاد نہیں بلکہ حصہ داروں کا مفاد اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہے، چنانچہ یہ بھی اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے جو حکومت کے ان نیم اشتراکی فیض سے دست بردار ہونے پر پیدا ہو گئی تھی۔

اشتراکی فیض اس کے علاوہ حکومت نے اپنے سپرد ایسے کام بھی کر رکھے ہیں جو بالکل اشتراکی ہیں جو مجرد انفرادی اصول کے مطابق حکومت کی دسترس میں نہیں رہنے چاہئیں بلکہ افراد ہی کو انجام دینے ہئیں۔ اس زمرے میں سب سے پہلے ذرائع حمل و نقل آتے ہیں جیسے ریلوں کی تعمیر، سڑکوں کی دہنی، ڈاک، تار کا انتظام، ٹیلیفون کی نگرانی وغیرہ۔ آج کل کے زمانے میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کا درآمد اور ضروری وسائل ترقی کو حکومت اپنے حال پر چھوڑ دے۔ چنانچہ اکثر ممالک میں تو یہ سب حکومت کے حیطہ اقتدار میں آگئے ہیں اور بعض میں حکومت نے ان پر اپنی نگرانی ہی رکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً ریلوں کو لیجے۔ یورپ اور مدونستان میں عام رجحان یہ ہے کہ ریلیں مملکت ہی کی ملک ہوں، چنانچہ پچھلے پانچ سال میں ہندوستان تین بڑی بڑی ریلیں، یعنی ایسٹ انڈین، گریٹ انڈین پینن سولہ، اور اودھ و روہیلکھنڈ، اپنی اپنی لیموں سے محل کر حکومت کے قبضے میں آگئی ہیں۔ انگلستان میں اس کے برعکس ریل کی مختلف شرکتوں کو مدغم کئے بڑی بڑی شرکتیں بنائی جا رہی ہیں اور حکومت ان پر براہ راست نگرانی رکھتی ہے؛ جرمنی میں ریلیں، عمومی حکومت ہی کے قبضے میں ہیں۔ ریلوں کے علاوہ ملک کے قدرتی وسائل میں ترقی کے سامان بہم پانا بھی حکومت کا فرض ہے، چنانچہ اگر ملک میں کوئی خاص صنعت یا کسی حصہ ملک میں زراعت میں کمی یا فہم ہو تو حکومت خزانہ سرکاری سے روپیہ خرچ کرتی ہے، کاشتکاروں کو تقادی دیتی ہے، آبپاشی کے سامان بہم کرتی ہے اور مجبکہ مجبکہ نمونے کے کھیت اور کارخانے قائم کر کے لوگوں کو بہترین ذرائع استعمال کرنے کی نیب دیتی ہے۔

سب سے آخر میں وہ فرائض ہیں جو بالخصوص مزدوروں اور غرباء کے مفاد کی غرض سے حکومت پر عائد تھہرتے ہیں اور یہ وہ ہیں جن پر اشتراکیت کا پرتو خاص طور پر نمایاں ہے۔ یکے انفرادی بھی اس واقعہ کا

۵ نمائندہ مل میں یورپ اور امریکہ کے تجارتی ارتقا کی تاریخ دراصل کاروباری جتنوں کی تاریخ ہے۔ اس کے لئے دیکھو ج، و، جنکس "کاروباری جتنوں کا مسئلہ" J.W. Jenks: The Trust Problem ج ۱۲، صفحہ ۱۷۰

اٹکار نہیں کر سکتے کہ مزدوروں اور صنعتیوں کی حالت عام طور پر نہایت زہوں ہے، اور وہ جوائیڑی چوٹی کا نور لگا کر ملک کی عام مرفہ الحالی میں اضافہ کرتے ہیں، انہیں اس کا صحیح معاوضہ آرام و آسائش کی شکل میں نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے فلاکت زدہ طبقے کی حالت سدھارنا اور مزدوروں کی آسائش کا انتظام، دونوں ہمیں ترقی یافتہ حکومتوں نے اپنے ذمہ کر لی ہیں، اور جبری ہیہ، وظائف معمرین، ارزاں آرام وہ مکانات کی تعمیر قوانین کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طریقوں سے غریب اور نیچے درجہ کے طبقے کا معیار زندگی بڑھایا جاتا ہے۔ جبری ہیہ کا قاعدہ ۱۸۸۳ء میں جرمنی میں شروع ہوا اور اس کا اتباع ۱۹۰۸ء میں انگلستان میں کیا گیا۔ وظیفہ معمرین کا قاعدہ آسٹریلیا میں مدت سے جاری ہے، اور اس کے مطابق ہر درخواست گزار شہری کو جس کی عمر کم سے کم ۶۵ برس کی ہو اور جو کم از کم ۲۰ سال سے آسٹریلیا میں رہتا ہو، اس شرط پر وظیفہ دیا جاتا ہے کہ وہ رشتہ گزار کی کل آمدنی کی مقدار گیارہ سو روپیہ سالانہ سے متجاوز نہ ہو جائے۔ آج کل کی انفرادی حکومتوں کو مزدوروں کے آرام تندرستی اور معیار زندگی کا اس قدر خیال ہے کہ بعض انفرادی ممالک (مثلاً انگلستان و جرمنی) میں اس کے لئے ایک وزیر مختص کر دیا گیا ہے، اور انجمن اقوام کے زیر سایہ ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں مختلف مملکتوں سے مزدوروں کے آرام و آسائش کی تدابیر کی سفارش کی جاتی ہے۔ اور حکومتیں حتی الامکان ان پر کاربند ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ نیز آج کل کے اکثر مستند ممالک میں کارخانوں اور اورگریوں کے مزدوروں کے لئے روزانہ اور ہفتہ وار گھنٹوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے تاکہ اپنے کام سے ان پر زیادہ بار نہ پڑے اور ان کی زندگی و تندرستی برقرار رہے۔

استعمالی روس پر انفرادی اثرات۔ اوپر کے پاروں میں اُن اشتراکیت نما امور کو واضح کرنے کی

۱۳۰۰ اس قسم کے مکانات منجملہ دوسرے ہندوستانی شہروں کے بمبئی اور فرخندہ بنیاد حیدر آباد دکن میں بھی بنوائے گئے ہیں
۱۴۰۰ دیکھو سالانہ مدبری "Statesman's Year Book" ۱۹۲۸ء صفحہ ۱۷۰ جہاں پچھلے دس سال کے اجتماعوں کی قراردادیں دی ہوئی ہیں۔

۱۵۰۰ کارخانوں کے متعلق ہندوستان میں جو قواعد رائج ہیں وہ قانون کارخانہ جات ۱۹۱۱ء پر مبنی ہیں۔ انگلستان کے قانون کارخانہ جات کے لئے دیکھو لنڈری: قوانین انگلستان Halsbury's Laws of England جلد ۱۴، حصہ ۲

۱۶۰۰ کارخانہ جات Factorie دفعہ ۳۳۳-۳۳۴

کوشش کی گئی ہے جو زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انجام دیتی ہیں۔ اب اس باب کے آئندہ حصہ میں اسی طرح یہ دکھایا جائے گا کہ دنیا کی واحد اشتمالیت پسند مملکت، یعنی روس، مجرد اشتمالی عقیدے سے کس قدر ہٹ گئی ہے اور وہاں کون کون سے انفرادی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ ہمیں اس موقع پر وہ سیاسی واقعات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے جو ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئے، چنانچہ اس وقت یہ بیان کر دینا بالکل کافی ہو گا کہ مارچ ۱۹۱۷ء سے آٹھ ماہ بعد تک روس میں مختلف سیاسی فریق یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہے، اور اس ملک کی سیاسیات کو اُس وقت تک استقلال نصیب نہیں ہوا جب تک ۱۹۱۷ء کو لینن کے قبضے میں تمام حکومتی پرزے نہیں آ گئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ انتہائی اشتمالی اصول کی ترویج کا زمانہ ہے، اشتمالی گروہ کو ایک عظیم الشان ملک اپنے تجربات کے لئے مل گیا تھا، چنانچہ ابتدا میں انہوں نے خوب دل کھول کر اپنے اصول کی ترویج کی۔ تمام اراضی ضبط کر لی گئی اور اسے کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کاشتکاروں کو صرف اسی قدر پیداوار رکھنے کا حق دیا گیا جتنے کی انہیں ضرورت تھی، باقی تمام پیداوار حکومتی کمٹیوں میں جمع ہونے لگی، گرنیاں، تماشاکاہیں، کارخانے، مختلف دھاتوں کی کانیں، ریلیں، قہوہ خانے، فرض جس قدر سامان ضرورت و سامانِ قعیش تھا سب پر حکومت قابض ہو گئی اور اپنی طرف سے اس کا انتظام کرنے لگی۔ ۱۹۲۰ء کا زمانہ اس انتظام کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، لیکن یہی وہ دور ہے جب ملک کی پیداوار میں کمی، ضروریاتِ زندگی کی گرانی اور ملک میں عام افلاس کی کیفیت صریحاً نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس غالیِ اشتراکی طرزِ عمل کی وجہ سے بحران کی جو کیفیت رونما ہوئی اس کا فوری سبب ایک تو یہ تھا کہ زراعت کو ایک بڑا دھکا

٭ لال، س، لاین L.S. Lyon کی کتاب ”موسور“ پیسے کا انتخاب Making a Living کے صفحات ۲۲۵ و ۵۲۴ پر دو نہایت نفیس جدول دیئے گئے ہیں۔ جن میں سے اول الذکر میں ممالکِ متحدہ امریکہ کی مرکزی حکومت کے کاروبار کو اور دوسرے میں وہاں کی ایک ریاست یعنی مینے سوٹا کی حکومت کی مساعی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان جدولوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں کس حد تک افراد کی بہبود کے واسطے کوشاں ہیں۔

٭ ۱۹۱۹ بولشوی اصول کے ارتقا کے لئے دیکھو فاربمین: ”لینن کے بعد“ Farberman: After Lenin حصہ ۲۱؛ نیز جبرٹر سالانہ ”Annual Register“ بابت سالانہ ۱۹۱۷ء و ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۵ء۔

اس کے مختصر حالات کے لئے ”چرواقتات سال“۔ These Eventful Years جلد ۲، باب ۴۸ کا مطالعہ کافی ہو گا۔

لگا تھا، اور زراعتی پیداوار میں قلت اور اس کی گرانی کی وجہ سے اس کے اور مصنوعات دستکاری و میکائی کی بیعتوں کے مابین ایک عظیم الشان تفاوت پیدا ہو گیا تھا، ساتھ ہی اس کے سکے یعنی کاغذی رول کی قیمت تقریباً صفر پر جانے سے بھی ملک کے مصائب میں گونہ اضافہ ہوا۔ بہر حال ان سب باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ بعد جو جدید حکومت کا گویا پشت پناہ بنا ہوا تھا یعنی مزدور و کاشتکار حکومت کے مخالفین میں شامل ہو گیا۔ حکومت کو جبراً و قہراً اپنا طرز عمل بدل دینا پڑا۔ آخر کار سال ۱۹۲۱ء کے ابتدا ہی میں لینن کے خاص ایما سے جدید معاشی طرز عمل کی بنیاد پڑ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ طرز عمل کی اس تبدیلی کے آثار پہلے ہی نظر آ رہے تھے، اور خود لینن ملک کو اس کے نئے تیار کر رہا تھا۔ دسویں اشتراکی کانگریس میں لینن نے ایک زوردار تقریر میں یہ تحریک کی کہ بجائے غلہ کے دستی کھیتیوں میں جمع ہونے کے کاشتکاروں کو اس کی قیمت (یعنی دوسرے الفاظ میں ایک مقررہ لگان) کو مناسب ہو گا، اور اپنی مقبوضہ پیداوار کے مبادلہ و انتقال ملکیت کا اختیار خود کاشتکار کو ہونا چاہئے، پنچہ ۲۱۔ اپریل ۱۹۲۱ء کو یہ تحریک قانون کی شکل میں منظور ہو گئی، اور کاشتکاروں کو غلہ منتقل کرنے کا اختیار دیا گیا۔ یہی وہ قانون تھا جسے جدید معاشی طرز عمل کی بنیاد کہنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک لینن کا شاید سب سے کامیاب یہی تھا کہ اُس نے بھانپ لیا کہ غالی اشتراکی طرز عمل کا رواج بالکل ناممکن ہے، چنانچہ اُس نے جان بکر سربراہ داری کی طرف قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ ”حضرات، ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے اصلی داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔“

۵۔ جولائی ۱۹۲۱ء کو ایک قدم اور بڑھایا گیا، یعنی کارخانے اور گریں مختلف شرکتوں اور افراد کو پیسے پر دی گئیں۔ اس کے بعد پہلے تو انجمن ہائے امداد باہمی کو روپیہ کام میں لانے کی اجازت دی گئی اور رفتہ رفتہ دیگر بیج کے راستے سے جملہ رکاوٹیں اٹھا دی گئیں، چنانچہ اب روسی معاشی اصول اور انفرادی معاشی طرز میں بہت کم فرق باقی رہ گیا۔ روپیہ کی ترویج کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا از سر نو اچھا ہو گیا، دوکانیں کھل گئیں اور از سر نو خرید و فروخت کی کیفیت تین سال بعد نظر آنے لگی۔ ۹۔ جولائی کو ریلوں پر سفر کرنے کا کرایہ لیا جانے پر اگست کو ڈاک اور تار کا محصول عائد ہو گیا، ۵۔ ستمبر کو پانی بجلی اور گیس خرچ کرنے کا معاوضہ لگایا جانے لگا۔ اکتوبر ہی میں سال بعد ٹراموے کا کرایہ اور کپڑوں کی دھلائی لی جانے لگی۔ ستمبر اور اکتوبر میں اراضی، گوداموں

اور دوکانوں کے کرایہ کا طریقہ دوبارہ رائج کیا گیا اور رفتہ رفتہ ہر ایک چیز کی قیمت یا اجرت روس میں پہلے کی طرح ایک معمولی بات ہو گئی۔ سرمایہ داری کی طرف یہ میلان برابر جاری رہتا ہے تا آنکہ ۱۹۲۵ء میں دوازدہ سالہ بچے کے فیملی سے اراضی منتقل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور مزدوروں کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا انتظام کرنے دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی غیر مالک کے سرمایہ کو روس کی طرف منتقل کرنے کے طرز عمل کی ابتدا ہوتی ہے جس کا اولین مظاہرہ یہ ہے کہ اسی سال "شکریت" معدنیات زبرد ریائے لینا "کو از سر نو سونے کی کانوں کا ٹھیکہ لے دیا جاتا ہے۔

الغرض جہاں زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انتہائی انفرادی اصول سے ہٹ کر بہت سے ایسے کام کرتی ہیں جنہیں افراد بھی آسانی سے انجام دے سکتے ہیں، وہاں روس جیسے اشتمالیت پسند ملک کو، جس میں جملہ قدیم آثار انفرادیت کو بالکل نابود کر کے اشتمالیوں نے گویا ایک جدید باب کی ابتدا کر دی تھی، اپنے مرغوب اور چیتے اصول سے بہت کچھ ہٹ جانا پڑا ہے۔ اگر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انفرادیت، اشتراکیت اور اشتمالیت یہ سب مملکت کے حقیقی مقاصد کے حصول کے مختلف طریقے ہیں۔ ان طریقوں کا تعین مختلف ممالک کی تاریخ ان کی جغرافیائی کیفیات اور وہاں کے باشندوں کی عادات و اطوار پر منحصر ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسا سیاسی طرز عمل دریافت نہیں ہوا جو یکساں جملہ ممالک پر عادی ہو۔ وہی حکومت بہترین ثابت ہوگی جو مملکت کے مقاصد کی ترویج میں حتی الامکان کوشاں ہو، اور مملکت کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہئیں، اس پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات باب ۸

League of Nations	انجمن اقوام	Monopoly	اجارہ
Cooperative Society	انجمن امداد باہمی	Convention	اجتماع
Survival of the fittest	بقائے اصلح	Statistics	اعداد و شمار
Paragraph	پارہ	Unit	اکائی

Tithe	عشر	Benevolence	پیشکش
Foreign Legion	غیر ملکی رسالہ	Registration	تسبیل
Trusts & Pools	کاروباری جتے	Organization	تنظیم
Stamped Paper	کاغذِ مہمور	New Economic Policy (Nep.)	جدید معاشی طرزِ عمل
Barter	مبادلہ	Excise	چنگی
Death Duties	مماصل وراثت	Scientific	حکیماتی
Income Tax	محصولِ آمدنی	Fifth	خمس
Mechanical	میکانی	Company	شرکت
Museum	نوادرخانہ	Lena Gold Fields	شرکتِ معدنیات
Federal Government	وفاقی حکومت	Company	زیر دریائے لینا

شاعر

دو بہت دور آسمانوں میں، موسمِ خزاں کے وقت بجلیاں چمک چمک کر آنکھوں کو چند صیادتی ہیں۔
 آندھی آہستہ آہستہ اٹھتی ہے، وہ زور زور سے سائیں سائیں کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہے اور اکثر اپنے خوفناک
 رول اور طویل بازوؤں پر، دو افتادہ مسافر کی جھمی جھمی کر اہول اور آہ و فغاں کی دردناک صداؤں کو لئے ہوئے اڑا کرتی ہے
 اور جب تمام دنیا پر ایک دشتناک سکوت طاری ہو جاتا ہے اور رات کی تاریکی اپنا سیاہ برقعہ اُسے اڑھا دیتی
 تو شاعر و نگین اور شاعر شاعر باہر آتا ہے۔ ویران، سنسان اور غیر آباد راستوں پر چلنے لگتا ہے اور ان براہیوں نظر
 ڈالتا ہے جن کی طرف جانے کے لئے زندگی نے بہت سے دروازے کھول دیے ہیں۔
 خطرات سے ہٹتی، جا بجا ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے اور ہر ظاہر و برائی سے غافل رہتا ہے تاہم اکثر اس کا سینہ
 دل کا سکین بن جاتا ہے اور اکثر اس کے اندر وہ رخساروں پر بڑے بڑے آنسو جمع ہو جاتے ہیں۔
 آہ یہ آنسو دماغی اور روحانی تکلیف کا ثبوت ہیں، جن سے اس کا دل روز بروز زخمی ہوتا جاتا ہے اور جو
 اس کی تلقین کیا کرتے ہیں۔
 (ترجمہ)

عشر عابدی

تقاضائے وفا

گئے وہ دن کہ دل میں سوزِ غم تھا گئے وہ دن لبوں پر جب تھیں آہیں
تھی ہر دم دید کی دل میں تمنا نظارہ جو ہمیشہ تھیں نگاہیں
کسی کی گردن نازک میں ہر دم محبت سے حمل تھیں یہ باہیں
کوئی ناز و ادائے جاں فزا سے بتاتا تھا مجھے جینے کی راہیں

مگر وہ عہدِ ندرتیں ہو چکے نہیں باقی وہ اُن کی جلوہ گاہیں
ہوئیں محروم اب کیفِ اثر سے نگاہیں! آہ وہ جادو نگاہیں!

دلِ غاب تو ہمیں بھی نہیں ہے کہ ظالم گیسوؤں والوں کو چاہیں
کہاں سے آئے دل میں شوقِ سجدہ نہیں ہیں حسن ہی کی بارگاہیں
ہو رنج، اگر جانکاہ، روئیں اگر چوٹیں لگیں دل پر، کراہیں

غرض دنیا ہی اپنی اور ہے اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ اُن کی نگاہیں

مگر بائیں ہمہ چپکے سے کوئی یہ دل میں کہہ رہا ہے پھر بھی چاہیں

تقاضائے وفا اکبر ہی ہے

محبت ہونہ ہو لیکن نباہیں اکبر سروری لکھنوی

جزیرہ جاوا

بحر ہند میں جزیرہ جاوا ایک سرسبز و شاداب زمردین خطہ زمین ہے۔ گرد و نواح کے تمام جزیروں میں یہ سب سے زیادہ زرخیز ملک ہے۔ اس جزیرے پر ڈچ قوم کی حکومت ہے اور یہ ان کا بڑا بیش قیمت مقبوضہ ہے۔ کوہ آتش فشاں کا سلسلہ جیبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری ہے۔ اکثر پہاڑ ہمیشہ آگ برساتے رہتے ہیں۔ دریا یہاں بے شمار ہیں اور زمین کا چپہ چپہ زرخیز ہے۔ چونکہ سطح سمندر سے یہاں کی زمین بلند ہے اس لئے باوجود خط استوا پر واقع ہونے کے یہاں کی آب و ہوا نہایت معتدل و خوشگوار ہے۔ جو سطح زمین آٹھ سو فٹ سے زیادہ بلند ہے وہاں سرد ملکوں کے پودے اور درخت پائے جاتے ہیں۔ وادیوں اور میدانوں میں مختلف قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً چاول، کافی، چار، نیل وغیرہ۔ گنے اور یہاں کے مخصوص مصالحوں کی کاشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ضروریات زندگی اس قدر افراط کے ساتھ قدرت نے مہیا کر دی ہیں کہ باوجود اس کے کہ ملک کا بیشتر حصہ اب تک جنگل ہے یہاں کی آبادی جس کا شمار دس لاکھ سے زائد ہے پچاس ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے جو بڑے کا طول تقریباً چھ سو میل اور وسط میں اُس کا عرض تقریباً ساٹھ میل ہے۔

یہاں کی آبادی میں ملنے قوم کا عنصر غالب ہے جو مغربی کوہستانی علاقہ میں سنڈین کے نام سے موسوم ہے یہ قوم اب تک غیر ملکی لوگوں میں غلط ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ مشرقی علاقہ میں مادوری ایک قوم آباد ہے یہ لوگ بڑے مضبوط اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ہندو فتوحات کے زیر اثر وسط جزیرہ کی آبادی نسبتاً مہذب و تمدن ہو گئی تھی۔ اس دورِ تمدن کے آثار اب تک بکثرت شکستہ مندروں کی صورت میں پائے جاتے ہیں، جن سے اُس زمانہ کی معاشرت و صنعت و فنون کا پتہ چلتا ہے، کہ یہ لوگ بھی اسی قدر ذہین اور کارگر تھے جس قدر کہ وہ لوگ جنہوں نے اہرام مصری تعمیر کئے تھے۔ پندرھویں صدی میں مسلمانوں نے اس جزیرے پر حملہ کیا تھا۔ ان کے تسلط سے یہاں کے قدیم مذہب اور خصوصیات ملکی پر بڑا اثر پڑا۔

یہاں کے باشندے عموماً ذہین ہوتے ہیں۔ ان کی زبان اور لب و لہجہ میں اور ان کی رسوم وغیرہ میں سبکی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے پاس ان کی قدیم زبان میں جو سنسکرت سے بہت مشابہ ہے ایک مقدس کتاب

ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ادب و علوم قدیمہ کا کچھ اور ذخیرہ بھی اس زبان میں اب تک محفوظ ہے۔ یہاں خوشخطی کا بڑا دلچ ہے۔ اہل جاوا کی تحریر کی خوبصورتی اور خوشنمائی دیکھنے سے قلعہ رکھتی ہے۔ یہ لوگ زیب و زینت، رنگ و فضا کے بڑے دلدادہ ہیں۔ یہاں کی مشہور صنعت و حرفت کشتی سازی، کاسہ گری، جرم سازی، پامپ، پانی کشیدہ کاری، رنگ سازی ہے۔ یہ لوگ کپڑوں پر تصویریں بنانے اور ہتھیاروں اور برتنوں پر نقش و نگار بنانے میں بڑے ماہر و مشاق ہیں۔ اس کے علاوہ زراعت بھی یہاں کامرغوب پیشہ ہے۔ کاشتکار بڑے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔

اہل جاوا عموماً خوش اطوار و عافیت پسند ہوتے ہیں۔ فرمانبرداری ان کی فطرت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رُچ حکومت کے زیر اثر یہ لوگ نہایت امن و امان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں اہل چین، اہل ہند، اہل عرب اور دوسرے ملکوں کے لوگ بسلسلہ تجارت وہاں آکر آباد ہو گئے ہیں اور اصلی باشندوں کے ساتھ مخلوط ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اہل جاوا بہت آزادی کے ساتھ دوسری اقوام سے شادی بیاہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اہل چین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے یہ لوگ اپنے ملک سے اپنی عورتیں ساتھ لاتے ہیں۔

ابجد میں جب یورپ نے یہاں نوآبادیوں کا سلسلہ قائم کیا تو سب سے پہلے پرتگالی یہاں آئے لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہاں کی سرزمین میں قدرت نے کیسے کیسے خزانے چھپائے رکھے ہیں۔ یورپ صدی کے آخر میں رُچ قوم نے اپنے قدم جانے شروع کئے۔ اسی درمیان میں انگریزوں کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی۔ لیکن ایک صدی کے بعد انگریز تو یہاں سے چلتے بنے مگر رُچ لوگ اپنا ڈیرہ ڈالے رہے اور جنگی بحار بول کے ساتھ رفتہ رفتہ تمام ملک پر انہوں نے اپنا قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۷ء تک جاوا پر انگریزوں کا تسلط تھا لیکن صلح عام کے بعد انگریزوں نے یہ نوآبادی ہالینڈ کو دے دی۔ اب یہاں ہالینڈ کی دو عملی حکومتیں ہیں۔ ایک تو ایسی دہائیں ہیں جن پر ملکی شہزادے حکمران ہیں لیکن ان کے مشیر کا رُچ ریزیڈنٹ ہیں، اور دوسری صورت ہے کہ ہر گاؤں میں ایک سردار یا سرگروہ منتخب کر لیا جاتا ہے اور وہی ان پر حکومت کرتا ہے۔ اہل جاوا کی طبیعت میں غلامی کا مادہ سرایت کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی انتہائی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ان کو رُچ حکومت کی ماتحتی میں کوئی ملازمت مل جائے۔

جزیرہ جاوا میں سریشیا ایک نہایت آباد تجارتی شہر ہے اور بڑا عالی شان بندرگاہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں جزیرہ مندورا واقع ہے۔ اس بندرگاہ سے ایک ریلوے لائن سو لوکمک جادی ہے۔ شہر سو لوکو جزیرے کے

اندونی حصے میں واقع ہے اور یہاں کا دارالحکومت ہے۔ ایک ملکی شہزادہ یہاں برائے نام بادشاہ ہے۔ ورنہ اصل عنانِ حکومت ٹیچ ریز یڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ سولوریلوے لائن کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ جزیرے میں ہر چاروں طرف یہاں سے ریلوے لائن جاری ہے۔ جزیرے کے اس حصے میں جو کچھ کارٹا ایکٹ کی سلطنت ہے۔ یہاں کا رئیس سلطان کے لقب سے موسوم ہے۔

یہاں اکثر شہر بارونق اور آباد میں ریلوں کی کثرت سے ان میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ سڑکیں بہت کثرت اور صاف ہیں۔ دیہاتوں کی سڑکیں بہت عمدہ اور سایہ دار بنی ہوئی ہیں۔ دریاؤں پر کثرت سے پل بنائے گئے ہیں یا کشتی کے پلوں کا انتظام ہے۔ شہروں میں خوب پل چل رہی ہیں۔ سڑکیں ہمیشہ آدمیوں سے بھری رہتی ہیں۔ لوگ طرح طرح کے رنگین اور بھڑکیلے لباس پہنے چلتے پھرتے اچھے معلوم ہوتے ہیں میزوں کی ٹوپیاں چھتے سولہ طبقی پٹاری کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ چٹاؤ دار اور مختلف رنگوں کی بنائی جاتی ہیں۔

دیہاتوں میں کثرت سے کیلوں اور بانسوں کے کچر سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان پائے جاتے ہیں یہاں تمام سال ہر موسم میں تخم ریزی کی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ تفصیلات کھیتی رہتی ہیں۔ زمین کا ایک ایک بسوہ کا نام دینا لیا گیا ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ ہرے بھرے لہرتے ہوئے دھانوں کے کھیت ان پہاڑوں کی طرف دکھائی دیتے ہیں اور ان کے بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہوتی ہیں جن کی وجہ سے پہاڑیوں کا نظارہ نہایت دل فریب و دلکش معلوم ہوتا ہے۔

موسم کی حالت تمام سال یہاں ایک سی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ بہار جیسا سماں رہتا ہے۔ اس لئے قدرتی مناظر میں ایک دائمی حسن پیدا رہتا ہے۔ قدرتی مناظر میں جس قدر رنگوں کی افراط اور گونا گونی یہاں پائی جاتی ہے شاید ہی اس قدر کہیں اور ہو۔ مارچ سے اکتوبر تک البتہ آسٹریلیا کے ریگستان سے خشک آندھیاں اس جزیرے کے شرقی حصے میں کچھ دنوں کے لئے خزاں کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں پھر ملک سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانی متواتر کسی کئی سال تک نہیں برستا خشک سالی کی وجہ سے قحط پڑ جاتا ہے اور خلق خدا تباہ و برباد ہونے لگتی ہے، لیکن جیسے ہی پانی برسنا شروع ہوا تمام ملک میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ساری فضا خوشحالی اور فراغ بالی کے ترانوں سے گونج اٹھتی ہے۔ بارش عوام سپر ہو کر ہوتی ہے۔ اور اس قدر پابندی اور التزام کے ساتھ ہوتی ہے کہ گویا کہیں بارش کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر روز وقت معینہ پر اس کا دوازدہ گھول دیا جاتا ہے اور بدل اٹھ کر پانی برسا جاتے ہیں۔

میں حیران ہوں!

میں سوچتا ہوں کہ آج سے چھ سات ہزار سال پہلے جب آدم نے پیسے کو ایجاد کیا تو اُس نے کیا خیال کیا ہوگا؟ — اُس نے ایک ایسے عقدہ کو مل کیا جس کے طفیل اس نے اپنے زمانے کو باربرداری، سواری اور گھوڑے ضروریات کے لئے بیل گاڑی جیسی کارآمد چیز دی۔ اور پھر ساتھ ہی کھار کو چک جیسی مفید شے مل گئی جس سے برتن اور دیگر اشیاء بننے لگیں۔ چرخا بنا، آدمی کاتتے، بننے، پکڑا پھینے لگا۔ دنیا کا وہ اولین مہن جو چکر کا موجد ہے جس نے وہ چیز نکالی جو آج کل موٹر میں، ریل میں، ہوائی جہاز میں رونما ہے اپنے زمانہ کا ایڈم ہوگا۔ اُن دنوں لوگ اپنے آباؤ اجداد سے اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر جانتے ہو گئے۔ اُس وقت کے لوگ یہ کہتے ہو گئے کہ اس ”جدید زمانے“ میں بھی لوگ کتنے جاہل ہیں کہ انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں۔ وہ حیوانوں کے مشابہ ہیں، ان میں ابھی تک ”بربریت، بہیمیت اور سفاکی پائی جاتی ہے۔ جوان آدمی کہتے ہو گئے کہ ابھی تک لڑکیاں اُن سے جھینپتی ہیں، ان سے بچتی ہیں اور محبت کو نہیں جانتیں۔ نوخیز، پختہ کاروں کو ابلہ۔ سٹھیا یا اور بہتر کہتے ہو گئے۔ لوگ تانبے پتیل کے برتن، ہتھیار، ساز و سامان اور زیورات کے استعمال میں چھو لے نہ سہاتے ہو گئے۔ وہ ازمنہ حجرہ کے باشندوں کو کتنا حقیر جانتے ہو گئے اور بنوعینود دنیا کے افضل ترین، اشرف ترین اور اہم ترین انسان ہو گئے۔ اس کے بعد زمانہ جدید یہ کے لوگ اور بھی مغرور، طاقتور اور لائق ہو گئے۔ پتیل تانبے کے زمانوں کو وہ بہت نیچا گردانتے ہو گئے۔ پچھلے لوگوں کی باتوں، قصوں اور روایتوں پر خوب ہنستے ہو گئے۔ ان کے کھنڈروں اور دیگر آثار کو دیکھ کر وہ لوگ کون جانے کن کن خداؤں کی درشتی اور غیض و غضب سے تھرتھراتے ہو گئے۔ اُن دنوں ایسا جو بعد میں یہودہ۔ جیہووا (Jehovah)، جوپیٹر (Jupiter)، جو (Jove) اور God بنا دیا پر اور لوگوں کے دماغوں پر مستکن تھا۔ ان دنوں ہر خارجی طاقت ذی روح تھی، ان دنوں خدا لوگوں کے بہت نزدیک تھے اور بہت مغلوب الغضب تھے۔ وہ قہاریت، جبروت اور بہیمیت سے عالم کو منظم کرتے تھے۔ ان دنوں آدم بہت پست تھا کیونکہ خداوند ستانے اور مٹانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ مگر لوگوں کے دل وسیع تھے کیونکہ وہ ایک خدا کا تصور اپنے باقی ماندہ خداؤں کی بے حسی شرا کرتے تھے۔ ان خائن بیچارہ و فرعون مصر جو توحید کا

پہلا مبلغ تمام مصریوں کے غصہ کا شکار ہوا اور اپنی سلطنت تک کھو بیٹھا۔ مگر لوگ خداوندانِ عالم کی اُسی تہذیب و ملت اور خوف سے پرستش کرتے رہے۔ آدم جب بھی اپنے زمانے کی بہترین مخلوق تھا۔

اسیر یوں، بابلیوں اور کلدانیوں کی دنیا جلد و فرات کے منج سے لے کر خلیج فارس تک لمبائی میں اور ایران سے لے کر مصر تک چوڑائی میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنہوں نے علم النجوم کی بنیاد ڈالی، جنہوں نے پہلے پہل قانونِ مرتب کئے، وہ جنہوں نے اول اول گھوڑوں کا استعمال کیا اور جنہوں نے اپنی تہذیب کو مصری پیوند سے کر حقیقوں کو ورثہ میں چھوڑا، اُن کا آدم دنیا کا اکمل ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔

حقی، اکرطی، ایچی اور ڈوری اقوام پہلے پہلے مہذب ہوئیں، بڑی بڑی سلطنتوں کی محسوس ہوئیں تمدن کی راہ میں کئی ایک قدم بڑھیں علم التعمیر میں انہوں نے رنگ رنگ کی اختراعات کیں۔ کتنی چیزیں نواریا بہتر ہوئیں۔ علم میں، دولت میں، طاقت میں ترقی ہوئی۔ ان دنوں جب کناسس کے حملات میں منونی بادشاہ لڑکیوں کا ناچ اور سرکس کے کھیل دیکھا کرتے تھے، جب آدم کا دماغ باقبل سے کئی درجہ اونچا تھا۔

یونانیوں میں آدم بہت بڑھا پھولا، ان کی تخم ریزی لوگ اب تک نہیں بھولے، ان کے آثار ابھی تک تحسین کا خراج لے رہے ہیں۔ اور معلوم نہیں ان کی آبپاری کتنی دیر تک پھل لاتی رہے گی۔ ان دنوں جب سقراط دنیا کا اجمل ترین اور اعقل ترین شخص تھا، وہ زمانہ کیا تھا؟ جب حسن کی تعلیم میں آدمی بلند ترین مقاموں تک جا پہنچا۔ جب قضا و قدر کے مسائل نے ادیبوں کو رنعت دی۔ جب فلسفی حقیقت کو بے نقاب کر رہے تھے جب وطنیت کے جذبات محترم سمجھے جانے لگے، جب شہبازی اور شامت لوگوں میں معزز اور موثر بن گئی، جب دلاور و شاعر، عالم و فلسفی ابطالِ زبان ہو گئے، جب دنیا کو غور و فکر کی عادت پڑ گئی تب آدم کا سر بلوں سے بھی بلند ہونے لگا۔

پھر جب یونانیت پر رومیٹ حاوی ہوئی اور رومیٹ جہانگیر ہو گئی، جب زمین افواجِ روما سے لرزنے لگی۔ جب قیصری صولتِ خدائی کی دعویٰ دار ہوئی جس وقت میسپی کے عاشقوں سے اُس کا تصادم ہوا اور جب انہیں عیسائیوں نے سیرزی کبر و نخوت اور دعوئے خدائی کو خلافتِ خدائی میں تبدیل کیا اس وقت عربستان میں ایک بیجان پیدا ہوا اور ایک عظیم ہستی کا ظہور ہوا جس کے نور کی کرنوں نے ازمنہ مظلمہ کو روشن کر دیا۔ اس وقت جب عربی عظمت نے یونانی علم و فضیلت کو سینا و غارابی، ابن رشد اور ابن طفیل جیسے چارچاند لگائے، جب بغداد و قرطبہ دنیا کے مستحق تھے، ان دنوں زمانہ جدید کی بنیاد پڑی، جب لوگ اس آنے والے دور کی دھندلی

تصادیر دیکھنے لگے اس وقت آدم فضائے بسیط میں اُٹنے لگا۔

اور اب جس وقت لاسکی کے ذریعہ سے عکاسی ہو رہی ہے اور روحانیات اور دور احساسی کے مسئل ابعادِ ربعہ کی باریکیوں کے ساتھ ہمارے دماغوں میں کھولے جا رہے ہیں، جب آدم نیچر کو تسخیر کر رہا ہے، جب ہم دس ہزار سال کی سہی پیہم کے جائز وارث سمجھے جاتے ہیں، جب ہم مستقبل کو جوان نظروں سے دیکھ رہے ہیں، جب ہمارے خون میں مدت ہے، دل میں جوش ہے، دماغ میں بصیرت ہے اس وقت میں تنہائی میں بیٹھا سوچتا ہوں کہ میرے آبا و اجداد میں کوئی آج سے ہزار، دو ہزار، دس ہزار سال پہلے بھی سوچ رہا ہوگا کہ وہ کتنا ترقی یافتہ مذہب اور تمدن ہے۔ وہ ماضی کی سطح سے کتنا اونچا اور اُس کی فکر کتنی رسا ہے۔

اور جب میں خیال کرتا ہوں کہ آج سے دو ہزار سال بعد میری اولاد یہ سوچتی ہوگی کہ بیسویں صدی میں دنیا ابھی صفر سن تھی اور لوگ کورا نہ خیالات رکھتے تھے، وہ کس قدر تو ہم پرست تھے ان کے البصار و افکار کتنے طفلانہ تھے تو چالیسویں صدی کا آدم مجھے یہ کتنا سناٹی دیتا ہے ”میں کتنا اعلیٰ اور برتر ہوں“ میں یہ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں!

فیاض محمود کیلانی

(۱) کام میں تیزی نہیں بلکہ خوبی مد نظر رکھو کیونکہ لوگ کام کی مدت نہیں پوچھتے وہ تو عمدگی کو دیکھتے ہیں
(۲) جب اقبال آتا ہے تو خواہشیں عقل کے تابع ہو جاتی ہیں اور جب ادبار آتا ہے تو عقل خواہشوں کی مطیع ہو جاتی ہے۔

(۳) درگزر ادنیٰ کو اتنا ہی بگاڑتی ہے جتنا اعلیٰ کو بناتی ہے۔

(۴) شریف کے حملہ سے بچو جب وہ بھوکا ہو اور کمینہ سے جب وہ آسودہ ہو۔

(۵) آدمی کو جب اپنی بساط سے بڑھ کر دنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ برا ہو جاتا ہے۔

(۶) فتح شریفیوں کے پاس گنہ گاروں کی سفارش ہے۔

(۸) آدمی کا دل جب مضبوط ہوتا ہے تو وہ عقل پر بھروسہ کرتا ہے اور جب کمزور ہوتا ہے تو تقدیر پر۔

(۹) اپنا دل اپنی عقل کے سوا کسی کو نہ بخشو ورنہ بُرے کو اس کا مالک بناؤ گے۔

سید جبرین دبیر حیدر آبادی

جامِ صہبائی

(۱)
جامِ منے لادہ گوں کہاں سے لاؤں!
دورانِ غم دروں کہاں سے لاؤں!
باتا کہ ہے اضطرابِ غائبِ عزیزِ رست
پہنچی تو کو سکوں کہاں سے لاؤں!

(۲)
گری بہا کے زخمِ تیشہ تیشہ
نہا بہا کے جامِ تیشہ تیشہ
تو بار اگر کوہِ غم سے جی فٹے
گردن پہ بھیجی کھجکی تیشہ تیشہ

(۳)
یارِ شبِ میں شمعِ گھبراتی ہے
پیغامِ طربِ اکبرِ لاتی ہے
تنی میں جو گزرتے تو اتنی بات بھی ہے
پوں سب کی گزرتے کو گزرتی ہے

(۴)
جو لطف ہے چھو بی حال میں نہیں
نذرت جو گھٹ دویں تو نذر میں نہیں
وہ منظرِ زندگی کہ اسواج میں ہے
کشتی میں نہیں لکھو شے حال میں نہیں

دیوار پر چہرہ

گزشتہ شام ڈینی کے ہاں ایک واقعہ پر مجھے اتنی خفت اٹھانی پڑی کہ اب تک میں سخت بیٹھنچا ہوں،
ہاں اتنا اطمینان ہے کہ اس انفعال میں بہت سے دوسرے لوگ بھی میرے شریکِ حال ہیں،
مرگِ انبوہ جتنے دارد

فوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع جس قدر لا حاصل ہے اسی قدر لائقِ توجہ بھی ہے۔ چنانچہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص نے کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کیا لیکن ان بیانات سے سننے والے کچھ بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے جن لوگوں سے میری شناسائی نہ تھی اُن میں مختصر سے قد و قامت کا ایک زرد رُو شخص بھی تھا جو بشرے سے بہت متفکر معلوم ہوتا تھا۔ اس شخص کو رڈن وائٹ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کا بیان نہایت توجہ سے سنتا رہا لیکن اپنی زبان کو اُس نے مطلق جنبش نہ دی۔ پھر اُسے بھی گفتگو میں شریک کرنے کے لئے ڈینی نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہو، کوئی ایسی داستان جس کا کوئی حصہ ناقابلِ توجہ ہو؟

اُس نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا ”اچھا تو پھر سنئے مگر یہ کوئی داستان نہیں، یعنی داستان کا لفظ عربی عام میں جس مفہوم کا حامل سمجھا جاتا ہے اس کا اطلاق میرے بیان پر نہیں ہو سکتا۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے محض سنی سنائی باتیں بیان کی ہیں، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ حقیقت انسان کے مقابلہ میں نہ صرف بدرجہا خیر ہوتی ہے بلکہ بدرجہا زیادہ دل آویز بھی ہوتی ہے۔ میری داستان آپ جیتی ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج ہی سہ پہر کے وقت یہ داستان تکمیل کو پہنچی۔“

ہم نے بہ اصرار اس سے داستان شروع کرنے کی درخواست کی۔
اس نے کہا ”سال یا دو سال قبل میں نے گریٹ آرمڈ سٹریٹ“ میں ایک قدیم مکان کے چند کمرے اپنے رہنے کے لئے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ سونے کے کمرے کی دیواروں پر کسی سابق کرایہ دار نے رنگ کرایا تھا لیکن چونکہ جگہ سیلی تھی اس لئے دیواروں پر جا بجا رنگ کے چٹخنے سے بڑے بڑے نقش بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک، جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے ہو بہو انسانی چہرے سے مشابہ تھا اور یہ مشابہت معمول سے بہت زیادہ

تو ہی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چمکائے والی مٹی۔ صبح کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے اور بیٹھے اُٹھتے یہ چہرہ دمہ دم میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مجھے ایک حقیقی چہرہ معلوم ہونے لگا اور میں اسے اپنا شریکِ خانہ سمجھنے لگا۔ تعجب یہ تھا کہ دیوانوں پر اس قسم کے دوسرے تمام نقوش بڑھتے اور اپنی ہیئت تبدیل کرتے بہتے تھے لیکن ہمیشہ بالکل غیر متغیر اور ہمیشہ بالکل ویسے کا ویسا رہتا۔

اسی زمانے میں مجھ پر نزلہ اور بخار کا ایک شدید حملہ ہوا اور مرض نے کسی قدر پیچیدہ صورت اختیار کر لی میں دن بھر بستر پر لیٹا مطالعہ اور سوج بچار میں مستغرق رہتا تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا۔ انہیں دنوں وہ چہرہ میرے دل و باغ و پار و زیا دہ مضبوطی کے ساتھ مستولی ہونے لگا۔ میں اُسے روز بروز زیادہ حقیقی اور روز بروز زیادہ جاذبِ توجہ پاتا تھا بلکہ وہ دن اور رات ہر وقت میرے خیالات پر حاوی رہتا تھا۔ تاک کی ایک زالی دُض و اور پیشانی کے ایک مخصوص جھکاؤ کی وجہ سے اس چہرے میں انفرادیت کا امتیاز بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے ہم ہزار ہا انسانوں میں سے صاف الگ پہچان سکتے ہیں۔

صحت پانے کے بعد بھی میرے خیالات اس چہرے کی قید سے آزاد نہ ہونے پائے۔ میں بازاروں میں اُس کے ہم صورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں ایسا ایک حقیقی شخص بھی ضرور موجود ہے اور میرا اس سے ملنا ناگزیر ہے۔ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی کہ میں اپنی اور اس کی ملاقات کو کیوں اُل بھجتا تھا، مجھے صرف اتنا یقین تھا کہ کار فرمایاں قضا و قدر نے کسی پر اسرار طریقہ سے میری اور اُس کی ذات کو باہم وابستہ کر رکھا ہے۔ میں عام اجتماعات میں کثرت سے آنے جانے لگا۔ سیاسی مجالس، فنٹ بال وغیرہ کے مقابلوں اور ریلوے شیشنوں پر میری جستجو پرور نگاہیں ہر طرف دیوانہ وار پھرا کرتی تھیں۔ بالخصوص صبح کے وقت، جب مضافاتی ٹرینیں پلیٹ فارم پر اکرا انسانوں کو اسنوہ در اسنوہ اگل دیتی تھیں، اور پھر فرام کے وقت جب وہ انہیں دوبارہ اگل جانے کے لئے اُن موجود ہوتی تھیں۔ لیکن میری یہ تمام نگاہیں و دو بالکل بے حاصل ثابت ہوئی۔ یہ حقیقت اس سے قبل مجھ پر کبھی اتنی واضع طور پر نہ کھلی تھی کہ انسانی چہرے کی اس قدر کثیر التعداد مختلف صورتیں ہیں، اور پھر اس قدر کم، کیونکہ اس اختلاف کے باوجود ہم ان کو از روئے اصطفا ت اتنے قلیل التعداد لوگوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ اُن کا شمار اُنھوں کی اٹھلیوں پر ہو سکتا ہے۔

جیتو میرے لئے ایک سودا بن گئی اور میں بجز اس جستجو کے دوسری ہر بات سے غافل ہو گیا۔ میں بیخ بیاہ کی منہ لپوں اور عام لوگ ہوں میں لوگوں کی بھیڑ پر نظر دے کر برابر ہر مل کھڑا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے

لگے۔ اندھ کو ڈالنے کی وجہ میری طرف منعطف ہو گئی اور وہ مجھے مشکوک سمجھا ہوں سے دیکھنے لگی۔ سنوانی چہروں سے میری غلط انداز کا ہنس کوئی واسطہ نہ رکھتی تھیں۔ بس مواد صرف مرد ہی میری نظر بازی کا مرکز تھے۔“

احساسِ کوفت کی شدت کے باعث اُس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرا اور پھر اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا: ”آخر میں نے اُسے دیکھ لیا وہ ایک ٹیکسی میں سوار تھا جو پکیڈی میں مشرقی سمت کو جا رہی تھی میں دفعۃً ٹھہرا اور کچھ دور تک اُس کے ساتھ بھاگا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے ڈرائیور سے ٹپتے ہوئے کہا اس ٹیکسی کا تعاقب کرے اور خود اچھل کر اس میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیور نے اس ٹیکسی کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ آخر ہم چترنگ کر اس پہنچے اور میں ٹیکسی سے اترتے ہی پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ وہاں میں نے اُس شخص کو دو خاتونوں اور ایک ننھی بچی کے ساتھ کھڑا پایا۔ وہ دو بچہ کر میں منٹ کی گاڑی سے فراموش کو روانہ ہونے والے تھے۔ میں اس کے ساتھ ایک آدھ بات کرنے کا موقع پانے کے لئے اس کے قریب ادھر ادھر منڈلاتا رہا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہت سے اور لوگ بھی اُسے رخصت کرنے کے لئے سٹیشن پر آپہنچے تھے اور وہ اُن کے درمیان گھرا ہوا گاڑی میں سوار ہو گیا پھر میں نے بھی جلدی سے فوکسٹن کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں جہاز کے روانہ ہونے سے قبل میں اس سے مل سکوں گا۔ لیکن فوکسٹن میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھ سے قبل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاز کے اس حصے میں اُس نے متعدد کمرے اپنے لئے مخصوص کر رکھے تھے میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی نہایت متمول شخص ہے۔“

”مجھے پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس پر میں نے بھی سمندر کو عبور کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جہاز کا سفر شروع ہونے کے بعد وہ خاتونوں کو تنہا چھوڑ کر عرشے پر ٹہلنے کے لئے باہر آئے گا۔ میرے پاس اُس وقت بولون تک صرف ایک طرف کے کمرے کی رقم تھی لیکن ان باتوں سے میرا عزم کہاں متزلزل ہونے والا تھا۔ میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ہی بیٹھ کر انتظار کی ساعتیں گنتے لگا۔ ایک مدت کے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا لیکن چھوٹی بچی اس کے ساتھ تھی۔ میرا دل نہایت زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اس کے چہرے کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوئی تھی۔ ایک ایک خال اور ایک ایک خطا سنی دوا والے چہرے کا تھا۔ اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر عرشہ جہاز کے بالائی حصے پر جانے کے لئے ایک بنی راستے کی طرف ہولیا۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر اب بھی میں ناکام رہا تو پھر مجھے کامیابی سے ہمیشہ کے

لئے تاکہ دعوہ لینے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہہ ہی دیا معاف فرمائیے میں خارج ہو گیا۔ اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو مجھے اپنا ملاقاتی کارڈ عنایت فرمائیے۔ میں نہایت اہم وجوہ کی بنا پر آپ سے تعام حاصل کرنے کا خواہشمند ہوں،

”وہ یہ سن کر کچھ متحیر سا رہ گیا لیکن اُس نے میری درخواست قبول کر لی چنانچہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اُس نے جیب میں سے اپنا کارڈ نکالا اور اسے میرے حوالہ کر کے خود بے عزت تمام چچی کی معیت میں آگے بھل گیا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے مجھے دیوانہ خیال کیا اور یہی زیادہ مناسب سمجھا کہ میری خواہش پوری کر دی جائے۔“

”میں کارڈ کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کر اُسے پھٹنے کے لئے جہاز کے ایک تنہا گوشے میں چلا گیا۔ میری آنکھیں پتھر انگلیں اور میرا سر جھکوانے لگا جب میں نے کارڈ پر اُس کا نام پڑھا: سٹر آرمنڈ والٹس برگ، ریاستہائے متحدہ امریکا۔ اس کے بعد مجھے اور کچھ یاد نہیں۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو بولوں کے ایک شفا خانے میں پایا۔ وہاں میں ہفتوں خراب و خستہ حالت میں پڑا رہا اور اب مجھے وہاں سے واپس آنے میں مشکل مہینا بھر گزر رہا ہے۔“

اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب فرط حیرت سے کبھی اُس کی طرف اور کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ اس شام ہم نے جس قدر باتیں سنی تھیں وہ اس چھوٹے سے زرد رُو آدمی کی داستان کے مقابلہ میں بالکل میچ معلوم ہوتی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے کہا ”میں نے گریٹ آرمنڈ سٹریٹ میں واپس آ کر اس امریکن کے حالات کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع کیا جس کی زندگی میں بعض پُر اسرار اتفاقات نے مجھے یوں غفل انداز کر دیا تھا۔ میں نے پش برگ میں لوگوں کو خطوط لکھے، امریکن ایڈیٹروں سے مراسلت کی اور لنڈن میں جو امریکن مقیم تھے اُن سے میل ملاقات شروع کی لیکن مجھے بجز اس کے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایک کروڑ پتی ہے یا اس کے والدین اگر نہ تھے جو لنڈن میں رہا کرتے تھے۔ یہ مجھے باوجود انتہائی کوشش کے معلوم نہ ہو سکا کہ لنڈن میں اُن کی جائے سکونت کس مقام میں تھی۔“

مجھ کو یہ میچ تک حالات بدستور رہے۔ میں رات کو معمول سے زیادہ تھکا ماندہ لیٹا تھا، اس لئے دینک سوتا رہا۔ جب میں بیدار ہوا تو اسے میں دعوہ پھیل رہی تھی۔ میں نے حسبِ عادت سب سے پہلے دیوار پر چہرہ

دیکھنے کے لئے نظر اٹھائی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مل کر دیکھا اور خوف و ہراس سے کانپ اٹھا۔ چہرے کے بعض حصہ دھندلے سے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ گورنمنٹ ہی ٹیب چہرہ جس پہ سبق باطل صاف صاف نظر آتا تھا بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کیا ہی چاہتا ہے لیکن اب صرف ایک ہی بات باقی رہ گیا تھا۔

میں اندر دوسرا سیدہ بستر سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ صبح کے اخبارات چھپ کر بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے آچکے تھے۔ فرسٹ مضامین کے اشتہاروں میں میری نظر اس عنوان پر پڑی، "امریکن کروڑ پتی کو موٹر کا حادثہ" آپ سب نے اخبارات میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا۔ میں نے فوراً اخبار خرید لیا اور جو خبر مجھے پڑھنی چاہئے تھی پڑھ لی۔ "پنس برگ کے کروڑ پتی مسٹر آرمینڈو وال متعلقین کے ساتھ ایک موٹر کار میں سپینز اسے پسیا کو جا رہے تھے کہ ان کی موٹر ایک چمکڑے سے متصادم ہو کر الٹ گئی۔ مسٹر وال کی حالت نازک ہے۔"

میں اسی سرسنگی کی حالت میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور ٹینگ پر بیٹھ کر اپنی دھندلی آنکھوں سے دیوار پر چہرے کو دیکھنے لگا۔ اسی حالت میں چہرہ دفعتاً بالکل غائب ہو گیا۔

دوبعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ضربات کی شدت کے باعث مسٹر وال غالباً ٹھیک اسی وقت جاں بحق ہو گئے تھے۔

اس کے بعد وہ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

ہم سب نے فرداً فرداً مختلف کلمات سے اظہارِ تعجب کیا اور فی الواقع یہ مقام استعجاب تھا۔ پھر اجنبی نے کہا مجھے اس واقعہ میں تین باتیں نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ لندن کے ایک مکان کی دیوار کے پٹنے سے نہ صرف ایک ایسے شخص کی صورت بن گئی جو امریکا میں تھا بلکہ یہ صورت اُس شخص کی زندگی کے ساتھ نہایت گہرا ربط بھی رکھتی تھی اس واقعہ کی توجیہ سائنس سے فی الحال ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص کا نام بھی اسی مقام سے ایک نسبت رکھتا تھا جہاں کسی پوشیدہ قوت نے ایک عجیب و غریب طریقے سے اس کی صورت بنا دی تھی۔ یقیناً آپ کو بھی ان واقعات پر حیرت ہوئی ہوگی۔

ہم سب نے اس سے اتفاق کیا اور پھر ہم لوگوں کے درمیان فوق الفطرت مظاہر کے متعلق دوبارہ وہی بحث پہلے سے وہ جذبہ جوش و خروش کے ساتھ چھڑ گئی۔ اس اثنا میں وہ اجنبی شخص اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ ابھی وہ دھڑلے ہی میں پہنچا تھا کہ ہم میں سے ایک شخص نے یہ مقام مسرت ہے کہ وہ میں نہیں تھا، اُس سے

اس دلچسپ واقعہ کے متعلق تیسری حیرت انگیز بات دریافت کر کے ہمیں اپنی گرامر بحث کے محرک کی طرف دوبارہ متوجہ کیا سپینٹن نے اُسے یاد دلایا کہ اُس نے عین حیرت انگیز باتیں کہی تھیں۔

اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا ”ہاں وہ تیسری بات، میں اسے بھول ہی رہا تھا۔ تو اس داستان کے متعلق وہ تیسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں نے اسے نصف ہی ساعت قبل تصنیف کیا تھا۔“
”بچے خدا حافظ“

ہوش و حواس درست ہونے کے بعد ہم نے رڈسن واٹ کو تلاش کیا جو اس مارِ آستین کو مغل میں لے کر آیا تھا۔ لیکن وہ خود بھی غائب ہو چکا تھا۔

حامد علی خاں

(ترجمہ)

دیہاتی گیت

۱۔ میری بارہ برس کی عمر میں میرے پرانے ناتھ پر دیس گئے۔ بارہ برس کے بعد لوٹے تو باغ میں ڈیرا ڈالا۔ انہوں نے گاؤں والوں کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کی چال ڈھال کیسی ہے۔

۲۔ گاؤں والوں نے کہا آپ کی بیوی بڑی نیک ہے اُس کے چہرے سے روحانیت برستی ہے وہ عالی خانہ ان اہل نہایت ہے۔

۳۔ باغ سے اٹھ کر شوہر اپنے مکان پر آیا اور اُس نے خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ میری بیوی کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے؟

۴۔ خادمہ نے جواب دیا ”مالک باپ کی بیوی انگوٹھا دبا کر چلتی ہے۔ گھونگھٹ کا ٹھہ کر قدم اٹھاتی ہے وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خانہ افزوں (نمنال) دوہیال اور سہراں کی عورت کو ہرگز ور رکھا ہے۔“

۵۔ شوہر اب اپنے گھر میں داخل ہوا اُسے دیکھتے ہی ماں نے چوکی بچھا دی اور بہن پانی لے کر دوڑی۔

۶۔ اُس نے ماں سے پوچھا کہ میری بیوی کا چال چلن کیسا ہے۔ ماں نے کہا۔ بیٹا! تیری بیوی تیری محبت میں مگن بیٹھتی ہے تو کبھی

۷۔ میرے محبت جگمیری ہو گا بلکہ تو کو کہہ گیا لیکن اس کے چہرہ پر شوہر کی غیر فانی محبت کتنی رہتی ہے۔ وہ شریف خانہ ان کی لڑکی ہے اُس نے تینوں خانہ افزوں کی عورت کا خیال رکھا ہے۔

۸۔ شوہر اب اپنی خواب گاہ میں پہنچا اس کی بیوی وہاں سو رہی تھی۔ اُس نے جھکا کر اُس کو چھاتی سے لگایا اور پوچھا۔
کہو کیسی ہو؟ بیوی نے جواب دیا ”میرے ستر و آگے بغیر نہ تو میں نے پان کھایا اور نہ چھایا کتری۔“

۹۔ آگن تو میسے لے بیابان جھل اور مدد خانہ خواب خیال تھا آپ کی مہمانی میں مجھے کالی ناگن کی طرح کاٹتی تھی۔

اعظم کرپوری

غزل

یہ کاوش باوجود سعی امکانی نہیں جاتی محبت کی خلش دل سے آبسانی نہیں جاتی
 نظر آیا تھا اک دن جلوہ رخ بے حجابانہ اُسی دن سہ تصور کی پریشانی نہیں جاتی
 طلسمِ ننگ و بُو کی سب حقیقت کھل گئی بھی سربِ زندگی اتیری درختانی نہیں جاتی
 شعلِ حُسن سے پھر جگمگا دے خلوتِ غم کو دل ویراں کی ہیبتِ ناک ویرانی نہیں جاتی
 کہیں ٹھوڑے سحرِ آرزو اک دن جو نکلا تھا لبِ فدا کی اب تک پشیمانی نہیں جاتی
 غمِ حواں اڑا لایا ہے مجھ کو اس بلندی جہاں حسن کی صورت بھی چاہنی نہیں جاتی

دکن چھوڑے زمانہ ہو گیا ذوقی ہجرِ انک

دلِ برباد کی آشتِ سامانی نہیں جاتی

ذوقی

نیند کا غلبہ

رات کا سناٹا ہے، تیرہ برس کی نوعمر ملازمہ کرمین پالنے کو آہستہ آہستہ جھلا رہی ہے اور نہایت مدھم آواز میں گنگنائی جاتی ہے۔

آجاری نندیا آجاری آ
بالے کی آنکھوں میں گھل جا

کمرے میں ایک چھوٹی سی ہری ہری لالٹین جل رہی ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک ایک سوت کی رشتی بندھی ہے، جس پر بچے کے ننھے کپڑے، مالک کی قمیصیں اور مالک کی ساڑھیاں ٹٹک رہی ہیں۔ چھت پر روشنی کا ایک بڑا سا سبز دھبہ جھلا رہا ہے۔ پالنے کا نصف حصہ کرمین اور الگنی کے کپڑے نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں جب تبدیل کی تو جھلانے لگتی ہے تو چھت کے سبز دھبے اور کپڑے کے سایوں میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ خدیش کرنے لگتے ہیں سکرے میں گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ باورچی خانہ سے گندے پانی اور باہر جوتے کی دوکان کی بدبو اندر داخل ہو رہی ہے۔

بچہ رور رہا ہے۔ روتے روتے اس کا گلا میٹھ گیا ہے، بے دم ہو گیا ہے مگر اب بھی اس کا دوا برابر جاری ہے۔ خدا معلوم کب چپ ہو گا کرمین کو نیند آ رہی ہے، اس کا سر جھک گیا ہے آنکھیں مندی جاری ہیں، بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹھ اڑ گئی ہے، اُس کی گردن میں شدت کا درد ہو رہا ہے، اس میں آنکھیں کھولنے کی طاقت نہیں، اس کے ہونٹوں کی قوت سلب ہو چکی ہے، اس کی آواز لڑکھڑاہی ہے، مگر پھر بھی وہ گنگنا رہی ہے۔

آجاری نندیا آجاری آ
بالے کی آنکھوں میں گھل جا

چولے سے ایک جھینگر کے بولنے کی پیہم آواز آرہی ہے۔ دوسرے کمرے میں مالک اور بیوی پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ گھوٹے سے ”چڑچوں“ ”چڑچوں“ کی کراہ نکل رہی ہے۔ کرمین کی آواز رات کی فرحت فراغت منشا بٹ سے ہم آہنگ ہے۔ اُسے اب اپنی لوری سے اذیت پہنچ رہی ہے۔ اس سے خود اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر اُسے سونا نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس کی آنکھ لگ جائے۔ مالک کی بید اُس کے لئے تیار ہے۔

تبدیل جھلا رہی ہے چھت کا سبز دھبہ اور کمرے کے سائے حرکت کر رہے ہیں اور خواہ مخواہ کرمین کے چہرے و آنکھوں پر تاج ہے ہیں۔ اس کے نیم خستہ دماغ پر دھندلی دھندلی بہم تصویریں صومٹ پذیر ہو رہی ہیں وہ آہستہ

مضمون ابھی آئی۔ ابھی آئی۔ مکتی ہوئی اُس کی ماں بہر حال جاتی ہے اور چند منٹ بعد وہ اُس کے گھر سے ایک موم بنی کا گھوڑا لے ہوئے پھر وہیں آتی ہے۔

اُس کے باپ کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اس کے رخسار اٹکاٹے کی طرح سرخ ہیں وہ سب کو سنی خیر نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظریں ڈاکٹر اور دیوار دونوں کو پار کرتی ہوئی باہر کی چیز کو دیکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر اُس کی طرف مڑتا ہے۔ ”کیا کر رہے ہو۔ کس خیال میں غرق ہو؟“ وہ پوچھتا ہے۔ ”کیا کر رہا ہوں؟“ اُس کا باپ جواب دیتا ہے۔ ”مر رہا ہوں میرا وقت آگیا۔ میرا شمار اب زندگی میں نہیں ہے۔“

”مخافات مت بگو۔ میں تمہیں اچھا کروں گا۔“ ڈاکٹر تسلی دیتا ہے۔

”شکریہ بشکریہ حضور بہت بہت شکریہ“ اُس کا باپ کہتا ہے۔ ”مگر میرا وقت آگیا ہے۔“

کر رہی ہے۔ وہ دیکھو سائے کھڑی ہے!“

پندرہ منٹ تک ڈاکٹر مریض کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی فائدہ کو ایک طرف لے جا کر کہتا ہے۔

”آہ۔ بہت مشکل ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ شفا حاصل نہ ہو، وہاں ہم سب کی گردنیں گے۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ وقت ضائع مت کرو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ سب سو گئے ہونگے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، میں قہقہے دیتا ہوں۔ کچھ سن رہی ہو؟۔“

”مگر بندہ پرور“ اس کی ماں جواب دیتی ہے۔ ”جائیں گے کاہے پر ہم لوگوں کے پاس سواری بھی نہیں ہے۔“

”اس کی فکر نہ کرو“ ڈاکٹر کچھ سوچ کر کہتا ہے۔ ”میں تمہارے مالک سے کہتا ہوں، اس کا گھوڑا لے لینا۔“

ڈاکٹر چلا گیا۔ موم بنی بچھ گئی۔ پھر وہی آہ آہ کی دلدوز آوازیں آرہی ہیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک گاڑی آتی ہے۔ گرین کا باپ تیار ہو کر شفا خانے جاتا ہے۔

اب صبح کی روشنی تمام دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی ماں مکان پر نہیں ہے، شفا خانہ میں اُس کے باپ کی تیمارداری کر رہی ہوگی۔ کسی گھر سے بچے کے رونے کی آواز آرہی ہے اور کوئی گرین کی آواز کے ساتھ گار رہا ہے۔

آہا ہی زندیا آہا ری آ

اُس کی ماں وہیں آتی ہے۔ خاموشی سے بیٹھ جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے۔

سے جانیں بہت وقت لگ گیا۔ صبح ہوتے ہوتے اُس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی
خدا مغفرت کرے۔

اُس کی ماں سو رہی ہے مگر اُسے رونے سے منع کر رہی ہے۔
دیوچی اب رونے دھونے سے کیا ہوگا! صبر کر مٹی صبر کر تیری قسمت میں ہی لکھا تھا۔ مائے پیری بچی
یتیم ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

کریم باہر چلی جاتی ہے اور وہاں خوب دل کھول کر روتی ہے۔ اتنے میں کوئی شے زور سے اُس کی پیٹھ
پر گھونسا مارتا ہے۔ وہ گرتی ہے، درخت کا سہارا لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے، آنکھ کھل جاتی ہے۔ زبردست ہے
دھچکل، وہ اس کی کٹیا! اس کا مالک اُسے تیوری چڑھائے گھوڑا ہے۔

”نامعقول، ننگو رام کہیں کی۔ بچہ کب سے چنچ رہا ہے امداد پڑی خالٹے لے رہی ہے۔ لے میں کچھ بچنے
کا مزہ چکھاتا ہوں“ اور بید لے کر سڑاک سڑاک دوڑ سید کرتا ہے۔ کریم آنکھ ملتی ہے۔ گواہ کو ہلاتی ہے اور
سسکیاں لیتی ہوئی گاتی ہے۔

آج بادی خنبدیا آجاری آتے۔ بلکہ کی آنکھوں میں گھل جاتا

چھت پر روشنی کا سبز دھبہ اور دیواروں پر کپڑے کے سائے پھرنے لگتے ہیں، پھر اُس کا دل غمگین
ہونے لگتا ہے اسی وسیع کچھروالی سڑک پر وہ پھر چل رہی ہے۔ لوگ اسی طرح میٹھی غیند میں پڑے سو رہے ہیں۔
اُس کا بھی پڑ پڑنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر اُس کی ماں اُس کے ساتھ ہے۔ وہ اُسے ٹھہرنے نہیں دیتی اور کہہ رہی
ہے۔ مٹی ٹھہرنا ہے۔ کہیں لوگری پاگری ڈھونڈیں گے۔ آخر کب تک بھوکوں مریں گے۔

”بال بچوں کی خیر بابا“ اُس کی ماں راگیروں سے کہتی ہے۔ تین دن کا فاقہ ہے۔ میری بچی بھوک سے
بے دم ہو رہی ہے۔ خدا کی راہ پر کچھ دو بابا۔

اس کے جواب میں کوئی مانوس آواز اُس کے کانوں میں آتی ہے ”بچے کو مجھے دے“ ایک لمحہ کے بعد اس
آواز کی پھر تکرار ہوتی ہے ”بچے کو مجھے دے۔“ مادہ کھانے پر بھی ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، امیر زادی کہیں کی۔ بچے کو
چھوڑ کر بے ہوش پڑی سو رہی ہے!“

کریم چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی ہے۔ کہاں کی ماں کہاں
کی سڑک، کہاں کے راگیروں؟ اُس کی مالکہ پالنے کے پاس کھڑی غصے سے اُس کی چوٹی کھینچ رہی ہے!

ملکہ بچے کو چھکار کر دھو دھو رہی ہے مگر میں کمری انتظام کر رہی ہے کہ بچہ دودھ پنی پکے تو ملکہ سے ملے۔
کمری کو اندکنے والی ہو اب خوشگوار ہے۔ چنت کی بہتر روشنی اب زردی ناکل ہوتی جا رہی ہے۔ بہت جلد اب صبح
ہو جائے گی۔

مے بچے کو ملے ملکہ سلو کے کے جن لگاتے ہوئے کہتی ہے: "منع کرتی ہوں کہ بچے کو باہر نکھایا کر سائونڈنگ لگائی
تیرا کیا مجھ کو گیارہ تکلیف تو ہمیں ہو رہی ہے۔ بچہ ارہ ملت بھر جلاتا رہا ہے۔"

کریم نے بچے کو گوارہ میں لٹا دیا ہے پھر اُسے آہستہ آہستہ ہلکا کر اپنی لودی بنا رہی ہے۔ روشنی کا سبز دھبنا
اب بالکل غائب ہو گیا ہے پکڑوں کے سائے معدوم ہو گئے ہیں صبح کی روشنی کمرے میں آنی شروع ہو گئی ہے، مگر
اُس کی پلکوں پر نیند کا غار اب بھی متحرک رہا ہے۔ وہ اپنا سر پائے پر رکھ دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سارے جسم
کو جنبش دیتی ہے کہ بخت نیند کسی طرح تو اس کا پنڈ چھوڑے۔ مگر اُس کا سر چکر رہا ہے نیند اس کی پلکوں کو گوند کی
طرح جوڑے لے رہی ہے۔۔۔۔

مگر میں چولہا جلا "اس کے ملک کی آواز آتی ہے۔"

ہاں۔ پھر کام کلج کا وقت آگیا۔ غریب چھو کری دوڑ کر ایک کمرے میں لکڑی لانے کے لئے جاتی ہے۔ وہ خوش
ہے، جب انسان چلتا پھرتا ہے تو اُسے نیند سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ایک جگہ ساکت بیٹھنے سے!
وہ چولہا جلاتی ہے۔ اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح سخت نہیں ہے اس میں پھر نرمی آ
چلی ہے۔ اس کے سر کا چکر اب بند ہو رہا ہے۔ اس کے خیالات اب اتنے پرانگندہ نہیں ہیں۔

"کریم چائے تیار کر" اُس کی مالکہ اپنے کمرے سے آواز دیتی ہے۔ اُس نے ابھی کیتلی آگ پر نہیں رکھی کہ ایک
دوسرا حکم صادر ہوتا ہے۔

"کریم اپنے مالک کے جوتے صاف کر ڈال"

مغز میں پر جوتے صاف کرنے کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ ایک بڑے سے جوتے میں سڑا ل کر سو
جانا کس قدر آرام دہ ہو گا۔ ایک لخت جوتا بڑھنا شروع ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے کمرے کے برابر ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ سے
برش چھوٹ جاتا ہے۔ مگر فوراً وہ اپنا سر ملاتی ہے اور سب چیزوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا شروع کرتی ہے تاکہ اُن کا بڑھنا بند
ہو جائے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ آجائیں۔

"کریم! ہاتھ دھو" اس کی مالکہ کہہ رہی ہے۔ "بڑھیاں جھاڑ ڈال۔ گاہک دیکھیں گے تو کی کہیں گے۔" اس کی مالکہ کہہ رہی ہے۔

کر میں پڑھتا تھا کہ ان سے ملنے کرتی ہے سکر میں جھانڈ دیتی ہے، پھر وہ لہجائی ہے اور وہ سکر وہ کان
 لہجائی ہے۔ کام پر کام کھتے پے آپے میں سانس تک لینے کی فرصت نہیں ہے۔
 نفرت خانے میں ایک مقام پر بیٹھ کر آکھینا کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس کا سر زمین میں گڑا جا رہا ہے تاکہ اس کے
 سانس بند نہ ہو کہ گیندوں کی طرح ناچ رہے ہیں سانس کھاتے سے چاؤ گر پڑنا ہے۔ ہلکے جوتا ستینیں چھانے برابر
 کرے میں ٹہل رہی ہے اُسے گھر کو بھیجتی ہے اور اس اندر سے چلاتی ہے کہ کر میں کے کان دیر تک گونجتے رہتے ہیں۔
 اس کے جسم سے خون کھانا، کھانے کے وقت حاضر بننا، برتن مانجنا، ہتھ کے گنترے صاف کرنا اور پھر سینا
 پر دنا بھی وبال جان ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر غرض پر پڑ کر سو جائے تو کئی دن تک موتی ہے۔
 دن گزر جاتا ہے شام کی تاریکی ہر شے پر مسلط ہو جاتی ہے۔ کر میں اپنی ہمتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہے اور
 خدا معلوم یہیں خود بخود سکر آتی ہے۔ شام کا دھند لکا اُس کی نمود آکھوں کو گہری نیند کا پیغام دیتا ہے!
 رات کو اُس کے ہلکے کے دوست اجاب اور لینے چلنے والے آتے ہیں کر میں کو چائے بنانے کا حکم ملتا ہے
 چھوٹی سی کیتلی ہے۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ اُسے پانچ پانچ سات سات مرتبہ چائے بنانی پڑتی ہے۔ چائے کا دور
 ختم ہو جاتا ہے مگر کر میں وہیں کھڑی ہے۔ ہلک اور اس کے دوستوں کو اس سے سو کا م ہیں۔ وہ وہاں سے کیونکو
 مل سکتی ہے۔

”کر میں ڈر کر ایک پکیٹ سگریٹ تولیتی آ“

وہ تیز تیز قدم کھتی ہوئی دوکان پر جاتی ہے تیز چلنے سے شاید نیند بھاگ جائے! کر میں پان ہانکر لای کر مرچ
 بھڑک کر میں ذرا تبا کھیتی آ کر میں یہ کڑواں سکر میں وہ کو ڈال۔ احکامات کا تانتا بندھا ہوا ہے!
 لیکن اب صدمان جا چکے ہیں۔ روشنیاں گل کر دی گئی ہیں گھر میں خاموشی ہے۔ ہلک اور ہلک اپنے خانگی کر
 میں جا چکے ہیں۔ کر میں بچے کو جھولا جھولا آخیں حکم ل چکا ہے۔

چولے میں جھینگر بول رہا ہے۔ روشنی کا سبز دھبہ چھت پر نمودار ہے، کپڑوں کے مساتے پھر اُس کی
 آکھیں تلخ ہے ہیں۔ پھر اس کا دل مغ مغل ہو رہا ہے۔ پھر وہ پائے کو ہلا ہلا کر گنگنا رہی ہے۔
 آجاری نہ دیا آجاری آ جالے کی آنکھوں میں گول مل جا

بچہ پھر جانا شروع کر رہا ہے اور روتے روتے بے خود ہو جاتا ہے۔ پھر کر میں ایک کیمپ اور پانی سے لہجہ حرکت پر
 اپنی ماں اور باپ کو دیکھ رہی ہے، سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ سب کو پہچان رہی ہو، مگوس نیم ہیرا ہی نیم خواب کے عالم میں ہے۔

بچنے سے قاصر ہے کہ کوئی قوت اس کے پیروں میں پھیلے ہوئے ہے۔ کوئی طاقت اُس کے سینہ کو پتھر سے دہلتے ہوئے ہے اور اُس کی زندگی کو دھوکے میں ڈالتے ہوئے ہے۔

وہ نظریں پھیر کر چاروں طرف دیکھتی ہے مگر اس طاقت کا پتہ چل جائے تو اس سے نکل کر بھاگ جاتے یا آکر زیر کرنے کی کوشش کرے مگر اُس کی تلاش بے کار ثابت ہوتی ہے۔

انتہائی اورد آخری کوشش کے بعد وہ آنکھیں کھول کر سب چیزوں کو دیکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ بچہ کی بیچ سنتی ہے، روشنی اور تاریکی کا آنکھ مچھلا دیکھتی ہے اور اس روشنی اور تاریکی میں اُس دشمن کی تلاش کر لیتی ہے جو اسے مار ڈالنے پر تیار ہوا ہے!

وہ دشمن گوارہ میں پڑا ہوا طفل شیر خوار ہے!

وہ ہنستی ہے۔ اسے غیب معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سلیس اور آسان ہی بات اُس کی سمجھ میں اس سے پہلے کیوں نہ آئی۔ روشنی کا سبز دھبہ اکپڑوں کے مائے اور چولے میں پھلتا ہوا جمینگر سب کے سب اُس کا شکار اڑاتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔

اُسے پھر طلسمی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اُس کی آنکھ اسے دھوکا دینے لگتی ہے مگر اب کی بار وہ مسکرا کر اڑھ بیٹھتی ہے اور کمرے میں ٹھلنے لگتی ہے۔ اُسے ایک خیال آچکا ہے۔ وہ خوش ہے کہ بہت جلد وہ اس سنگ راہ سے نجات حاصل کر لے گی!

مہینچے کو مار ڈال اور پھر سو جا۔ آرام سے گہری نیند میں سو جا۔ ہوا کی سائیں سائیں اُسے تعلیم دیتی ہے۔ کریمین ہنستی ہے۔ روشنی کے سبز دھبے کی طرف دندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے اور نیسے پاؤں جا کر پلنے پر جھجک جاتی ہے۔

اور جب وہ بچے کا گلا گھونٹ چکتی ہے تو چپکے سے ہلاکچہ سوچے ہوئے زمین پر مار ڈالتی ہے۔ اُسے لال نہیں ہے۔ اُسے تاسف نہیں ہے۔ وہ زیر لب مسکرا رہی ہے کہ اب وہ گہری نیند سو جانے کے لئے آزاد ہو! اور اب وہ مردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑی گہری نیند میں سو رہی ہے!!

تراغہ گویا

جلنے دو چہ مرغ ترہاں کو ابھی
سمجھے ہی نہ تھے رنگ گلستاں کو ابھی
دیکھو تو زار رنگ گلستاں کو ابھی
کیوں توڑ رہی ہے دل مہاں کو ابھی
رہنا ہے یو نہی فرق دل و جاں کو ابھی
بھیس نہ براگروش دوراں کو ابھی
کیا بھولیں گے اس شمع شبتاں کو ابھی
پہنچی ہی نہیں جلوہ پنہاں کو ابھی
معلوم نہیں دیدہ گریاں کو ابھی
برباد نہ کر میرے گلستاں کو ابھی
محبوب نہ کر طمع فساد زناں کو ابھی
پڑے ہی میں رکھ حاصل ایماں کو ابھی
ظاہر نہ کروں میں غم پنہاں کو ابھی

پوچھو نہ مری سوزش پنہاں کو ابھی
دیکھا ہے گل چاک گریباں کو ابھی
پوچھو نہ مالِ گل خنداں کو ابھی
رو دو لحمین بھول سوائے صبح غضب!
توحید جی تک ہے کہ باقی ہے دوئی
ہے دور تو ماتم آئے گا جام اپنے کبھی
تا صبح جے یاد کیا ہے شبِ غم
وہ آنکھ کہ جو منکر ویدار ہوئی
ہر اشک ہے اک گوہر دریائے نظر
لے یاس اب امید ہی سے دل کی بہا
لے فوریہ سحر پردہ شب چاک نہ کر
ایمان جی تک ہے کہ ناویدہ ہے وہ
قاتل ہوں اگر اس کا کہ ناظر ہے خدا

گویا ہے اسی در سے تو امید نظر
رہنے دو یو نہی چاک گریباں کو ابھی

گویا جہاں آبادی

دولت یا محبت؟

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محبت کرنا روپیہ کمانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ روپیہ تو ایک احمق بھی پیدا کر سکتا ہے لیکن ایک ایسا آدمی نہایت ہی کمیاب ہے جو اپنے کلمہ احزان میں پڑا پڑا دم توڑ دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اور شاید کسی کلمی ہی کو اس پر اصرار ہوگا کہ کوئی بیوقوف بھی محبت کر سکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں ہمیں دنیا کا شیرازہ منتظم نظر نہ آتا، آپ عدالت ہی میں جا کر طلاقیں کی فرست دیکھ لیجئے کہ کتنوں نے اپنی حماقت سے محبت کو مکدر کر دیا ہے۔

آکیورسل بران ایک کامیاب مصنف ہے جو اپنے پُر تکلف دار المطالعہ میں بیٹھا ایک ناول کے ابتدائی ابواب اپنی ٹائٹلسٹ جیسیکا کا کس سے لکھوا رہا ہے۔ ہیل بران اپنی عمر کے ساٹھ برس گزار چکا ہے مگر محبت کے افسانوں کا اثر ہے کہ اس کا دل ابھی جوان ہے، کامیابی کی گرمی اُس کے خون میں جوش پیدا کرتی ہے اور وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے پچیس ناول لکھ ڈالتا ہے۔ اُس کے رقیب جو ابھی نوجوان ہیں وہ پچیس بھی لکھتے ہیں مگر تخیل کی رسائی پر کس کا زور چلتا ہے۔

جیسیکا کا کس صوف اکیس برس کی ہے، مگر چھ نکسترو برس کی عمر سے کمانے کا بار اُس کے سر پر چڑھ چکا ہے اس لئے اب وہ اچھی خاصی عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یتیم ہے ہمیشہ اکیلی رہی ہے اور اُس کی تعلیم بہت کم ہے۔ اُس کا جسم مختصر سا ہے مگر اُس میں کام کرنے کی غیر معمولی قوت ہے، اور اس کی ایک خاص ادا ہے جو بعض اوقات اسے بے اندازہ خوبصورت بنا دیتی ہے۔

ہیل بران نے کہا ”میری یہ کہانی پہلی تمام کہانیوں سے مختلف رنگ رکھتی ہے۔“

تجربہ کار جیسیکا نے جواب دیا: ”ہاں، سب مصنف یوں ہی لکھتے ہیں۔ میں نے جس کسی کی کتاب بھی لکھی ہے اُسے اسی زمرہ میں دیکھا ہے کہ اُس کی یہ کتاب صدی کی بہترین کتاب ہے۔“
مصنف نے کہا ”مگر یہ کہانی اُس مقام سے شروع ہوتی ہے جہاں لوگ ختم کرنے کا خیال کر رہے ہوتے ہیں۔“

جیسیکا نے کاغذ کے صاف تختے پر موٹے حروف میں پہلا باب لکھا اور کہنے لگی ”اچھا، تو میں تیار ہوں۔“

آپ شروع کیجئے۔

بیل بران نے کہا: ”اٹھانے کا ہم ہے تو کتنا محبت، میری دن ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اور میں یہ کہہ دیتا چاہتا ہوں کہ اُس کی تصویر گھینے میں میرے ہر نظر تمہاری ذات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

جیسا کہ آنے رحیدہ آہ از میں جواب دیا: ”نہیں بالکل نہیں۔ اب مجھے ان باتوں کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے، اور جب تک مجھے ہر جمعہ کے دن اپنی مزدوری مل جاتی ہے میں نے ایسی باتوں کا خیال کرنا چھوڑ دیا ہے۔“

”آؤ پھر شروع کریں۔“

”ہاں اچھا۔“

بیل بران نے لکھنا شروع کیا: ”دوپہر کا وقت تھا، باغ میں تپتی ہوئی دھوپ میں ایک آدمی اور ایک لڑکی کھڑے تھے۔ لڑکی کا سر سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ ٹیفن برلیٹ نے حریفانہ نظروں سے خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ایک آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی، نیا پارہ، دیکھا کہ وہ اُس کی طرف مڑا، ”گلو ریا مجھے تم سے محبت ہے، بے اندازہ محبت، تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے بسی ہوئی ہے۔ تم دنیا میں اکیلی ہو، مجھے اپنی تنہائی کا سانس بنالو۔ گلو ریا، تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ ”نہیں“ اُس نے جواب دیا، ”تم مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہو مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”س کا کس نے جو خاموش لکھ رہی تھی پنل اتنے سے سکھ دی اور بیل بران کی طرف دیکھنے لگی، ”صاف کیجئے گا، لیکن آپ حقیقت سے دُرا دور چلے گئے ہیں۔ ایک لڑکی جو مجھ جیسی بے یار و مددگار ہو — گلو ریا جیسی — وہ شادی کی پیغام کو ہر آسانی سے رو نہیں کر سکتی یہ فطرت کے خلاف ہے۔“

بیل بران وقت ضائع نہیں کیا کرتا تھا مگر بولنے سے پہلے اُس نے کوئی دس سیکنڈ تک جیسا کہ کی طرف غور سے دیکھا۔

اُس نے کہا ”معاذ اللہ پر محبت کے متعلق کچھ کہنے کا حق جوانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے، میرا شاہ اب بوڑھوں میں ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ محبت کی نسبت میرے خیالات کو غلط سمجھا جائے۔“ گلوگوں نے اب سننے سے انداز اختیار کر لیا تھا اور تہذیب بھی مست ترقی کر گئی تھی۔

جیسیکا کی ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا۔

اُس نے جواب دیا ”بڑھاپے کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن آپ کے خیالات ضرور قیافہ میں۔ آج کل ہم لوگ زندگی کو تجارتی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ ہر شخص اور ہر چیز آج کل دنیا میں ایک مالی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کا تجربہ تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ لڑکیاں محبت کی بجائے دولت پر زیادہ فریفتہ ہو جاتی ہیں“

ہیل بران نے آہستہ سے ”کما کلہیت“

لڑکی نے جواب دیا ”کلیت ہی تو تندیب حاضر کا پروانہ ہے“

ہیل بران نے کہا ”میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس بات کا صرف نظریاتی پہلو ہے اور عملی نقطہ نظر سے مجھے یقین ہے کہ کوئی اس زمانے کی لڑکی بھی کسی کروڑ پتی سے شادی کا فیصلہ کرنے میں اُسی قدر متاثر ہوگی جتنی آج سے دو پشت پہلے کی لڑکی ہوتی تھی، بجز اس کے کہ اُسے اُس سے محبت ہو“

”میں آپ کے اس دعوے سے متفق نہیں جب آپ کہتے ہیں کہ نظریاتی پہلو سے میں درست کہتی ہوں تو آپ کو یہ بھی ماننا چاہئے کہ گلو ریا یقیناً سٹیفن کو بغیر کسی غور کے قبول کر لیتی“

ہیل بران نے پر غور انداز سے کہا ”میرے سامنے حقیقی زندگی پیش کرتے ہیں۔ اگر میرے نادلوں کی بنیاد نظریوں پر ہو تو وہ بیک نہیں سکتے۔ گلو ریا، جیسا میرا اُس کا — تمہارا — تصور ہے، کسی شخص سے محض اس لئے شادی کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کر سکتی کہ وہ اتفاق سے بڑا امیر ہے“

جیسیکا نے جواب دیا ”آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ آپ مجھے اس انسانے میں گھسیٹ رہے ہیں اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی بد صورت سے بد صورت آدمی بھی شادی کرنے کو کہے تو میں انکار نہ کر سکوں بشرطیکہ اُس کے الفاظ کی پشت پر چوکھا سونا لٹکھنار ہو۔“

ہیل بران نے کہا ”کچھ بھی ہو تمہارا خیال غلط ہے“

”نہیں، غلط نہیں — کام، کام، کام — اور کس لئے؟ کیا میں اتنا کا لیتی ہوں کہ زندگی کا لطف اٹھا سکوں؟ میں آپ کو ایسی لڑکیاں دکھا سکتی ہوں جو عسرت کے مصائب سے تنگ اگر آرام کے اُن اوقات کی حسرت دل میں رکھتی ہیں جنہیں دولت خرید سکتی ہے“

ہیل بران نے مایوسانہ لہجہ میں کہا ”دنیا میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں دولت نہیں خرید سکتی“

جیسیکا نے کہا سچ ہے، مگر موجودہ حالت میں میرے پاس کیا ہے — حالانکہ روپیہ ہو تو —

”بعض ایسے افکار بھی ہو سکتے جن کا فی الحال تمہیں علم نہیں“

جیسیکا نے ہنس کر کہا ”ایک وقت میں میں ایک ہی خاوند سے شادی کر سکتی ہوں اور میرا خیال ہے

کہ وہ باطل کافی ہے“

ہیل بران لڑکی کے اس سبک سرانہ طرز گفتگو پر چپیں بچیں ہو گیا، پھر یکایک اُس کے چہرے کی کیفیت

بدل گئی، وہ اس کی طرف بڑھا اور اُس نے جیسیکا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

”اُس کا کس — جیسیکا — جو کچھ تم کہہ رہی ہو مجھے اس میں امید کی ایک کرن چمکتی ہوئی نظر

آتی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے — بے اندازہ محبت — تمہاری محبت میرے دل میں مدت سے

بسی ہوئی ہے — تم دنیا میں اکیلی ہو — مجھے اپنی تنہائی کا موٹا بنالو — جیسیکا، تم مجھ سے شادی

کوئی؟ اُس نے یہ الفاظ نہایت چمکدار لہجہ سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کئے، اور اُس کی آوازیں

ایک غیر معمولی تڑپ تھیں۔

”شادی کروں؟ جیسیکا نے گھبرا کر کہا۔ پھر بولی ”نہیں، آپ مجھ پر بڑی مہربانی کرتے ہیں مگر میں آپ

سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے آپ سے محبت نہیں — ایک طرح مجھے آپ سے

محبت ہے — مگر میں جوان ہوں اور آپ بوڑھے ہیں — اور — اور سخت“ اور اُس نے

اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپالیا۔

ہیل بران نے بے تاب ہو کر کہا ”سٹیفن بریٹ بھی ایسا ہی تھا۔ چلو اب لکھو۔ کھانے سے پہلے پہلے

میں افتتاحی باب ختم کرنا چاہتا ہوں۔

منصور احمد

ترجمہ

غزلیات

۳

اس خزاں کو بہار ہوتا تھا گل چسراغ مزار ہوتا تھا
کشتہ انتظار ہوتا تھا آپ سے بھر سار ہوتا تھا
حسن کی پردہ پوشیاں تکب عشق کار ازوار ہوتا تھا
بے نیازی نے موت کی مارا! جبر پر اختیار ہوتا تھا
کیوں بھلا بیٹھے وعدہ فردا حشر کیا بار ہوتا تھا
آکھ ساتی کی کمل مکی ہے تپش

تجھ کو بھی ہوشیار ہونا تھا
عبد اللطیف تپش

۴

بے اختیار چھڑ دیا ان کی پاریا وہ کون ہو جس کے ہواں تیند
بھر کر نگاہ دیکھتا ان کو مری محال پہنایا تھا آفتاب غالب غبار
میں جانتا ہوں نہ خبر سوال سوٹ یکفہ نہیں ہے اقلکار میں
میں اور بزم غیر میں مافد محال ہے یہ جرم گروا تو ہوا خلق یار میں
جہیت سکون دل مستلگیا تم کیا گئے کھلی گئی انتظار میں

میدان شاعری کے نہیں مرد ہم شباب
کہ بات ہے نہ کہ گئے اس کا راز میں

نور محمد خان
شکب
حیرت

۱

مر کے کیا قبر میں راحت ہوگی آکھ کھلتے ہی قیامت ہوگی
دل کو یہ کہہ کے تسلی دے دی کر بعد تکلیف کے راحت ہوگی
ذکر جنت ہے نہ فکر دوزخ آج واعظ کس عت ہوگی
اک بھگا و غلط انداز سی دل کی آخر کوئی قیمت ہوگی
سو گئے گھر سے آتے آتے نیند ان کی مری قیمت ہوگی
اشک کس نے سر بالیں چکا میری شیخ سرتربت ہوگی
وصل کی شب بڑھا دزبور سادگی اور قیامت ہوگی
تم اٹھے اور مراد مہلا تم سے پہلے مری قیمت ہوگی
گل معنی بھی کھلیں گے منفہ
کچھ شگفتہ جو طبیعت ہوگی

صفدر مرزا پوری

۲

نشاط روح کو چھکارا ہے محبت کا فرشتہ کارا ہے
ذمہ کھوں تو مجھ میں کیا رہا زما نہ آئند دکھ لارا ہے
سانی آئے گی کوئی چمن سے دل اپنی آپ بیٹھا جا رہا ہے
تفس میں آتو یوں نیا کجے سفر سے لوٹ کر گھر آ رہا ہے
مری فطرت مجھے ملتا رہی ہے زانہ اپنی اپنی کارا ہے
ذما چہرہ تو دیکھنا خدا کا کوئی طوفان جیسے آ رہا ہے
بڑی جنت میں ہو تو ہو رخصتی دگر غلام میں تیار رہا ہے

محفلِ ادب

زبان کی تدریجی ترقی

اول اول جب انسان نے ہوا کو حکم کا واسطہ بنایا اور آوازوں کے ذریعہ سے اولے مطلب کا اہتمام کیا تو وہ صرف انہیں محدود و چند سہل الخرج آوازوں کے نکالنے پر قادر تھا جنہیں بول کر چھوٹے بچے اپنی خواہشات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن جوں جوں انسان کو آلات گویائی کے استعمال میں مہارت ہوتی گئی، وہ حسب ضرورت انہیں چند سہل الخرج اصوات کو اونچے نیچے سوں میں ادا کر کے یا ان میں اتار چڑھاؤ پیدا کر کے یا ان کو گھٹا بڑھا کر مختلف معنی پیدا کرتا گیا۔ صاحبِ فرنگ آصفیہ کا خیال ہے کہ شروع شروع جب انسانوں نے اصوات کو اولے مطلب کا ذریعہ بنانا چاہا تو انہوں نے صرف تین مفرد حرکتوں یا آوازوں کو مضبوط کیا، جنہیں ہم اعراب یا حرکات ثلاثہ کے نام سے مانتے کرتے ہیں۔ یہ تینوں آوازیں یعنی آ، ا، و ہی ہیں جو زمانہ پیدائش سے اُن کے ساتھ سانس کے ہمراہ آتی تھیں اور سہل الخرج ہونے کے سبب ہر شخص سے آسانی اپنے اپنے موقع پر سرزد ہو جایا کرتی تھیں یعنی درد کے موقع پر درد کا سماں ان میں تھا دریا کی موجیں، ہوا کی نہریں، گنبدوں کی گونجیں، اترنے کی سیڑھی، چڑھنے کا زینہ، اور اپنے پیاروں کو کپکانے کی ندا، ہر قسم کی صدا، اطمینان کی چنگھاڑ، بیروں کی دھڑ، اور بادلوں کی گرج، بھیسری کی جھنجھناہٹ، گھس کی تین، قریب بید کی چیزوں کے اشاعت، دنیا کے ابتدائی دھندے، ان ہی تین آوازوں یعنی آ، ا، و میں موجود تھے۔ اور ہر ایک کیفیت اُن ہی کے گھٹانے بڑھانے سے حاصل ہو جاتی تھی لیکن یہ رائے غلو اور مبالغے پر اور حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے۔ مختلف خیالات، جذبات اور واقعات کو صرف ایک ہی آواز کی تین صورتوں کی مدد سے بیان کرنا اور لوگوں کا مشکل کے مشاکو معلوم کر لینا بعید از قیاس ہے۔ ننھے بچے بھی مندرجہ بالا حرکات ثلاثہ کے علاوہ چند اور سہل الخرج آواز بولتے ہیں۔ جیسے: ا، ا، بابا، دادا، ادا وغیرہ۔ لہذا انسان بھی عہد رموزی ہی میں اپنے جذبات چند قسم کی آوازوں سے ظاہر کرنا ہو گا۔ لیکن ”عہد صوتی“ میں ضروریات و احتیاجات، خیالات و معلومات میں اضافہ ہوجانے کے باعث زیادہ آوازوں کی ضرورت آن پڑی۔ چونکہ طویل مدت کے گزر جانے سے دماغ کے حصہ گویائی کی بھی پہلے سے زیادہ نشوونما ہو گئی تھی اور اُس کے ساتھ آلات گویائی مثلاً ہونٹ، ناک، منہ، زبان، تالو، حلق، دانت وغیرہ کی ساخت اور ہیئت میں بھی کسی قدر ترقی ہو گئی تھی، اس لئے انسان کو ان کی مدد سے مختلف قسم کے اصوات نکالنے میں سہولت

واقع ہوئی۔ انسان نے آوازوں کو کس طرح ترقی دی کہ کسی کو دونوں ہونٹ ملا کر کسی کو تالو سے، کسی کو حلق سے کسی کو زبان کی نوک سے، کسی کو ناک کی شرت سے نکالا۔ اب مختلف قسم کی آوازیں انسان کے قابو میں آگئیں۔ پس مختلف مفرد آوازوں سے مختلف قسم کے خیالات یا اشیا کا اظہار ہونے لگا۔ لیکن روز افزوں حاجتوں اور ضرورتوں کے سبب سے یہ محدود مفرد آوازیں تمام معلومات کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوئیں۔ لہذا مفرد اصوات کے اختلاط سے تمام اشیا کے نام سکے جانے لگے۔ اول اول جس شے کی جو فطری آواز تھی اس کی مناسبت سے اسم بنائے گئے۔ یکہ تک یہ طریقہ سہل اور قدرتی بھی تھا جیسے ہوا کے چلنے کو سائیں سائیں اور پانی برسنے کو جھم جھم، کتے کے بھونکنے کو بھون بھون، تلی کی بولی کو میاؤں میاؤں وغیرہ سے تعبیر کیا۔ اسی طرح جھیں جھیں کرنے والے جانوروں کا نام جھینگرا اور ٹر ٹر کرنے والے کا ٹرو ٹرو بھن بھن کرنے والے بھونرا، جھجھجھ بننے والے پانی کا نام جھنا پڑا جس شے کے ساتھ کوئی فطری آواز وابستہ نہ تھی، اس کا جو کچھ مناسب سمجھا گیا نام رکھ دیا گیا۔ اس طرح ایک معقول تعداد اسم کی تیار ہو جانے پر زبان کو غیر معمولی گرانباری سے بچانے کے لئے یہ اصول رکھا گیا کہ اگر کسی نئی شے میں دو یا زیادہ اشیا کی صفات یا مشابہات پائی جائیں تو اس شے کا ایک نیا نام تجویز کرنے کے بجائے اشیا معلومہ کے اسم کی آمیزش سے مرکب لفظ بنالیا جائے مثلاً انگستانی، اُس سلائی کے مانند، ایک کیرٹے کو کہا جو کان میں رینگ جاتا ہو، کنکھورا، اُس کیڑے کا نام پڑا جو کھور کے مشابہ ہو اور کان میں بیٹھ جائے، مگر راج بکرا، مگر۔ بھکنے والا، اُس اڑھے کو کہنے لگے جو بکرتے کو بھل جائے۔ اگر کوئی جانور دو یا زیادہ جانوروں کے مشابہ ہو تو اس کا نام ان ہی مشابہ جانوروں کے اسم کا مجموعہ قرار پایا مثلاً شتر مرغ، سکا ویش، فیل مرغ، شتر کھاؤ، پلنگ (زرافہ وغیرہ)۔ بعض جانوروں کے نام ان کی صفات یا خواص کی مناسبت سے رکھے گئے۔ مثلاً ہاتھی، یعنی ایک ہاتھ والا جانور، ہونٹ ہاتھ کی بجائے بھی گئی، چیتا وہ درندہ جس کی کھال پر چٹیاں ہوتی ہیں۔ سمندر، سام۔ آگ، اندر۔ درمیان، اُس کیڑے کا نام پڑا جو آگ میں ہے۔ بعض چیزوں کے نام ان کے افعال کے باعث رکھے گئے مثلاً مار خور، چوہے مار، چڑھی مار، نیولا، دنیو یعنی بنیاد، کھونٹنے والا وغیرہ۔ الغرض ان ہی اصول پر تمام اشیا کے اسم تیار کیے گئے۔ اوپر کی تمام مثالیں ضرورتاً آصفیہ سے دی گئی ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا بیانات سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ابتدائی دور تمدن میں اشیا کے وہی نام تھے جو اب بیان کئے گئے اور دور بربریت کا انسان اردو بولنے پر قادر تھا بعض اصول بچانے کے خیال سے ایسے الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں جو اردو میں متعل ہیں۔ ابتدائی انسانوں نے ان ہی اصول پر اشیا کے نام رکھے نام کہ یہ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان کے مقرر کرنے کے لئے اصول وہی تھے، جو اب بیان ہوئے۔ یہی وہ ابتدائی نینے تھے جن پر بعد رفتہ رفتہ کلامن ہو کر زبان نے اعلیٰ ترین تک مسود کیا واضح ہے کہ الفاظ کے نام بھی پہلے فطری آوازوں ہی کی

مناسبت سے رکھ گئے۔ مثلاً بھونچا، گرگڑانا، غراتا، کھٹکھٹانا وغیرہ، جہاں قدتی آوازوں کا فقدان تھا وہاں جو کچھ مناسب سمجھا گیا فعل کا نام رکھ دیا گیا۔ اکثر افعال کے نام اساتے اشیا سے بنائے گئے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا تھا۔ لہذا اور اس پر قابض ہو جانا، برتنا، یعنی کسی شے میں بجلی گزارنا وغیرہ۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس کے بعد ہمارے باہم نسبت دینے کے لئے روابط قائم کئے گئے۔ جب اسماء افعال اور دواہل مقدر ہو چکے تو گویا ایک باقاعدہ زبان کا ڈھنچکا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس کا لہجہ کی مناسب عضو بندی ہوتی رہی، یہاں تک کہ بالآخر ایک گستاخ ہوا اسٹول جیسا کہ ہوا گیا اور علم و فن کی ترقی نے آگے چل کر اس میں جان ڈال دی۔ تشبیہ و استعارہ کا نقاب ہٹا کر سیدھا سادہ معاملہ یہ ہے کہ معاشرت کی ترقی، احتیاجات کے اضافے، ضروریات کے جھوم، معاملات کی پیچیدگی، زندگی کی کشاکش کے زیر اثر زبان ہوتی، دن و رات چمکی ترقی کرتی گئی، ذخائر الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور لغات بڑھتی گئیں۔ جس طرح بچوں کی معلومات محض اشیائے مادی و محسوس و مقرون تک محدود ہوتی ہیں اور انہیں موجودات کا تصور نہیں ہوتا، اسی طرح ابتدائی انسان کی واقفیت مادی اور مرئی چیزوں تک محدود تھی۔ لیکن تمدن کی ترقی اور انتقالے ذہن کے باعث خیالات میں لطافت اور پاکیزگی آتی گئی اور موجودات و توصیفات کے لئے بھی نام تجویز کئے گئے۔ رفتہ رفتہ ادائے مطلب کے لئے عمدہ پیرایہ بیان اور اظہار خیالات کے لئے حسن اسلوب کی جانب ہنر انسانی رجوع ہوا۔ چنانچہ ہر روز نامہ ایک مرتبہ اور باقاعدہ زبان کی مستقل حیثیت قائم ہو گئی۔ آبادی اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان بھی ترقی کرتی گئی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا پچھلے الفاظ زبان کی رگڑ کھا کھا کر سننے، صاف ہونے اور گھل گھل کر سلیس ہوتے گئے۔ چنانچہ امتداد زمانہ سے الفاظ زبان کی خداداد چڑھ کر تراش خراش پاتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر زبان میں شستگی، حلاوت اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی۔ لیکن تقریبی زبان میں اس حد تک ترقی ہونے پر بھی رسم الخط و طرز تحریر ہنوز پردہ خفا میں تھی۔ الفاظ و خیالات ابھی ضبط تحریر میں آکر پابند سلاسل نہیں ہوئے تھے۔ دیوتاؤں کے بھجن، پیشوا یا پادریوں کی تعلیم، دانشوروں کے اقوال، راجاؤں اور سوراؤں کے کاغذ سے عرصہ دراز تک محض زبانی طور پر نسلا بعد نسل منتقل ہوتے رہے۔

”اردو“

مشاہدات

حوض میں ستابہ بٹ کے تیرنے سے جس طرح
کافی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطہ رگزار
مانفٹے، یوں ہی پاک بیدار کن گہری خراش
ڈال دیتی ہے شب میں پیسے کی بچار

مسکرایا خواب میں اس طرح اک طفلِ صبح
اور اس نرمی کو جیسے بتکدے کے طاق میں
ہو گیا دل دیکھنے والوں کا شادو باغ باغ
جھٹپٹا ہوتے ہی روش کر دیا جاتے چراغ!

شب کو اکثر کھلی ناریکیاں میداں کی
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھانی ہوئی
روح پر کرتی ہیں طاریاں اس طرح خواب گراں
جس طرح کٹرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گلا

سب سے پہلے عشق کی شب میں دلِ عشاق کو
صبح کچی نیند سے جس طرح چونک اٹھنے لگے
چٹکیوں میں یوں مست ہے خیالِ رنے یار
کس کی پھول سی آنکھوں میں چھبتا ہے غمار

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
ہل رہا ہے جو پہلو صنوبرِ شاعر میں
ترے نگاہ ہے، یادِ خیالِ دلِ انسِ نر
اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہر مہوڑا
جوشِ ملیح آبادی
رومی گیارہ

نغمۃ الفت

”مجھے اگر تو میرے ”حسن“ کی خاطر چاہتا ہے
آفتاب، شاندار حسین آفتاب سے الفت کر
میری لہجہ جانی“ پر اگر توفد اہوا ہے
بہار کو دیکھ اس کے شباب کو ہر سال نئی بقاء ہے
مدولت کے لئے اگر تو مجھ سے محبت کرتا ہے
بے بہا نایاب گوہرِ سندریں پوشیدہ ہیں
اگر تو مجھے محض ”محبت“ کی خاطر چاہتا ہے
میرا دل جو سورجِ سمندر اور بہار سے کم نہیں
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے
اُس کی ضیا مجھ میں کہاں؟
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے!
میری طرح اُسے فنا نہیں!
تو مجھ سے الفت کرنا چھوڑ دے
پھر تو انہیں کیوں نہیں چاہتا؟
تو پیارے مجھ سے الفت رکھ!
ہمیشہ کے لئے تیرا ہے!

”نظامِ کلج اردو میگزین“

اندھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو، ایک عذاب ہے یہ،
 ایک نقیض ہے ایک تضاد ہے یہ،
 ایک دن دو نارات چوگنا بوجھ،
 اپنا ہاتھ اپنی جو روکے کا ندھے پر رکھ لیتا ہوں
 اپنا بی رنگ ہاتھ اُس کی بے رنگ بے رنگی پر،
 اور وہ مجھ کو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
 تم کتراتے ہو، ذرا بیٹھے ہو، جگہ دیتے ہو اور سمجھتے ہو
 کہ تمہارے بیٹھے بچنے کی آوازیں پتھروں کے ٹکراتے کی آوازوں سے شیریں تر ہیں۔
 لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
 جیتا ہوں، رنج سہتا ہوں ہشور کرتا ہوں۔
 میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
 اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
 میرا دل یا میری انتڑیاں۔
 سنے تم نے یہ گیت؟ کچھ تم نے تو گائے نہ تھے یہ،
 اور گائے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں۔
 تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
 روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے۔
 اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو،
 اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے۔

”جامعہ“

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۃ فاتحہ۔ یہ کتاب علامہ محمد عبدہ مفتی اعظم مصر کی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے۔ علامہ موصوف ایک بلند پایہ مفسر تھے اور ان کی تصانیف تمام عالم اسلام میں مشہور و مقبول ہو چکی ہیں۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ ام الکتاب ہے یعنی اس میں سارے قرآن مجید کے معارف بیکل اجمال موجود ہیں اس لئے علامہ عبدہ کی تصانیف میں اس کتاب کو ایک خاص اہمیت حاصل کر رہی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے تنزل اور انحطاط کا سبب ان کی قرآن کی تعلیمات سے غفلت ہو اور اگر وہ پھر قرآن کو اپنا دستور العمل بنالیں تو اپنے شاندار ماضی کی روایات کو تازہ کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب بصیرت اور بیداری پیدا کرنے والی ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہت اچھے ہیں۔ حجم ۱۰۰ صفحات اور مجلد کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ مینیئر اسلامک لٹریچر کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۳۳ لاہور سے طلب فرمائیے۔

اسرار الاطباء جلد سوم۔ مولفہ حکیمہ عبد المجید صاحبہ شتیقہ داویب عالم یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں آفاتِ حکمت حکیم عبد المجید صاحب کمال مرحوم کے تمام وہ عجائبات ہیں جو ان کے اپنے طب کے لئے ایہ تاز تھے اور دوسرے حصے میں مشہور اطباء ہند کے معمولات درج ہیں۔ کتاب میں کل ۴۸۰ نسخے ہیں جن میں سر سے لے کر باؤل تک کے تمام امراض بدن کا علاج بتایا گیا ہے۔ نسخوں کے تعلق ہم کوئی نسخے نہیں دے سکتے کیونکہ ہمیں اس فن سے واقفیت حاصل نہیں تھی۔ ہم ان بالکمال اطباء کے ناموں کو اس امر کی کافی ضمانت خیال کرتے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں حصہ لیا ہے۔ اسرارِ طبائے ہند تالیف ہے اور ہمیں اہل فن سے توقع ہے کہ وہ اس کی پوری پوری نقد کریں گے۔ حجم ہونے چار سو صفحات کے قریب ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے اور اطباء کی آٹھ مکی تصویریں کتاب کی زینت ہیں۔ مجلد کی قیمت چار روپے و سٹ آنے مقرر کی گئی ہے۔ کارپوریشن انڈیا کابل ڈپلاز اور سے منسلک ہے۔

حکمت۔ ۱۹۲۹ء سے طبی رسالہ نذہ الخاں حکیم سید نواز علی صاحب کے زیر ادارت نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں طب قدیم اور تحقیقات جدیدہ کے متعلق نہایت مفید اور سکار آرم مضامین شائع ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ بڑے بڑے حکما کے مجرب صدی نسخے بھی درج کئے جاتے ہیں۔ اس وقت تک ہم اس کے پانچ نمبر دیکھ چکے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ کامیاب ثابت ہوگا۔ حجم ۵ صفحات اور سالانہ چند ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ نمونہ مفت بھیجا جاتا ہے۔ پتہ مینیئر رسالہ حکمت والا اسرار، حویلی پتھراں والی، موچی دروازہ لاہور

آپ کی یہ بات کیلئے لاجواب تحفہ

کشیدہ کاری کی اصلی مشین

یہ وہی بے نظیر مشین ہے جس کی نسبت اخبار تذبذب سوال میں ایک محترم قانون اپنے مضمون کے دوران میں فرماتی ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ اشتہار کی تعریف نہ صرف بے بنیاد نہیں واقعی یہ بھی سی چیز اپنی بساط کے زیادہ کا رنگ ہے جو ہمیں اس کے صحیح استعمال سے اپنی واقف میں ضرور مجھ سے متفق ہوگی کہ آرٹھی اسٹیمپا ایسی خوبصورت کاٹھی جاتی ہیں کہ کڑی طعنت گو یا ایک خاصا سدا سدا بار بچہ بن جاتا ہے جہاں باوجود کم کا خوف نہ خزاں کا اندیشہ — پرے ایسے پوٹھ کنڈال، فوٹو فریم، سیلبر و غیرہ کے لئے بہترین نکتہ زدن ہے۔ اگر احتیاط سے زیر استعمال کریں تو سالہا سال تک یہ چیزیں خواب نہیں ہوتیں۔ بچوں کے کلوک اور ذراک پر بھی خصوصاً کام ہاں پر ایک ایک چھوٹا سا پھول خود بخود معلوم ہوگا اور پرندے تو ٹوٹا بہت خوبصورت کاٹھے جاتے ہیں۔

ان الفاظ پر ہمارا کہہ اضا کرنا ہے سو دھوگا آپ ایک مشین سر سامان منگ کر دیکھئے دونوں میں آپ کا گھر پر رونق ہو جائیگا۔ منل، دوسری اور دوسرے مناسب کپڑوں پر نہایت عمدہ میں بوئے کالے کیلئے ہماری مشین نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے جو مشینوں کا کام مشینوں میں سر انجام دیتی ہے اس کا اہلکار تو کامیابی محض ہے بڑا دل فریب ہوتا ہے

قیمت مشین و سامان متعلقہ حسب ذیل ہے

مشین درجہ اول جو بچہ مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے عملی جس میں بند ہے ہلدر وہ پتہ آئے دیکھ دو کم تین پتے پر مشین بھی اچھی خاصی ہے کپڑے اتارنے کا نرم مع شین قسم اعلیٰ ایک روپیہ آٹھ آنے ریشم کی کچیاں ایک ہمدرد (دھڑ) کی درجن کپڑے پر چھپے ہوئے آٹھ آنے فی عدد حسب چیزوں کا کٹھا محصول ڈاک ۸

اس مکمل سٹک کو سنبھال کر رکھنے کے لئے بننے ایک اعلیٰ درجہ کا پالش شدہ کبس بھی تیار کر دیا ہے قیمت صرف ایک پتہ چار آنے پر مشین کے سہرا کام کا نوڑا اور مفصل ترکیب استعمال اردو اور انگریزی میں لکھی جاتی ہے نقلی مشینیں بازار میں بہت آگئی ہیں اصلی مشین کے لئے آپ صرف ہمارا پتہ یاد رکھیں ہماری فرم کی نسبت محترمہ جناب بنت ممتاز الحق صاحبہ پتہ منڈ پورلیس بمبائل وقتہ راز میں یہ تصدیق کی جاتی ہے کہ ایس احمد صاحب کے یہاں کی کشیدہ کاری کی مشین کا آمد اور پادار ہے سہرا ایک ہن اس سے مستفید ہو رہے ہیں غرض بھی اس کارخانہ سے اچھا دستیاب ہوا۔ اخبار کا حوالہ دینے سے سنگ کا خرچ نہیں لگے گا۔

یہ نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر نہایت مضبوط سہرا کام بنا ہوا ہے نفیس مزاج اصحاب اور بیکات کیلئے تیار کروائی گئی ہیں۔ پہننے میں آرام دہ اور ہلکی دیکھنے میں خوشنما اور دلکش اور دامنوں کے لحاظ سے گویا مفت میں گھروں میں پہننے۔ سیلبر وں کا عمدہ بدل بنا ہوگی کہیں آنے جانے کے وقت پہننے۔ آگئی زینت و بالاکریں کی قیمت زمانہ ساڑھ منل پر پتے سہرے کام والی دور پتے چار آنے فی جوڑہ مردانہ ساڑھ منل یا جوڑہ پتہ راز کام، دور پتے دس آنے فی جوڑہ

زرنگار مٹلی جوتیاں

پاؤں کا خاکہ فرمائش کے ساتھ آنا چاہئے۔ فرمائش میں ساڑھ کا حوالہ دینے سے پکٹنگ مفت۔
ملنے کا پتہ :- ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۵ لاہور

خلاف تحریر تو واپس
چل

دنیا بھر میں

خلاف تحریر تو واپس

اس نو ایجاد کے سب سے پہلے کارخانہ کی تیار کردہ پتیل کی خوبصورت پالش شدہ
پائیدار منٹوں میں سیروں نفیس و لذیذ رومالی سیویاں تیار کرنے والی مشہور عالم
مقبول عام و خاص نو ایجاد

میں
سیویاں

مشین سیویاں

میں
سیویاں

معزز ناظرین! اشتہاری اشیا فی زمانہ اس قدر بدنام ہو چکی ہیں کہ پبلک کو کسی اشتہار یقین نہیں ہو سکتا مگر
خلاف تحریر ہو۔ تو واپس کی شرط پر ناظرین سے اس نو ایجاد
کے خریدنے کی درخواست کرتے ہیں۔ تجربہ انشاء اللہ ہماری
تحریر کی تصدیق کرے گا۔ ایک مشین منگو کر ایک اسلامی
کارخانہ کی صداقت کا امتحان کریں۔



قیمت فی مشین پتیل مع چھلنی دو عدد ۵۰ روپے
۷۶ عدد ۷۰ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک
وغیرہ۔

صلنے کا پتہ
ہندوستانی ایجاد گھر دہلی

مردہ عزیز زول سے

ملاقات اور مات چیت گھر بیٹے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ پسرش و رنگ پانچھٹ جس سے ذریعہ تم غم لکھ لکھ ہو گیک سوال کا جواب دے سکتے ہیں ایک لکھیں ہر
 اختراع ہے سال کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی مدد کی ضرورت نہیں جنسی روم تکپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر اپنے
 والد کو درست جواب دیں بھولی لکھا پڑھا عہد اور ہر مذہب کا آدمی کام سے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے نہ کچھ کسی چلہ شی کی ضرورت عالم کے
 آلات کم کرنا گشت کا چہ لگا ناچوری کا سرغ معلوم کرنا دشمن سے بدل لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت عالم سے سب کچھ کام
 کھانا اور دروازہ فاصلہ پر ایک سکند میں خبر بھیجا تب لخواہ لو کر ہی یاد رکھا حاصل کرنا سب لفظوں کی عبارت پڑھنا مطلق صندوق و مکان کے
 اندر کی اشیاء معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں اس نایاب چیز کا ہر گھر میں موجود ہونا لازمی ہے داخل قیمت پانچ روپیہ لیکن تحفے عرصہ
 کے لئے محدود لاکھ صرف دو روپیہ چودہ آنے لئے جائیں گے۔ ہدایات مفت ارسال ہوگی سنا پڑہ صاف انگریزی یا اردو میں تحریر فرمائیں

کیمیکلز انڈیا (۱۱) جالندھر شہر پنجاب

تمام مذاہب اور فرقے متفق ہو گئے

تمام مذاہب متفق اسی طرح متفق ہو گئے ہیں کہ ایک سر کے بیان میں
 ذرا بھی فرق نہیں پڑتا مسلمان عیسائی ہندو مولوی پادری مان
 کی متفقہ آوازیں یہ ہیں کہ (۱) زمانہ حال کی حیات میں (۲) ایسا مافی
 نہیں کہیں (۳) مایوس بھی باور جوئے میں (۴) شیر نہایت ہی میں (۵)
 بالکل برائے نام ہے (۶) علاوہ ان کے ایک گھر کو لکھتی جوئی کی پتلا
 صدائیں بلند ہو رہی ہیں پچھلی استعمال کرتا ہے نہ صرف کثیر نہیں بلکہ اب
 بھی و کچھ کریں پتلا ہے ایام میں قبضی بہ بعضی خوشی خرابی اور کسی پتلا
 درد مولیٰ کمزوری شغ اور توت مانتہ کی کمی وغیرہ ہو کر اقل مدد کی
 مدد سے کی کو مافی حاصل ہوئی قیمت بڑے نام سنگلی کی قیمت ۲ روپیہ ۱۱
 صحت و تندرستی کی نعمت خوشی و مسرت کو متفقہ متجاہد دیکھانے
 میں تچا دوست کتابچہ شامترا بلک مفت ملے گا اگر ملاحظہ فرمائیں

بال متر گولیاں (ہمدرد لطفال)

بچوں کی ناساز طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی
 ہے اور گھر بے مدق ہو جاتا ہے لیکن یہی بنالین تندرستی کی حالت میں
 ایک مسرت کو دہلا کر دیتی ہے جو شخص ان کپڑے ہی ہمارے اسکی
 جوانی کیسی ہوگی اور کیا کر سکے گا اسلئے بیار کو نکوند دست اور ندرست
 کو طاقتور بناتے کیلئے بال متر گولیاں استعمال کرادیں یہ گولیاں بچوں کی
 جلد شکایتوں مثلاً دست کا ہاتھ کا ہونا شکم کا بڑھنا جکھم زرد پانی
 شست کالی بطن وغیرہ دودھ پور پوری صحت اور تندرستی چاہنے والے
 ہوتی ہے۔ قیمت فی ڈبہ جس میں سو گولیاں ہیں
 ایک روپیہ (۵)

وید شاستری منی شکر جی گوونیہ رام جی جام نگر کاٹھیاواڑ

جام صہبائی

حضرت اتر صہبائی کی رباعیات کا مجموعہ
ہر چکا ہے۔ آپ کی حیات افروز اور دلچسپ
رباعیات ملک کے مختلف بلند پایہ
میں شائع ہو کر نقادان فن سے خراج تحسین
وصول کر چکی ہیں۔ جام صہبائی کی غزلیوں کی
ضمانت کے لئے اخصاص کا نام ہی کافی ہے
قیمت صرف ۸

لئے کا پتہ :-

جلال الدین گبر الراجی بلڈنگ سیروں
بھائی دروازہ۔ لاہور

جذبات ہائیل

آنریبل خان بہادر ذیلیا محمد شاہدین صاحب کرم
یادگار لاج چھکورت پنجاب کا مجموعہ کلام
میں ان کی دلوں کی گلیز، اخلاقی فلسفیانہ نظریات
و گلیز غزلیات درج ہیں۔ جیسے کہ ان کے
آموز حالات زندگی اور کلام ہائیل پر تبصرہ
کیا ہے حجم ۸۰ صفحات دو تصویریں
کی۔ کھائی۔ چھپائی دلیق کا عقد قیمت
ایک روپیہ۔ دوم ۱۷ علاوہ محصول ڈاک

منشیہ الراجی بلڈنگ سیروں۔ لاہور

HUSAIN SOAP

یہ صابن خوشبو کا مالک ہے۔ اس کا نام ہسین ہے۔ جو کہ ایک بہت ہی عمدہ صابن ہے۔ جس سے ہر شخص کو بہت سی خوشیاں ملتی ہیں۔ اس صابن کی خوشبو بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس کی قیمت بہت ہی کم ہے۔ اس کی خریداری ہر شخص کو چاہیے۔ اس صابن کی خریداری ہر شخص کو چاہیے۔ اس صابن کی خریداری ہر شخص کو چاہیے۔

حسن یوسف ہسین
حسن یوسف ہسین
حسن یوسف ہسین

شرطیہ
شرطیہ
شرطیہ

شرطیہ
شرطیہ
شرطیہ

ہمایوں کا سال گرہ نمبر

دسمبر کے تیسرے ہفتے میں شائع ہو جائے گا۔ اس کے

لئے مضامین اور تصاویر کا اہتمام صرف کثیر اور کاوشیں عظیم سے
کیا گیا ہے اور بہترین و بلند پایہ ادیبوں کے مضامین نظم و شعر حاصل کئے گئے ہیں

سال گرہ نمبر نئے سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔ جو اصحاب

مستقل خریدار نہیں ہیں وہ اس کے لئے ابھی سے اپنی فرمائش

بھیج دیں:-

مینجر سالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ۔ لاہور

جدید فرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے!

اعلیٰ طبقتی خواتین سرسبز لگانے کیلئے اس کارخانہ کا نام و پتہ براہِ مہربانی استعمال فرمیں۔

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے!



دُفَعَا إِلَى بَيْتٍ

۱۱۔ اگر کسی نے اپنے دشمن کی طرف سے کسی چیز کی خبر لی تو اسے اسے اپنے دوستوں سے چھپا دے۔

محمد بن عبد الله بن محمد

وہاں پہنچ کر اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ وہ کون سے کون سے لوگ ہیں جن سے وہ ملے گا۔

عقلمندوں کی جانب سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے تم سے عرض کر رہا ہوں۔

سید شمس الدین علی ہمدانی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے تمام محفل و ملاں غالب و سادات کا بیجا ہے
 کیا یہ سید اور محفل سید کے ایک شانہ ہیں

میں کی کہانی یہاں اس ترتیب کی مثال بددستان ایک مادی نگہ پیش نہ کر سکے گا

موقع بھارن گھن شاہکاروں کی ایک شاندار مسجد

Twenty-one Coloured Plates reproduced in 4 columns by a world famous firm in Europe.

Two Coloured Outline Plates Classical work of Chignul.

Two Reproductions of Chinghai's most fascinating pencil sketches.

Colour Illustrations And the rest. Illustrated plates on tissue.

Bound in imitation Morocco, marked with beautiful design on back and both in gold, workmanship of a European firm. Enclosed in a handsome box.

All the 280 pages printed on Japan Vellum & high class Chromo one color.

All the 500 pages printed on Japan Vellum & high quality Chinese silk. All paper with highly decorated and elegant borders. SIZE 12 x 10.

Black Art paper with highly decorated and artistic borders.

وہ لوگوں کے غم و غصہ کو ہٹانے کے لیے

جنگل کے کلب چاہے سواران "مخبر"

رسالہ عصمت دہلی

شریف بیگمات کے لئے ہندستان بھر کا بہترین سالہ ہر
ای لئے

ہندستان بھر کے تمام زمانہ رسائل و اخبارات میں سب سے زیادہ اشاعت کہتا ہے

عصمت - ایکس سال سے لکھنؤ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور امراس، روسا، و شرفاد کے طبقہ میں قابل رشک مقبولیت و
دقت حاصل کر چکا ہے اور شریف کنواری بچوں کو آنکھ بند کر کے دیا جاتا ہے -

ہندوستان کے سینکڑوں رسالوں میں صرف عصمت کو یہ فخر حاصل ہے کہ علامہ راشد الخیری
مذہب کے گراں بہا مفاہین اور افسانے قریب قریب ہر ماہ شائع کرتا ہے -

ہندوستان بھر میں صرف عصمت وہ رسالہ ہے جس کی مضمون نگار خواتین ہندوستان کے ہر حصہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں -
عصمت کے دستکاری و خانہ داری پر مفید مضامین، تمدنی سائنس، تعلیمی تجلیں، عصمت کے سبق آموز و تہذیبیہ چیز افسانے، موقوفہ
دلاؤں، نظمیں ادب اردو میں امتیازی شان رکھتی ہیں -

عصمت - مضمون نگار خواتین کو نہایت معقول انعامات ہر سال تقسیم کرتا ہے -

عصمت - اردو کے مقدر رسالوں میں سب سے زیادہ تعداد پر شائع کرتا ہے -

اردو کے تمام رسالوں میں صرف عصمت کا نام مثل بیچ ۲۰ لکھن بیا کوئی کا نہایت خوبصورت جھٹپا ہے -

عصمت کی اشاعت میں کبھی ایک دن کی بھی دیر نہیں ہوتی، نہایت با بند وقت رسالہ ہے - ہفتہ ۳۰ تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے -

عصمت اردو کے تمام زمانہ رسالوں سے زیادہ مفاہین ہر ماہ شائع کرتا ہے - بھرتی کے مفاہین اس میں درج نہیں کئے جاتے -

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک پیشگی صرف پانچ روپے (دھرا)

قسم دوم بے تصویر معمولی نام مثل اوسط درجہ کا کاغذ - صرف تین روپے چھ آنہ (پتے)

قسم خاص تمام سالہ آٹ کاغذ پر چھٹپا ہے سالانہ چندہ دس روپے (۱۰) (نی پرچہ عمر)

سالانہ خریداروں کے ساتھ رعایت اگر اس وقت آپ عصمت سالانہ خریدار چاہیں
تو آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ عصمت کا

مشہور شاعر جوبی نمبر جس کی قیمت چھ روپے ہے صرف پچھ میں علاوہ محصول ڈاک حاصل کر سکتے ہیں اور سالانہ نمبر ۲۰ روپے
قیمت چھ روپے صرف عمر میں - مگر بہت کم پرچے آتی ہیں اس لئے جلدی کیجئے -

اردو رسائل کے خاص نمبروں میں عصمت کے خاص نمبر امتیازی شان رکھتے ہیں

مینجر عصمت کو چہ چیلان دہلی

جوہر عصمت

۱۳۔ سبق آموز فسانے

سیلاب اشک با تصویر

۷۔ درد انگیز فسانے



(۱) پرستار محبت عورت کا دل فدا و محبت کے خزان سے مالا مال ہے یہ سبق آموز فسانہ جو کھرے کھرے انسان کی آنکھیں نناک کر دیگی، اس کا ثبوت ہے اور بے انتہا مقبول ہوا ہے۔

(۲) بلوچن کے تین رنگ ایک خود دار لڑکی کی فدا داری انتہام اور احسان کے جوہر دکھا کر محو حیرت کر دیتی ہے۔

(۳) طلحہ قرن کا سفید بال سیاں بیوی کے تعلقات کیا چیز میں خود ارضا اور تیار کسے کہتے ہیں، ضمیر و ایمان کیا کام کرتا ہے اس غلیظانہ نہایت درد انگیز فسانے سے معلوم ہوگا جس نے کتنے ہی گھر تباہی سے بچا ڈالا۔

(۴) راج اکبر جس سے معلوم ہوگا کہ اس کا دل کس محبت سے لبریز ہوتا ہے اور سچی محبت کسے کہتے ہیں۔

عدل گلبدن - مشہد شاہ بابر کی تخت جگر شہزادی گلبدن کی شجاعت عدل و کرم احسان و عفو کے حیرت انگیز کارنامے۔

بے تصویر مسمی - بے انتہا موثر فسانہ۔

شریا کا ٹھیل - ہر انسان کی زرخیز صرف کر کے نوٹو بلاک کی تصاویر لگا کر تھی ہیں، جو شہو و مقصود و مسرت پر تیار ہیں۔

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

(۱) مظلوم بیوی کا پاک جذ بہ عرفان ایک شریف و معزز خاندان کا شخص بڑی محبتوں کی وجہ سے لاکھ کا گھر خاک کر کے جیلانہ بننے والا ہوتا ہے کہ مظلوم بیوی کی کوششوں سے اس طرح رہائی حاصل کرتا ہے کہ پڑنے والے ذمہ رہ جاتے ہیں۔

(۲) بھنور کی دہن - بلوچ قوم کے مرد و عورت کے عمیق کیر کٹر ازدواج ثنائی پر نہایت موثر بحث، محبت کا جواب اور انتہام بے انتہا دلاویز فسانہ۔

(۳) اگلی جھٹکیں ہزاروں برس پہلے کے تمدن کا ایک دلچسپ موقع شجاعت جان نثاری، دوستی، فدا داری اور سچی محبت کے حیرت انگیز نمونہ (۴) فسانہ تصویر، ملکہ تنویر کی درد و غم بھری کہانی۔

(۵) بیگناہ قتل محبت کی چوکھٹ پر کسان لڑکی کی قربانی۔

(۶) سجاد و ج کا کیسہ - دولت و عصمت کا مقابلہ

(۷) مامون الرشید کا دربار اور ایک سچی عورت۔

(۸) عدل جہانگیری - شہنشاہ جہانگیر کا انصاف۔

(۹) ببل کی شہادت (۱۰) ملک شہزاد (۱۱) برقع کی مستند (۱۲) غلط فہمی (۱۳) خاتمہ بالآخر - قیمت پندرہ

روح کی چوکھٹ پر مظلوم عورتوں کی قربانیاں

مقصود غم علامہ راشد بخیری کی لکھی ہوئی دل ہلا دینے والی مندرجہ ذیل کہانیاں

محمود دراشت	روح کی بھینٹ	اس ہاتھ سے اس ہاتھ سے	میں نے کیا دیکھا
نئی دہلی	کھنگ کا ٹیکا	سرتیل ماں کا آخری دنت	تفسیر عبادت
بیوی کی صحنک	توصیف کا طراب	شہد معاشرت	طوفان اشک

یہ وہ محبت انگیز فسانے ہیں جن کا ہنرستان ہر من و کانچ چکے علامہ عظیم نے ان انسانوں میں جا دویا ہے کہ شگدل سے شگدل انسان کو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان انسانوں کے مجموعہ کا نام طوفان اشک ہے قیمت صرف پندرہ (ایک روپیہ)

صلنے کا پتہ: منیجر عصمت کوچہ جیلان دہلی

دلی کے کھنڈروں کا پتہ

شاہجہاں آباد اور جیکھا گراں کے کھنڈر اب تک مٹنے والوں کے
 کا نام نہ سنا ہے ہیں انہیں ہر کے دو دیو اس وقت بھی اپنے جہان کا شریہ
 پر رہے ہیں آج سے ستر سال پہلے دلی کیا تھی بادشاہ کا جلوس قلعہ
 علی کی بہاریں، شاہی جگھٹے میلے تماشوں کے رنگ دسار کی کیفیت
 قطب صاحب کے مقبرے، پیر خیر شاہ بڑے اور کوئلہ کے
 اجن شہر آباد کی چل پہل، ہندو مسلمانوں کی معاشرت و مناس
 غیر مسلونو، ساگرہ کے ترک و احتشام، شادی بیاہ کی رسوم
 غرض دور گزشتہ کی بہار اگر دیکھیں ہو تو مقصورہ غم علامہ راشد الخیری
 لفظ کی معرکتہ الاراقصیف -

نوبت پنج روزہ

یعنی و داغ ظفر ملاحظہ فرمائیے جس میں آخری تاجدار
 علیہ کی پانچ نوبتیں اس قدر درد انگیز پیرایہ میں لکھی گئی ہیں
 کہ خون کے آنسو رونا دیکھی پانچویں نوبت وہ ہے جب دلی نے
 بادشاہ کو و داغ کیا غدر صفحہ کے واقعات، بخسروں کا ظلم،
 مظلوموں کی حالت زار مردوں کی بربادی، عورتوں کی تباہی،
 اور بادشاہ کی پیہم مصائب ناممکن ہے کہ آپاں سوسہائے بغیر
 پڑھیں، بادشاہ کی تصویر اور تین نادر عکس تحریریں بھی دی
 ہیں نوبت پنج روزہ دور حاضری کی مایہ ناز اردو مصنف کی
 بہترین تصنیف جو اور دہر دہر مکل رہی ہو اگر آپ نے نگاہیں جلدی
 کی تو یقیناً دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کاغذ لکھائی

بھائی سرچیز نفیس قیمت صنف غیر
 خاص نہایت اعلیٰ دیکھنے والی آٹ کاغذ چھپی قیمت

صبح زندگی شام زندگی شربت کی

زمانہ لیرجی کہ وہ غیر فانی کتابیں جتنے زیادہ مقبولیت کی اردو کی گذشتہ
 پچاس سال میں نہیں ہوئی آٹھ سال میں پچاس ہزار سے زیادہ فروخت
 ہو چکی ہیں اور آج بھی ہنگامہ کی حال ہے علامہ راشد الخیری مدظلہ کی وہ
 بعض تصانیف ہیں جنہوں نے ہزاروں گزشتہ ہوئے گھر بناؤ لے لے لکھوں
 مردوں عورتوں کو پھر سے پیرا جانو سے انسان کو دیا ہے ہر شخص کی
 تمام عمر میں ایک دفعہ تو ضرور ہی مطالعہ کرنا چاہئے اردو زبان ان کی بول
 ہر قیامت تک ناز کرے گی -

صبح زندگی شام زندگی شربت کی
 آجک اردو میں نہیں لکھی گئی، صبح زندگی کا ایک ایک حرف سرتیوں
 میں گونے کے لائق ہے - قیمت غیر

شام زندگی شربت کی
 دو نروں سے پڑیں پھر بچوں کو پڑھائیں علاوہ مفید ہونے کے دلکش
 ہیں کہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا - قیمت غیر

شب زندگی صبح زندگی شربت کی
 تصنیف میں جن لوگوں نے ایک اس کا مطالعہ نہیں کیا وہ ضرور متکا ہیں -
 عالم بالا کی سیر، نیک و بد روح کی کا دوا انگیز شریعت آسز مطالعہ علم

انگوٹھی کاراز

علامہ راشد الخیری کی مشہور تصنیف جسے حضرت مصنف نظر ثانی فرمائی
 اور جدید اضافہ کر کے تیسری مرتبہ عمدہ کاغذ و عسکت بک ایجنسی نے
 شائع کیا ہے انگوٹھی کاراز تین مختلف انچال لوگوں کا سبق آموز داستان
 ہے جسے پڑھ کر ہمیں انکس ڈیبا آتی ہیں تو کہیں جتنے ہنستہ پیٹ میں ہل
 چکے ہیں رابعہ کا عبت انگیز انجام اور اسلامی کی جگر خراش دستاویز
 اشرکے بغیر نہیں رہتی صغیر کی شکلات کو انگوٹھی کاراز اس خوبی سے مل کرنا ہو

منازل السامرة

از علامه راشد النخیری مدظلہ

یہ دھندلہ اور نفعیہ ہے جو یونیورسٹیوں کے
کونوں میں داخل ہے جس پر شعور و اجالات نہ
ہوئے شاندار دیو لوگوں کے لئے ایک لڑکے کا کعبہ انش
سے موت تک کے تمام واقعات اس قدر دلچسپ
پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ بار بار پڑھنے پر انسان
مجبور ہوتا ہے۔ حصہ اول عہ دوم عمر
قیمت کمبل - دو روپے (عکرا)

سائیت و فوئع اعمالنامہ

از عالمه را شد بخیر و نیکو

از علامه راشد الخیری مدظلہ

تعلیم نسواں کے مسئلہ میں غیر مسلم وراثت سے مستفید ہونا
 ہر گز جائز نہ ہے اس موضوع پر علامہ محبت نامی کے
 سرسبز الہار تصنیف تقلید مغربی کے دودن کا نتائج
 ریزنگ کا حشر و فتنہ جدید کا عبرت نامہ انجام ماں باپ
 کی نافرمانی، انیسویں صدی کے عجیب و غریب خاندان سادات کی بدنامی،
 ایسے ایسے باب ہیں کہ ان کو لکھنے میں قیمت ۸

فدیکے ساتھ بہترین کیریئر انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے
بحث، اس قدر دلچسپ قصہ کو کئی بار پڑھتے ہیں کہ
روتے پکی بندھ جاتے ہیں شستہ شستہ ہتھ میں بل
پر جاتیں۔ ہندوستان میں اسلام کا انجام اوسلطان کی
دورحاضرت کے دل ملا دینے والے قصہ میں۔
چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت ۸ روپے

آندلس کی شہزادی

از علامه راشداً الخیری، فقط

از علامه راشد النجری مدظلہ،

میرد کے نکاح خانی پر علامہ محترم کا مشہور تصنیف
 ہمسور و رواج میں چھپ کر مسلمان کس طرح تباہ ہوئے
 اس کی سبب معلوم ہو گا یہاں ایسا وقتستان لگے گا جہاں
 حکمت کی لاج رکھنے والی نبوی اور عزت پر قربان
 نبویاں ہاں دایں بائیں اپنے وہ معصوم بچوں کو لئے
 گہری نیند سو رہی ہے۔ نہایت سوٹر کتاب ہے۔

جس کا دوسرا نام نائید غنی بھی ہے مسلمانوں کو
بتائی ہے سوزِ دین اندس پروردہ کی کرپے میں کس طرح
انہوں نے ترقی کی اور کون کون سے اعمال سے ناپائے
تعبیہ و اتہاد و محبہ کی کبھی آنکھ سے آنسو نکل چکا
کبھی بے ساختہ مہیسی آجاسے بڑی عمر کی عورتوں
مردوں کے لئے ہے۔

ساتواں ایڈیشن قیمت صرف ۱۱۲

قیمت صرف ۸۰

امین دم واپس

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
نہنشاہ ہارن الرشید کے تحت جگہ اور ملک
زبیدہ خاتون کے محل شہزادہ امین الرشید کا
دردنک قتل اسلامی تاریخ کا ایک یونہی حد و انگیز
واقعہ ہے اس پر متعدد غم نے قیامت توڑ دی ہے
قصہ کے پیرایہ میں مامون الرشید اور زبیدہ
کے حالات لکھے ہیں۔ لکھا کی چھاپائی نہایت
 عمدہ دیدہ زیب ہے۔ قیمت ۱۲
محصول ملک ہندوستان

ستونی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
نوسہ ہستی بر نہایت دلچسپ اور سبق آموز
فنا یثار مذہبی تعلیم کے اثرات کا حال کتاب
ستونی میں ملاحظہ فرمائیے جو اپنے اعلیٰ کیرٹ پر
موجہیت کو دیکھ کر تعجب و کیرٹیت ہے کہ ہاتھوں
کاچہ تین ایڑیں کل گئے نہ ہوں کنواری لڑکیوں اور
شادی شدہ عورتوں کے لئے بلکہ مردوں کے لئے بھی
بہت مفید ہے قیمت صرف ۸

تفسیر عصمت

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
خلع اور ازداد پر معرکتہ الازا انسانہ
اس قصہ دلچسپ قصہ کہ بار بار پڑھے، اس قدر مدنی
را کہہ سکتے ہیں اس کے ساتھ اس قدر دلچسپ
ہے کہ ہفتے بیٹ میں بل پڑ جائیں ہر مسلمان مرد
دہر مسلمان دوست کو مطالعہ کرنا چاہئے اور وہ بل
اس قدر اعلیٰ درجہ کی انسانہ بہت کم ہیں
قیمت صرف ۶

گلہ عید

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
عید کا دعا، عید کا کرتہ، عید کی خوشی، ام جعفر کی عید، چہار عالم ترک نما
بجاس ہٹے کے سنانے کے چہار، کنواری کی عید، دو گانی عید وغیرہ وہ
ام سبق آموز انسانہ اور عوامین شکی ہندوستان جو میں دہم کی جگہ ہے اور
اشنا کر تہا ہے ہلوس ہے تو یہ مضامین پڑھیں میں عید کے مذہب ان کو
نے عبرت کا اور دیکھیں یہاں پہنچا ہے، سچی محبت سے کہیں دنیا کی کٹھن نہیں
کس طرح ملے گی جاتی ہیں۔ گلہ عید میں دیکھو جو ہر وقت پڑھنے
اور غور کرنے کی چیز ہے۔ قیمت ۱۲

قلب خزن

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ کے نہایت لطیف چھوٹے چھوٹے
اور ادبی مضامین۔ محبت کا تاج، تو جوشی کا جوڑا، شہر کی قبر،
سنان ستم، ابدی زندگی، فلسفہ موت، جذبہ نسوانی، ہمارے شب کا
تم، بالو می، دم واپس عالم خیال وغیرہ۔ ہر طرح پر اشیا پیدا اور
ش کہ ایک ایک فقرہ اور ایک ایک جملہ مفقود کرنا کو جی چاہے۔
را نسوانی کی ترجمانی اس کمال کے ساتھ کی گئی ہے کہ ہر فقرہ دل کے
دہر تہا ہے۔ ان مضامین میں شاعری کی لگی ہے قیمت ۸

منازل ترقی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
انسان ترقی کی دہن لیندی کے حقوق اور دولت
کے نشہ میں اخلاق انسانیت اور مذہب کو جگر
غیر مل لاوارثوں پر کیسے کیسے ظلم ہوتا ہے۔
دل نشیرن و دروں میاں یوی کے کیر کیر نہایت
دلچسپ ہیں۔ قیمت ۱۲

بچہ کا کرتہ

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
ایک عاشق زار بے نصیب اس دل کی کل کے کلان
جوان بچے کے لئے کسی بھینتیں اشفاق ہے اور
اس محبت کا دنیا کیسا عبرت انگیز جواب دہی
ہے اس درد انگیز آواز سے معلوم ہو گا۔
قیمت صرف ۱۲

پیری کی سرگزشت

از علامہ راشد الخیری مدظلہ
گڑا وہ موتی تو ہا بھی نہ تھا نیشن اور جدت کی دلدو
با انگریزی خاتون کی زندگی کے حالات خود ہی کی زبان
فری حاشرت کا نہایت کامیاب مترجم۔ یورپین
ہاں یوی کے تعلقات کا ہر بہو نوگو نہایت دلچسپ
دلچسپ قصہ قیمت صرف ۱۲

منہ کا پتہ: منیجر عصمت کو چہ چیلان دہلی

مظلوم عورتوں کی جگر خراش صدقہ

ہیں سے دل درد دندڑیاں نہیں گئے
ان درد و آگیزہ طعنے بند ہوئی جو علامہ
راشد الخیری دظلمہ نے حقوق نسواں
کی حمایت و حفاظت میں دشا نوشتا
تحریر فرمائیں، مظلوم حسینہ روضہ قدس
پر سرخاب کا دم واپس اسلم کا خط
شعبہ کے نام، اچھلے فیض، بیبیوں کی
فریاد و بچیں کی یاد و عید کا کریم،
تیمم کی کشتی و فیوض و طغیانی نہیں
سے کس مظلوم عورتوں کے دل سوڑا

اس کتاب کا نام **روادِ قفس** ہے
اور اب پانچویں مرتبہ چھپی ہے قیمت ۱۱/۱۰

تمغہ شیطانی

از علامہ راشد الخیری دظلمہ

وہ بیشی مشہور انسان جو جنہری سٹمپ سے عصمت میں سلسل
کمل رہا تھا اور اب کئی بی صورت میں چھپا گیا ہے حضرت علامہ محترم
نے اسلام جن سائنٹفک اصولوں پر پیش کیا ہے اور دشریح میں ہیں کی
ظہیر نہیں کر سکتی جن مسلمانوں نے سمجھ کر علامہ محترم کی کتابوں کو پڑھا
بماضی اسلام ان کے دل نشین ہو گیا اور ہزاروں گھرتیاں اور بربادی سے
بچ گئے تمغہ شیطانی میں است شیطانی کے آٹھ بے شکل کیکر نہیں۔
اور ہر کیکر خندت نامی مسلمانوں کی معاشرت کا جو ہو تو ہے انسان
کی دیکھی کی یہ کیفیت ہے کہ شروع کر کے ختم کے بغیر نہیں رہا جاسکتا،
ناگزیر ذوالی بہری خالصا حبیب و ملاجی وغیرہ کے حالات پڑھ کر بات
نہیں کہیں میں بل پڑ جاتے ہیں اور درد و آخر سراب میں کوٹ کوٹ
کر بھرا ہوا۔ ناممکن ہے کہ آئندہ سے اس سونہ کل پڑیں۔ تمغہ شیطانی
بے انتہا دلچسپ اور بے حد سبق آموز اور جہرت اذکر اساتذہ
کا غد چھپائی گئی اب اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت صرف ۱۲/۱۱
مینیجر عصمت دہلی

نانی عشو

از علامہ راشد الخیری دظلمہ

علامہ محترم کا نہایت پر لطف قصہ
جس کی قطعیں ابھی رسا عصمت میں
چھپی ہیں قطعیں کو تمام ملک میں ڈکھانچ
گیا۔ اس قدر پر لطف قصہ کے ہنستے
ہنستے بیٹ میں ہی پڑ جاتے ہیں اور بار
بار پڑھنے سے ہر قسم طبیعت سیر نہیں کرتی
نانی عشو کی کرکڑ نہایت دلنویس ہے
نانی عشو کے ساتھ ایسے ہی طرافت
آمین کرکڑ تیس خیز ۳۴ اور قصہ میں۔
ہاتھوں ہاتھ ۳۴ ایڈیشن ڈیرہ سالی
میں نکل چکے ہیں۔ قیمت ۱۰/۱۱

شہید مغرب

از علامہ راشد الخیری دظلمہ

وہ دو انگیزہ مضامین انسانے
یہ دو بک مسلمانوں پر جو ان کا نظام
اگر سیاسیات سے آپ کو دلچسپی
ہے اگر جوش ایمانی اور جذب وطنی
کا دریا آپ کے سینہ میں موجزن
اگر آپ اردو کی چاشنی کا لطف
اٹھانا چاہتے ہیں تو
شہید مغرب
کا مطالعہ کیجئے۔ کاغذ چھپائی وغیرہ
قیمت صرف ۱۲/۱۱

وداع خاتون

خبت مکانی محترم خاتون اکرم اگر ایک
اطمن تمام ملک کی مایہ ناز انشا پڑاز
تھیں بلکی ادنیٰ قابلیت پر تیرے
بڑے مرد شک کرتے تھے۔ تو
دوسری طرف بہ حیثیت عدت کے اس قدر اعلیٰ کیکر کرکڑ کی بی بی تھیں کہ ان کے اعز آج بھی ان کی یاد میں
خون کے آنسو گرا رہے ہیں حضرت علامہ راشد الخیری دظلمہ نے مرحومہ کے انتقال پر جو قیامت انگیز
مضامین تحریر فرمائے ہیں ووداع خاتون کے نام سے شائع ہوئے ہیں جو بتائینگے کہ ہر کسے کچھ نہ
اور لڑکی شادی کے بعد کس طرح سسرال والوں کے دل نفع کو سکتی ہے۔ ووداع خاتون کا ایک
ایک فقرہ دردناک میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناممکن ہے کہ اسے پڑھ کر آنسوؤں کی جھریاں نہ شروع ہو جائیں
موصول ڈاک بذمہ خریدار
قیمت صرف ۱۱/۱۰

ملنے کا پتہ: مینیجر عصمت کو چہ چیلان دہلی

فخر نسوان ہند محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی کی بے مثل تصانیف
جن سے اردو لٹریچر میں گراں بہا اضافہ ہوا

پیکر وفا

ایک نہایت دلچسپ سبق آموز افسانہ مع دیباچہ از منیر عصمت
خاتون اکرم جنت مکانی کی کاسیاب افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ۔
رسالہ جمالیات کی راسخ ہے پیکر وفا ایک کاسیاب و مفید افسانہ ہے جس میں
عورتوں کے اس احترام کو واضح کیا گیا ہے جس کی تعلیم مذہب اسلام نے
ہمیں دی ہے، انداز بیانی و دراز نگیز عبارت سادہ و دلکش ہے۔
اخبار ریاست لکھتا ہے: پیکر وفا ایک نوجوان لادینہ افسانہ ہے۔
طہریان اس قدر صاف و دلکش کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔
رسالہ حرم کی راسخ ہے: پیکر وفا میں عورتوں کی دنیا داری و قربانی کا
بے مثل نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ آرٹ کا غلبہ برنگین بھی ہے
قیمت صرف آٹھ آنہ (۸/)

جمال بخشیں

یہ ہیں محترم خاتون کے لادینہ مضامین میں جلی مضمون نگاری کا ہندوستان
بہترین نمونہ ہے جو تعریف یافتہ خواتین کے محبوب ترین انشا پرداز
تھیں، جن کے فلسفیانہ خیالات نے جن کے دروازوں میں دلیہ ہوئے
نارنجیہ نے بڑے بڑے قابل ہر دوں کی خراج تحسین وصول کیا تھا۔
جمال بخشیں مندرجہ ذیل مضامین کا مجموعہ

فانی زندگی	تغیرات زندگی	نیرنگی زمانہ	اجل
عالم نزع	جہت گاہ دنیا	عزم	سوسم بہار
سادہ	بھول	رفشان	مید
زندگی زندہ ہستی	شعل ہدایت	کسی کی یاد	دعہ و فانی
جہنی مذاق	خوشی کا دن	خدا کی محبت	تغیرات نامہ

ایک نیا ڈیلی میبل کا راسخ: جمال بخشیں کی اردو صاف و دلچسپ ہے
انجمن مسلمہ کے راسخ: جمال بخشیں کے مضامین کی عبارت بہت
علی گڑھ میگزین کے راسخ: خاتون اکرم مرحومہ فخر نسوان ہند
نہیں قابل قدر کہتا ہے۔
مضامین کے اعتبار سے جمال بخشیں اردو کی جوتی کی کتوں میں سے
اردو صورتی کے اعتبار سے بہت کم اردو کتابیں ایسی دکھائی دیتی ہیں
تمام کتاب آرٹ کا غلبہ برنگین بھی ہے۔ بقولیت کا انداز اس سے
لکھیے کہ ڈیڑھ سال میں تین دفعہ چھپ چکی ہے۔
قیمت صرف عہد
علاوہ محصول لاٹ

بچھری بیٹی

ایک نہایت دلچسپ افسانہ

ایک لڑکی ال باب سے بچھری جاتی ہے اس کی جدائی میں، اس کی کیفیت
ہوتی ہے وہ صرف پڑنے سے تعلق رکھتی ہے۔ برسوں کے بعد لڑکی
اس طرح ملتی ہے کہ بے ساختہ جنت مکانی کی کاسیاب افسانہ نگاری کا
معترف ہونا پڑتا ہے، پلاٹ بے انتہا لادینہ طرز تحریر پر مشتمل و دلکش۔
یہ افسانہ اردو کے کئی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوا ہے
قیمت صرف چھ آنہ ۶/ علاوہ محصول لاٹ

ملنے کا پتہ: منیجر عصمت کو چہ چیلان دہلی

عجمت جوہلی نمبر کا دوسرا ایڈیشن

اُردو محافت میں ہمیشہ یادگار رہنے والا عجمت جوہلی نمبر جس کے شائق ہندوستانی پریس کی متفقہ رائے ہے کہ اس سے بہتر شائد اور دلیچسپ مفید خاص نمبر کسی مردانہ یا زمانہ رسالہ کا شائع نہیں ہوا ختم ہو چکا تھا لیکن شائقینِ ادب کے اصرار پر اب دوبارہ چھپوایا گیا ہے وہی تمام مضامین ۲۵۰ صفحات کے وہی بیس سادہ رنگین ۶۰ تصاویر جن میں ایک درجن بلاک جڑنی میں بنے ہیں، وہی کاغذ لکھائی چھپائی غرض دوسرا ایڈیشن نہ کثیر خرچ کر کے آنا ہی شائد اور خوبصورت تیار کیا گیا ہے۔ عجمت کا جوہلی نمبر اگر آپ کے کتب خانہ میں نہیں ہے تو آپ کی لائبریری یقیناً نامکمل ہے قیمت صرف چار۔ مگر جدید خریداران عجمت سے بچ کر اس کے مقابلہ میں دس روپیہ بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

مسلمان لڑکیوں کیلئے کوئی مذہبی رسالہ نہ تھا

رسالہ بنات

تربیتِ گاہنات دہلی سے علامہ رشتہ الخیری مدظلہ نے جاری فرمایا کہ اس کی کو بھی پورا کر دیا اور دو سال میں ہی بنات کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اب

ماہوار سے پندرہ روزہ ہوتا ہے

بنات کے دلچسپ اور مفید مضامین لڑکیاں ہی نہیں بڑی عمر کی عورتیں اور مرد بھی بڑی خوشی سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، عجمت کے علاوہ صرف یہی پرچہ ہے جس میں علامہ رشتہ الخیری مدظلہ کے مضامین شائع ہوتے ہیں نومبر سے بنات پندرہ روزہ شائع ہوگا۔ سالانہ چندہ صرف دو روپے اس چندہ میں تربیت گاہ بنات جیسی مفید درسگاہ کی نادار یتیم بچیوں کی امداد بھی شامل ہے اس لئے ہر دردمند مسلمان کو بنات منگانا چاہئے۔ اس قدر کم چندہ میں بنات سے زیادہ مفید رسالہ

ہندوستان بھر میں نہیں مل سکتا
مینجر بنات دہلی

قواعد

- ۱۔ ”ہمایوں“ بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔
- ۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی، مصلحتی و تہذیبی، لیکن وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کے جلتے ہیں۔
- ۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔
- ۴۔ ناپسندیدہ مضمون لکھنے والے کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔
- ۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔
- ۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم ہفتہ ہواور ۹۳۶ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔
- ۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمت بھیجا جائے گا۔
- ۸۔ جواب طلب امور کے لئے ایک ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔
- ۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، سہ ماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ نمونہ ۰۶ روپے۔
- ۱۰۔ نئی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل نام تحریر کیجئے۔
- ۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا ضروری نمبر جو لفافہ پر تپہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

منشی سید الدین خیر علی صاحب کلبانی، پریس، لاہور میں، ہاشم آباد، امام الدین پٹر حصہ ۱، کراچی لکھا

رجسٹرڈ نمبر ای ۱۳۶۳
 اٹھواؤ اگر نہ حشر تہیں ہوگا پھس کبھی
 دوڑو! زمانہ پال قیامت کی حل گیب
 (جہا یوں)

يَا كَارِعِلَا فِضِيَّةَ اَنْزِيلِ حَبْسِنِ مَيَا مُحْتَدَا صَا هَا يُوْنِ مَرْمُ

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی۔ اے (اگسٹ) بیرسٹر ایٹ لاء

حامد علی خاں - بی۔ اے

منصور احمد

جائنٹ ایڈیٹر

فہرست مضامین

جلد ۱۶

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء

تصویر: گوٹے اٹلی میں

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	نمبر شمار
۸۹۲	مینجر	سال گرہ نمبر	۱
۸۹۵	بشیر احمد	رباعیات	۲
۸۹۶		جہاں نما	۳
۹۰۰	منصور احمد	گوٹے اٹلی میں	۴
		تصویر: گوٹے اٹلی میں	
۹۰۱	”قراخاں“	غالب اور ہائے	۵
۹۰۹	حضرت آصف گوندوی	نشاط روح (نظم)	۶
۹۱۰	جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری	حسن خاموش	۷
۹۱۸	جناب حکیم آزاد انصاری مدظلہ العالی	غزل	۸
۹۱۹	تلک پریا	شیطان اور بزرگ	۹
۹۲۳	جناب مولانا بشیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی	بزم خرابات (رباعیات)	۱۰
۹۲۵	جناب محسن عبد اللہ صاحب	تاریکی	۱۱
۹۲۷	”پرستار حسن“	نفاست کا طلسم	۱۲
۹۲۹	جناب سید علی اختر صاحب اختر	پروانہ (نظم)	۱۳
۹۳۰	جناب مولوی مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی	عبرت (افسانہ)	۱۴
۹۴۵	جناب اختر صدیقی امروہوی	غزل	۱۵
۹۴۶	منصور احمد	چھلاوہ (افسانہ)	۱۶
۹۵۱	جناب مولانا ابوالفضل راز چاند پوری	ذیائے رنگ و بو (نظم)	۱۷
۹۵۲	جناب نور الہی محمد عمر صاحبان	شاعر اور مغنیہ (افسانہ)	۱۸
۹۵۶	جناب مختار تہذیب فاطمہ صاحبہ عباسی	اے سکھی!	۱۹
۹۵۹		محفل ادب	۲۰
۹۶۲		مطبوعات جدیدہ	۲۱

سالگرہ نمبر

ہمایوں کے آٹھویں سال کا یہ آخری پرچہ ہے۔ جنوری کا سالگرہ نمبر ہوگا، اور اس تقریب پر مجبوراً وہ خاص اہتمام سے تیار کیا جائے گا۔ اس کا حجم پورے دو سو صفحات سے زائد تجویز کیا گیا ہے اس کیلئے بہترین اور بلند پایہ ادیبوں اور مصوروں کے مضامین و تصاویر صرف کثیر اور کاوش غلیم سے حاصل کئے گئے ہیں۔ مضامین کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے کہ ہمایوں کا یہ سالگرہ نمبر گزشتہ کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ اور زیادہ کارآمد ہوگا۔ تصویروں پر دلکش نقوش ہو گئی یعنی مصوری کی ترجمانی شاعر کے احساسات لطیف کریں گے۔

دنیا کے نئے تمدن کے متعلق ایک جامع اور مبسوط مضمون ہوگا جس میں انسان کی آئندہ رفعت و عظمت کا نقشہ پیش کیا جائے گا۔

ہمایوں کے فلک پیمانہ نگار کے قلم سے ایک ”کلیما“ مضمون ہوگا، جس کی مذمت اور شکستگی کیف انگیز ہو گئی چار یا پانچ مختلف النوع افسانے ہو گئے جن میں زندگی، کمال بینی، محبت اور اخلاق کے بصیرت افروز مناظر نظر آئیں گے۔

عورتوں کی زبان میں ایک پُر لطف سیر کی سرگزشت ہوگی جسے ایک مسئلہ اور مستند اہل زبان نے لکھا ہے۔ زبان اردو کی ایک نہایت اہم تحریر پر تنقید ہوگی جو اپنی دلچسپی کے لحاظ سے لا جواب ہوگی۔ دوسرے عالی پایہ مضامین، دل افروز نقوش اور خوبصورت یک رنگی و سہ رنگی تصاویر بھی قابل دید ہوں گی نظم کا حصہ خاص طور پر بلند ہوگا۔

سالگرہ نمبر میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے ادبا و شعرا جلوہ افروز ہونگے:-

میاں عبدالعزیز، سید سلطان حیدر جوش، آغا حیدر حسن دہلوی، حکیم آزاد انصاری، مولانا جوش ملیح آبادی، حضرت اصغر گوندوی، جناب حمید احمد خاں، حامد احمد صاحب آفسر میرٹھی، عاشق حسین صاحب بٹالوی، بیباں عطا الرحمن، حضرت احسن مہروی، جناب اثر صبا، جناب جگر بلوی۔

سالگرہ نمبر نے سال کا بہترین تحفہ ہوگا۔ اسے کثیر تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے اپنے دوستوں کے لئے زائد جلدوں کی فرائشیں جلد بھجوائے قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے سالانہ خریدار بننے والوں سے اس پرچے کی علیحدہ قیمت نہ لی جائے گی۔

منیجر

رباعیات

(۱)
آزاد شہر ہے ایک حد کے اندر
فتار ہے اپنے نیک و بد کے اندر
کمن ہے بہت ڈنک اس کی پروا
مجبوری ہے گونج جبر کے اندر

(۲)
ہر پہلو ہے اب کام نہ چھوڑی کا
ضامن ہے اس کے غم و شادی کا
کٹ جاتی ہے ایک ایک کے سبب
دنیا میں زمانہ ہے اب آزادی کا

(۳)
ہر زندگی عاقل بھی ہے جاہل بھی ہے
ہر زندگی صادق بھی ہے باطل بھی ہے
وہبت اُدھر حق سے اُدھر ذلیل ہے
ہر زندگی ناقص بھی ہے و کمال بھی ہے

(۴)
کچھ کام میں ایسے کہ نشان ہوں میں
کچھ کام میں ایسے جی کہ تاراق میں
اب ناز کروں اپنی پشیمانی پر
ایمان نہ چھوڑے پشیمانی ہوں میں

شیر احمد

جہان نما

امریکا میں حبشیوں کی ترقی

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں انقلابِ انجیز تبدیلیوں نے جہاں ممالکِ متحدہ امریکا کو اقوامِ عالم کی سب سے اگلی صف میں لاکھڑا کیا وہاں حبشیوں کے لئے بھی ترقی کا راستہ کھول دیا۔ اب حبشی خوش بختی کے دور میں داخل ہو چکا ہے اور جلد جلد جیاتِ لمبیدہ کا ایک جزو شمار ہو رہا۔

آج سے بیس سال قبل اس ملک کی ترقی کے لئے بڑی بھاری رکاوٹ سمجھا جاتا تھا، ایک ابدی وازلی ذلیل سنی جسے امریکی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اُس وقت اسے بھی اپنے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ اسے اپنی ذلت کا پورا یقین تھا اور اسے خیال تک نہ تھا کہ اپنے حقوق منوانے کے لئے وہ اپنے پرانے شیزازے کو منظر کر سکتا ہے۔ اُس زمانے کی سائنس اُسے ادنیٰ قسم کا انسان شمار کرتی تھی اس پر صرف حبشی کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اُس کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ لوگ ہر مہفتہ تین حبشی ہلاک کر دیتے تھے۔ اُن کے مال و الماک چھین لئے جاتے تھے جنوبی علاقوں میں نوواردوں نے حبشیوں سے وہ کام چھین لئے جو نسلاً بعد نسل شمالی علاقوں میں انہیں کے قبضے میں چلے آتے تھے۔ اُن ابتدائی صنعتوں میں جنہوں نے امریکا کا مرتبہ بلند کیا حبشیوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ بہت کم حبشی کالجوں میں تعلیم پاتے تھے اور بہت کم حبشی تعلیم یافتہ پیشوں میں تھے حبشی ادب بالکل موجود نہ تھا چسٹ نٹ اور ڈنڈر جیسے مصنفین مستثنیات میں سے سمجھے جاتے تھے جنوب میں حبشیوں کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ سیاست دانوں کو پختہ یقین تھا کہ حبشی تہذیب، جرم اور کمزوری کی وجہ سے بالکل نابود ہو جائیں گے۔

آج حبشی ایک زبردست اور منظم قوم ہے جو اپنے حقوق کی خود حفاظت کر سکتی ہے، اپنی ترقی کے لئے راستہ صاف کر سکتی ہے اور اپنی ضروریات کو مہیا کر سکتی ہے۔ اب وہ اپنی نسل پر نازاں ہیں اب سائنس بھی اُن کا ہمنوا ہے اور کتنا ہے کہ اُن کی پستی کا کوئی ثبوت نہیں اور امریکی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان میں ہر طرح کی اہلیت موجود ہے۔ اب گورے اور کالے سکولوں میں حبشی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور فقہ کے حبشی تمدن کی اب تدیس مجھ آچلی ہے اور اسے پسند بھی کیا جاتا ہے۔ حبشیوں کے قتل کے واقعات ۱۹۱۷ء میں صرف گیارہ تک رہ گئے۔ اب بہت سے شہروں میں حبشی ارکانِ کونسل موجود ہیں۔ وہ رکنِ مجلسِ قانون ساز ہیں، بلکہ ملکی کا محکم

میں بھی ان کا ایک کزن موجود ہے۔ دس ہزار حبشی ہر سال امریکن کالجوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ ان کے ۴۵ ہزار معلم ہیں جن میں سے ۴۴ اسوا اعلیٰ تعلیمی مراکز میں ہیں۔ حبشی ناول نویس مضمون نگار اور شاعر امریکا کے ادب میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ جارج کارور اور ارنسٹ جسٹ بہت بڑے سائنس دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۲۵ سو حبشی ڈاکٹر اور سرجن ہیں۔ ایک ہزار سے زائد حبشی وکیل ہیں جن میں سے کئی بچ ہیں اور دونوں نسلوں میں داد انصاف ملے رہے ہیں۔

حبشیوں کے جلد نابود ہو جانے کے متعلق تمام پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئی ہیں۔ برخلاف اس کے دیکھو کہ مقابلہ میں ان کی موت میں اک نمایاں کمی واقع ہو گئی ہے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان صرف تپ دق کی اموات میں ۴۲ فی صدی کمی واقع ہو گئی ہے۔ حبشیوں کی رفتار پیدائش اس وقت وہی ہے جو آج سے ۳۰ سال قبل گوری قوم کی تھی اور جو کئی یورپین ممالک سے زیادہ ہے۔ عام تعلیم، بہتر اقتصادی حالت اور بہتر صحت کی وجہ سے اس میں اور بھی ترقی ہو رہی ہے۔

گزشتہ بیس سال میں حبشی ترقی کی راہ میں بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن بعض مشکلات اب تک ان کے راستے میں حائل ہیں۔ ابھی ان کو بہت طویل راستہ طے کرنا ہے لیکن وہ صحیح راستے پر گامزن ہیں اور پچھلے بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ وہ بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

ٹالستانی کس طرح مرا

اجار لونگ ایچ "لکھتا ہے کہ سوویٹ حکومت ایسی تحریریں نہایت سرگرمی سے شائع کر رہی ہیں جن سے کونٹ ٹالستانی کے عہد اور اس کی شخصیت پر کوئی نئی روشنی پڑتی ہو، شاید اس لئے کہ لینن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "جنگ اور امن" دنیا کی بہترین تصنیف ہے۔ ان تحریروں میں سے آخری دو تاروں کا مجموعہ ہے جو اٹاپوود کے مقام سے بھیجے گئے جہاں ٹالستانی کا انتقال ہوا۔ ذیل کی سطور ہم اس اخبار سے نقل کرتے ہیں:-

اواخر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں سرکونٹ نے اپنے گھر کو چھوڑا اسے خیال تھا کہ اس کی نقل و حرکت بالکل پختہ خفا میں ہے لیکن حقیقت میں پولیس اُس کے ساتھ تھی جو اُس کے تمام حالات سے اُس کی بیوی کو خبردار کرتی تھی۔ اُس نے ٹالستانی سے دستبرد کا کھٹ لیا اور اپنے دوست ڈاکٹر میکوش کی میت میں سفر کر رہا تھا کہ ۳۱ اکتوبر کو تیسرے پیر کا ایک بیادری نے اُن کو پایا۔ وقت گاڑی اٹاپوود کے گاؤں سے گذر رہی تھی۔

کونٹ کو فوراً گاڑی سے اتار لیا گیا۔ سٹیشن ماسٹر نے اپنا مکان اپنے معزز مہمان کو پیش کر دیا۔ پولیس ٹالستانی کے

خاندان، حمائد اہلادریوں کو فوراً خبر دی گئی اور یہ تمام اس چھوٹے سے قصبے میں آوارہ ہوئے۔ ٹالٹائی کی بیوی گاڑی کے ایک ڈبے میں فروکش ہوئی اور اس علاقے کا گورنر ایک دوسرے ڈبے میں۔ فوجیں بلائی گئیں اور توپیں اور بارود موقع پر جمع کر دینے گئے۔ کلیسا اپنے اس وقت تک اُس کے لئے دعا کرنے سے انکار کر دیا جب تک وہ دوبارہ کلیسا کے حلقہ میں داخل ہونے کے لئے رضا مند نہ ہو جائے۔ حکام کے اوسان خطا تھے اور وہ تشدد پر آمادہ ہو رہے تھے لیکن تمام قوم میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔

اس چھوٹے سے اسٹیشن سے برقی پیغامات کا ایک طوفان اٹھ اچلا آتا تھا۔ ان پیغامات کے مختلف مضامین سے معاشرہ کے مختلف طبقوں کے دلوں کا ایک بدہم سا نقشہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ پہلا پیغام پولیس افسروں کا ہے: ”مصنف کو نٹ ٹالٹائی گاڑی میں بیمار ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹرز ولن نے اُسے پناہ دی“ دوسرے روز خود ٹالٹائی نے اپنے ایک دوست کو تار دیا: ”کل بیمار ہو گیا۔ مسافروں نے مجھے گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا۔ آج حالت اچھی ہے اپنا سفر جاری رکھوں گا۔ تدبیر کرو۔ نکولیو“ لیکن یہ بات جلد ہی صاف ہو گئی کہ ”نکولیو“ جیسا کہ اُس نے اپنا نام ظاہر کیا تھا اس اسٹیشن سے زندہ رخصت نہ ہو سکے گا۔ اُس کے باقی حالات مندرجہ ذیل پیغامات سے ظاہر ہوتے ہیں: ”اگر اُن قائم رکھنے کے لئے مدد کی ضرورت ہو تو لیڈین سے پولیس بھیج دی جائے“ یہ ایک ہسایہ صوبے کے گورنر نے مقامی گورنر کو لکھا۔ ”آج اسٹاپو دوو ہینچا۔ کو نٹ کا گھر انہیں ہے۔ کل پھر تار دوں گا۔ دعا کے لئے تیرے دل سے اس دعا کرتا ہوں۔ وارسونوف (پادری) ایک اخبار نویس نے پیغام بھیجا: ”خزاں کی تاریک اور طوفان انگیز رات تمام حاضرین کی روحوں کے ساتھ غم انگیز خیالات میں مہنوا ہے۔ کیا روس کا آفتاب غروب ہو جائے گا؟ پولیس لکھتی ہے بالکل امن ہے۔ اسٹاپو دوو کے باشندے کو نٹ کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ انتظامات معقول ہیں“

جب کو نٹ کا آخری وقت آن پہنچا تو پیغامات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا۔ ”دل کو سخت تکلیف ہے حالت نازک ہے“ گھر والوں کو جگایا اور بلا گیا ہے۔ حالت خطرناک ہے“ ”دل کمزور ہو رہا ہے۔ گھر والے اسٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔ کو نٹ بھی۔ ڈاکٹر رور ہے ہیں“ ”تیار رہو“ ”سورہا ہے نبض کمزور ہے۔“ ”دھانی بجے، کوئی قابل ذکر بات نہیں؟“ ”نہیں بجے۔ نئے خطرے پیدا ہو گئے ہیں“ ”مارفان کا ٹیکہ لگا گیا۔ حالت ویسی ہے۔ سورہا ہے۔ ٹانگیں کم ہیں“ ”پانچ بجے۔ دل یکایک کمزور ہو گیا حالت سخت خطرناک ہے۔ دھند بھکڑ چل رہا ہے۔ پولیس پہرے پر ہے“ اس کے پانچ منٹ بعد پولیس افسر نے اعلیٰ عہدہ دار کو تار دیا: ”ٹالٹائی مر گیا۔ اُس کی موت کی پہلی خبر اُس کی بیماری کی پہلی خبر کی طرح پولیس ہی نے بھیجی۔“

پنجاب میں علم کی سرپرستی

مندرجہ ذیل شدہ ہمیں پنجاب بکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے اشاعت کے لئے موصول ہوا ہے۔
مولفوں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک فنڈ قائم ہے، تاکہ اس صوبے کی دیسی زبانوں کے اہل علم کو مفید اور عمدہ کتابیں لکھنے کی ترغیب اور تحریک ہو، اور علم ادب میں ترقی ہو۔ یہ انعام صرف اس صوبے کے ہٹے والوں کے لئے ہیں اور صرف چیدہ اور خاص نوعیت کے قابل کتابوں کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ ترجیح جب تک غیر معمولی اور نوکھی قابلیت کے نہ ہوں انتخاب انعام میں نہیں آسکتے۔ انتخاب انعام کے متعلق کمیٹی نے چند قواعد و ضوابط مرتب کر دیئے ہیں، اور انتخاب کے وقت ان پر عمل ہوتا ہے۔ ان قواعد کی نقل دفتر پنجاب بکسٹ بک کمیٹی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ انعام دینے کی غرض بک کمیٹی ان تصانیف پر غور نہیں کرتی جن میں سیاسی اور مذہبی متنازعہ معاملات پر بحث مباحثہ ہو، یا جو کسی خاص فرقہ کے متعلق ہوں، یا ان میں سے ایسے مضامین ہوں کہ جن سے کسی طرح قوموں میں باہمی نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یا جن میں موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی متنازعہ معاملات پر بحث کی گئی ہو، یا جو درسی کتاب میں ہوں، یا جن کا کسی پیشہ سے تعلق ہو۔ ترجیح ایسی کتب کو دی جاتی ہے جو عام الناس کے واسطے مفید ہوں اور جو عام فہم سائنس تاریخ، سوانح عمری یعنی سیرت اور سیاحت سے تعلق رکھتی ہوں۔ یا جن کا مدعا یہ ہو کہ مدرسوں کے بچوں کے لئے آسان مفید اور دلچسپ علم ادب مہیا کیا جائے، یا جو کہ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہوں +
ہر سال باوجودی میں بکسٹ بک کمیٹی کتب موصولہ پر غور کیا کرتی ہے۔ اس سال کی کتابیں برائے انتخاب ۲۔ جنوری ۱۹۳۰ء تک دفتر میں آنی چاہئیں۔ گویا یہ آخری دن ہے +

موجودہ قواعد کی رو سے بہترین کتاب کے لئے انعام ہزار روپے تک ہو سکتا ہے اور کوئی انعام پانچ سو سے کم نہ ہوگا۔

تفصیل انعامات سال ۱۹۲۹ء حسب ذیل ہے:-

نمبر شمار	جس کو انعام دیا گیا	نام کتاب	رقم انعام
۱	حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور	پنجاب میں اردو	ایک ہزار
۲	ڈاکٹر سولکھن سنگھ ایم بی بی ایس میڈیکل آفیسر خالصہ کالج امت سر	شرعی رک رکھیا	سات سو پچاس
۳	لالہ سنت رام بی اے لاہور	الہیونی کا ہایت حصہ سوم	پانچ سو
۴	ڈاکٹر سکھ رام میدی رانا ایم بی بی ایس لاہور	جرمی بوٹی حصہ اول دوم	پانچ سو

گوٹے اٹلی میں

گوٹے اپنی جوانی میں ایک رنڈ لالہ ابالی تھا، لیکن ۱۸۸۱ء کے موسم بہار میں جب وہ سوئٹزرلینڈ میں سردیاں گنار کر واپس آیا تو اُس کے دل میں پھر ادنیٰ جوش پیدا ہوا۔ اُس نے سپینوزا کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی زندگی میں متانت اور مستعدی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اُس نے ولیم میٹر اور میسودو تصانیف کی طرح ڈالی اور سیزر، محمد، آوارہ یہودی اور پرومی تھیوس پر مصنفین کے خاکے تیار کئے۔

چھ اور سالوں تک وہ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں راجس کے چاروں طرف باغ تھا اور جوڈوک کارل آگسٹ نے اُسے دے رکھا تھا۔ لیکن اُس کی طبیعت یہاں بھی بے کیف ہی رہتی تھی۔ اُسے ایک تازہ فضا کی ضرورت تھی جس میں اُس کے خیالات ابھریں۔

سولہ ۱۸۸۲ء میں کسی کو اطلاع دیے بغیر گوٹے چپکے سے اٹلی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ عمر بھر اُسے اٹلی جانے کی تمنا ہی تھی۔ جب انگور کی بیلے، زیتون کے جھنڈ، پرانے شہر اور اس سے بھی پرانے کھنڈر اُس کی نظروں سے گزرتے تھے تو اُسے یہ سب گھر سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اپنی شدید کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی تصنیف انی گینیا میں مکمل کی جو جرمن زبان میں ایک یونانی المیہ نامک ہے۔ روما سے وہ سلی میں پہنچا جس میں اُس نے یونان سے زیادہ یونانیت پائی۔

اٹلی میں گوٹے نے اپنے عمر بھر کے ذوق تصویر کشی و نقاشی کو خیر باد کہی اور بہترین شاعری میں محو ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سمجھ لیا کہ فطرت نے اُسے شاعری کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ پھر ویر میں آیا تاکہ اپنے عزائم کو بارور ہوتا دیکھے۔ اُس نے ڈیوک سے کہہ کر دفتری تفکرات سے آزادی حاصل کر لی اور ادب کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا۔

منصور احمد

توتال اتری مدر



غالب اور ہائے

کامریڈ کے ایک پرانے پرچے میں ہندوستان کے مشہور شرقی پروفیسر صلاح الدین خدا بخش نے جرمنی کے جلیل القدر شاعر ہائے کا موازنہ غالب سے کیا تھا۔ مضمون کو پرانا ہے مگر پرانی شہرت کی خاصیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے پیش کرنے میں کسی خاص محذرت کی ضرورت نہیں۔

(مترجم)

حال میں ہائے کے سوانح زندگی شائع ہوئے ہیں جن سے اُس کے تمام خصائل و خصوصیات، اُس کے انوکھا روآلام اس کے عشق و محبت کی داستان اور آخر میں اس کی تکالیف اور علالت کے واقعات سن و عن معلوم ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہائے خود ہائے سامنے موجود ہے اور اپنے مخصوص بذلہ نواز لہجے میں اپنے اسرا دلی کہہ رہا ہے۔ جب اُس کے دل پر سے واقعاتِ عالم کا پردہ اٹھتا ہے تو ہمیں اس آئینہ میں اُس کی صورتِ منظر نظر آتی ہے۔ گویا اُس کا دل نگین ہے، بے قرار ہے، اور کسی کی جستجو میں خون بہا رہا ہے۔

ہائے پر اٹھارہویں صدی کے خیالات کا بہت گہرا اثر تھا اور یہ اثر مرتے دم تک ایک صورت پر قائم رہا۔ ہائے جرمنی کے شہر ڈسلفارف میں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ کے لحاظ سے گو وہ اٹھارہویں صدی کے اختتام پر پیدا ہوا، لیکن اس صدی کا نقش اُس کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت تھا۔ اس کی ماں فرانس کے مشہور فلسفی اور سیاسی روسو کی شاگرد تھی اور روسو کی مشہور تصنیف "امیل" سے جو تعلیم پر ایک معرکہ آرا کتاب ہے، پورے طور پر واقف تھی۔ ہائے کو اس طبع اٹھارہویں صدی کے خیالات وراثت ملے تھے۔ اٹھارہویں صدی سیاسی مباحث اور تحقیق مذہب کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس زمانہ میں عقل ہی ہر چیز کا معیار سمجھی جاتی تھی فلسفہ، علم، سیاست، سائنس غرض ہر شعبہ زندگی میں اس اپنی ان تھک کوششوں کا ثبوت دے رہا تھا۔ گزشتہ واقعات اور روایات پر سختی سے شکستہ چینی ہوتی تھی۔ مذہب کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لینے کے خلاف ایک ہنگامہ گرم تھا۔ خون اور نسل کا تلفوق مٹتا جا رہا تھا۔ خدا کی ولایت کردہ حکومت کے اصول کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اور سوسائٹی کو ایک نئے مرکز پر لانے کی کوششیں جاری تھیں اور ساتھ ہی ساتھ سیاست بھی اپنا رنگ بدل رہی تھی۔ اس صورتِ حالات میں جب کہ یورپ ایک انقلاب

کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اور اس پر سے داعی اور سیاسی انقلابات کی موجیں گزر رہی تھیں۔ اُس نے دنیا میں قدم رکھا۔ جو کچھ روس نے سیاست کی دنیا میں کیا بالکل وہی اُس نے عقل کی دنیا میں کیا۔ ایک طرف روسو انسان کے حقوق غلامی کے خلاف برابر آواز بلند کرتا رہا۔ اور ہمیشہ انسان کو سیاسی غلامی سے نجات دلانے کی فکر میں سرگرداں رہا۔ دوسری طرف اُس نے اپنی تلوار سنبھالی اور اُن تمام گتھیوں کو کاٹ دیا جو عقل میں لپٹی ہوئی تھیں۔

اُس نے کو اول عمر ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ اُس نے سو لوہی ہی برس میں اپنے قلم کو جنبش دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد جب اس نے ریاضی طوفان آیا تو آخر تک یہی کیفیت باقی رہی۔ اُس کا قلم اُس کے خیالات کی ترجمانی میں کبھی سست نہیں ہوا۔ اُس کی ماں کو بڑا شوق تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو ایک کامیاب سا ہو کار بناتا ہوا دیکھے اور وہ بچے سے کھیلے لیکن اُس کو کیا خبر تھی کہ اُس کا بیٹا ایک ایسا پیشہ اختیار کرے گا جس کا اُس کو سان گمان تک نہیں۔ ماں کے اصرار پر بہر حال اُس نے ایک سا ہو کار کی دوکان پر نوکری کر لی اور وہاں آنے جانے لگا مگر اس لمبے دین میں اُس کی طبیعت نہ گنتی تھی تین ہفتہ تک مشکل اُس نے اپنے دل پر صبر کی سیل رکھ کر اس مصیبت کو برداشت کیا اور اس کے بعد اپنی ہل کو کسی طرح راضی کر کے وہاں سے علیحدہ ہو گیا۔ وہ اب جانے لگا کہ تجارت سے اُس کا مذاق کو سوں دور ہے اور اپنی تمام کمزوریوں بلور قوتوں پر اس غرض سے غور کرنے لگا کہ اب اُس کو کیا کرنا چاہئے۔ اُس نے سوچا کہ مجھ کو اگر کہیں خردی غضیب ہو سکتی ہے تو وہ ادب کی دنیا ہے اور واقعی اس دنیا میں اُس نے جن نام پیدا کیا وہ نہ صرف اُس کے لئے بلکہ اُس کے تمام ملک کے لئے تاریخ کے صفحات میں ایک زریں کار نامہ ہے گا۔ سا ہو کار چھوڑ کر اُس نے قانون کی طرف رجوع کیا لیکن یہ بھی اُس کے مذاق کے مطابق نہ نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بے شک ایک ایڈووکیٹ بن گیا مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس پٹے سے اُس کو اپنی روزی پیدا کرنے میں کسی قسم کی سہولت نہ ہوئی۔

بڑے بڑے اصحابِ نظر کی طرح اس کو وقت کی سوسائٹی سے باطل لگتا تھا۔ ۱۶ سال کی عمر میں جب ایک جلاؤ کی لڑکی سے اُس کو عشق ہو گیا تو وہ کتنا ہے کہ میں اس سے اپنے جذبات کی بنا پر عشق نہیں کرتا بلکہ مجھ کو سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں مزا آتا ہے۔

یہاں ہم پر اس کے مزاج کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اپنی تمام زندگی اُس نے ایک کربستہ سپاہی کی طرح کاٹ دی ہمیشہ وہ آزادی کے لئے لڑتا رہا۔ کون سی آزادی؟ وہ آزادی جو انسان کو گذشتہ روایات کی جماعتی اور عقلی غلامی سے آزاد کرانے۔

اپنے متعلق وہ کتنا ہے کہ میں حسین عورت اور انقلابِ فرانس کا ہمیشہ شیدائی رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا کون سا خاصہ

دل ایسا ہے خواہ وہ لشکرِ شکن سپہ سالار ہو یا ملکوں کو تہ و بالا کرنے والا تپاس گوشہ میں بیٹھ کر فلسفہ کے ادق سائل ہو خود فکر کرنے والا فلسفی ہو یا ادب کے لطائف اور نکات پر سرور ہونے والا شاعر جو ایک حسین عورتِ کلثمیہ کی نہ ہو قیصر کو بھیجے۔ خود جرمنی کے مشہور شاعر گوٹے کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ خالد اور ابوسینا کو دیکھئے۔ کیا یہ لوگ محبت کی دیوی کے پرتار نہ تھے؟ لیکن بہت ممکن ہے کہ ہائے کا دل عورتوں پر اس زلزلے کی خفیاں دیکھ کر بچ گیا ہو اور اس طرح اس کے عشق میں ایک قسم کی شہریت پیدا ہو گئی ہو۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے آواز بلند کرنے سے اُس کی مراد کمزوروں کی حمایت تھی۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اُس کو دولت کی دیوی کے دربار میں ماضی کا کم موقع ملا لیکن جب ملا تو اس کا نتیجہ اس کی طویل علالت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے اس بیان میں کتنا درد ہے کہ میں نے اپنے زمانہ قیام یونیورسٹی میں جو اہراتِ نیرِ حلق اتلے ہیں اور موتیوں کو مضہم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میری گھڑی کو میرے دل کا راز مجھ سے زیادہ معلوم ہے اور وہ اس کو شہرِ بزم بھی کرتی ہے اس لئے کہ وہ کبھی کبھی کسی پوی کے تہ خانہ کی بے تکلف نیزگی کرتی ہے۔ ان الفاظ میں محض شاعری کی لطافت نہیں ہے بلکہ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن کو ہائے نے عموس کیا مگر معمولی طور پر ظاہر کیا۔ اس کی تمام زندگی غربت اور علالت کی وجہ سے بے کیف رہی اور ایک دفعہ اُس نے کس حسرت بھرے انداز میں کہا ہے ”کاش میں دنیا سے اٹھ جاتا۔ لے سوزِ جا بگزا تیرا نام ہائے ہے!“

اُس کی تمام تحریروں میں، کیا نظم، کیا نثر، اس کے ذاتی سوزِ نگہ از کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ اس کی شغف اور مناجاہ تحریروں میں بھی یہ رنگ صاف جھلکتا ہے اور اکثر اذفاتِ یہ رنگ اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ گویا ہم فریادِ جرس بن رہے ہیں ہائے کی افتادِ طبیعت روسو سے بالکل مختلف تھی۔ روسو کی سرشت میں تعمیر تھی اور ہائے تخریب پسند تھا۔ اس کے اندازِ تخریب میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ ہائے کو کسی نئی چیز کے تیار کرنے میں لطف آتا تھا۔ اُس کا مقصد محض اس قدر تھا کہ وہ عقل کو تمام فرسودہ روایات سے پاک کرے۔ نپولین کے اور اُس کے خصوصیات میں بڑی حد تک یک رنگی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ نپولین کا شہید بنی تھا۔ نپولین بھی اس کی طرح توڑ پھوڑ میں مشاق تھا۔ انقلابِ فلپائن کا وہ بڑا ملاح تھا۔ اس لئے کہ اُس نے اُن تمام روایات کو خاک کے ذروں کی طرح اڑا دیا جو اخوتِ آزادی اور مساوات کے راستے میں حائل تھے۔ مذہب پر اس کے تمام حلوں کا ذکر بھی اسی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ مذہب ہمیشہ قدسِ مقدس ہے۔ طبع کا بڑا قلندر رہا ہے اور اُس نے خیالات کی ترقی میں کافی روکاؤٹیں ڈالی ہیں۔ ہائے نے اس لئے مذہبِ سچرست حلے کئے کہ یہ نئے خیالات کی ترویج کو روکنا اور قدیم کو محکم کرتا ہے۔ وہ مذہب کا تار و پود بکھیرتا ہے اور اپنی نظمیں میں

اس پر آواز سے کہتا ہے معجزات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ خدا کو اپنے افعال کی تنقید اب منظور نہیں اسی لئے معجزات بند ہو گئے ہیں۔ اُس کے زمانہ میں جرمنی کے اندر مذہب کے خلاف ایک تحریک شروع ہوئی۔ اُسے اس میں شریک ہوا اور اس نے مذہب پر خوب خوب حملے کئے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ پر چند معلقوں میں اعتراض ہوا ہے کہ میں نے جرمنی کے رخ سے کیوں نقاب الٹ دیا اور کیوں میں نے جرمن قوم پر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ جس بہشت کی پستش کر رہے ہیں وہ سراسر دیوتاؤں سے خالی ہے۔ ہاں وہاں البتہ ایک خضر صورت ہستی ضرور نظر آتی ہے جس کے دل میں ریخ و غم کا دوفر ہے اور اُس کے ہاتھ کسی بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اور اس صورت کا نام ضرورتاً اقبیل ہے۔ میں نے تو صرف ایک تنبیہ کی ہے کہ ہر شخص کو خود اس طرف قدم بڑھانا چاہئے اور اپنی بساط کے مطابق علم حاصل کرنا چاہئے۔ اور جو انوکھی باتیں میں آج کر رہا ہوں وہ دریائے رائن کے اُس کنارے پر (فرانس) مدتوں سے کہنی جا رہی ہیں۔ ہم میں وحدانیت کے لیے پرستار بھی ہیں جو والٹیر کو زندہ جلادیں اس لئے کہ وہ پوشیدہ طور پر موحّد ہے۔“

اُس کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس کی تحریر میں کتنی تلخی ہے اور اُس نے اپنے مطمح نظر کو ثابت کرنے کے لئے کتنا وحشیانہ پہلو اختیار کیا ہے۔ اُس کو صرف مذہب ہی سے نہیں بلکہ سارے جماعتی نظام سے نفرت ہے۔ بادشاہ کے لے کر غلام تک، رئیس سے لے کر مالگذا تک اور فلسفی سے لے کر بیوقوف تک سب اس کے تیر لامت کا نشانہ بنتے ہیں۔ دنیا اس کے نزدیک گویا اپنے محور سے ہٹ گئی ہے۔ اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے اور ان حقائق کو وہ برابر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لیکن کیا وہ دنیا کی تمام خرابیوں کو لا علاج سمجھتا تھا کہ اس کی تباہی کا خیال ہر وقت اس کو رہتا تھا۔ نہیں اُسے ہرگز یہ خیال نہ تھا۔ وہ ان خرابیوں کی اصلاح مستقبل کے پردہ پر اپنی دور بین آنکھوں سے دیکھتا تھا، اور اس معاملہ میں اس کی وسعت نظر اس کے پیش رووں اور پس رووں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ وہ تمام انسانوں کی ایک مجلسِ قیام کا موجد تھا۔ وہ دنیا میں ایسا دستور چاہتا تھا جس سے ہر شخص کا دوسرے سے لگاؤ پیدا ہو۔ ذیل میں اس کی ایک عبارت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس سے انسانوں کے متعلق اس کی محبت صاف طور پر آشکارا ہوتی ہے: ”کتنی بہاریں آئیں اور چلی گئیں لیکن اُن کا جو بکھی نہیں نکھرا۔ میں بہار کی ترنم ریز بلبل کے شیریں مگر دروغ نالوں پر ہرگز یقین نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا فروغ بے ثبات ہے اور جب میں کھلی کے ننھے دل کو پھول میں بدلے خون ہوتے اور آخر میں ہوا کے کسی شوخ جھونکے کی تاب نہ لا کر مرجھاتے اور پیوندِ خاک ہوتے

دیکھتا ہوں تو میرے سامنے بے ثباتی کی ایک مجسم تصویر ہوتی ہے۔ مجھ کو ہر جگہ موسمِ سرا کا ظلو نظر آتا ہے جو دلوں کی گرمی شباب کی شوخی اور موجوں کی روانی کو سرور دیتا ہے۔ اس کے باوجود بھی میرے سینہ میں ایک چنگاری موجود ہے جس میں تمام عالم پر چھا جانے اور اس کو محض کر لینے کی ایک آرزو پوشیدہ ہے۔ ستاروں کی رفاقت اس کو ناپسند ہے اس لئے کہ اُن میں سراسر سردی ہے۔ کمکشائ کی سفیدی اُس کو منظور نظر نہیں اس لئے کہ وہ بے میل ہے غرض آسمان اور زمین میں اس کے بننے کے لئے اگر کوئی ممکن جگہ ہے تو وہ صرف میرا دل ہے۔ یہی محبت ہے جس کا ظور اکثر دیوتاؤں کی صورت میں ہوا ہے۔

زندگی میں ہم کو تیسری اور تخریبی دونوں قوتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ دونوں کے حلقہ عمل جدا گانہ ہیں اور ضروری ہیں۔ ہر قوم کی تاریخ میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب تخریب کی ضرورت اشد ہوتی ہے اور اس وقت ہم تخریبی قوتوں کے علیحدہ کو برسرِ کار لاکر تمام خرابیوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں تاکہ ہم سچائی کو اس کی پوری شان و شوکت کے ساتھ منصفہ شہود پر جلوہ فرمائی کا موقع دیں۔ اور اس ذیل میں ماننے لے بنی نوع انسان کی جو خدمت کی ہے وہ تابدار زندہ رہے گی۔ بے ایمانی، ریاکاری، مکاری کا اس کے ہاں مطلق گزرنے نہیں۔ اس کے علم پر انصاف اور سچائی کے الفاظ کندہ تھے۔ اور اُس نے اس علم کو تازہ نگینی کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کے حوادثِ زمانہ کا ثابت قدمی اور دلیری سے بلا خوف نتائجِ منجانبہ کرنا رہا۔ اگر وہ عیش و آرام کی زندگی میں پڑ جاتا تو اتنا بڑا کام کبھی نہ انجام دے سکتا۔ اس کے باپ نے اس کو ایک دفعہ نصیحت کی تھی کہ بیٹا۔ تمہاری ماں چاہتی ہے کہ تم ریکٹر خلیمر سے جا کر فلسفہ پڑھو۔ یہ اس کا معاملہ ہے۔ مگر میں فلسفہ پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ صرف خیالی اور وہی چیز ہے۔ میں بیوپاری آدمی ہوں۔ مجھ کو اپنے بیوپار میں اس سے کیا مدد ملے گی۔ لیکن اگر تمہارا جی چاہے تو میں اس سے روکتا نہیں مگر عوام کے سامنے تم اپنے افکار کا ذکر نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ اس سے میرے بیوپار کو نقصان پہنچے گا خاص کر اُس وقت جب لوگ سنیں گے کہ میرا لڑکا خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ یہودی تو مجھ سے لین دین مطلق بند کر دیں گے اور تم جانتے ہو کہ یہودی کتنی جلدی قیمت ادا کر دیتے ہیں اور اپنے مذہب پر کتنی سختی سے پابند ہیں۔ لیکن باپ کی نصیحت ہونا ربیٹے کے لئے بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ ماننے نے اپنا عندیہ اپنے باپ سے صاف اور واضح طور پر کہہ دیا۔ اس کو بہت سال لالچ بھی دیا گیا مگر ماننے کا پختہ دل اپنے راستے سے ہٹکا برابر بھی ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آزادی کا یہ علمبردار ہے۔

نثر کا پیغمبر بھی تھا۔ جرمن زبان شاید ہی کسی دوسرے شخص کا نام بنا سکتی ہے جو اس قدر صاف

پُرندار اور پُر معنی تحریر پر قادر ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہائے اپنے فن میں لاثانی ہے۔ کون سادل ہے جو اُس کی غزلیں پڑھ کر بے قرار نہ ہو جائے اور کون سا ہاتھ ہے جو کہ ہرز کا سفر نامہ پا کر مصنف سے مصافحہ کا شائق نہ ہو جائے۔ ہاں، کون ہے جو اس کے انگریزی حالات کو پڑھ کر اپنے دل کو قابو میں رکھ سکے۔ لیکن اس کی زندگی قریب قریب رنج و غم کی ایک داستان ہے جس میں مسرت اور خوشی کے صغفات کم نظر آتے ہیں۔ ۱۶۔ فروری ۱۹۵۶ء کی وہ شام پُر حسرت تھی جب کہ اُس کا آفتاب حیات ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اُس کے حسب ذیل الفاظ سے اُس کے دردِ دل کا حال کسی حد تک معلوم ہوتا ہے۔

”دیکھو میرے تابوت کی لکڑیاں مضبوط اور عمدہ ہوں۔ خیال رکھنا کہ وہ دریائے رات کے پل سے لمبی ہوں۔ میری نعش کو کا ندھائی کے لئے کم سے کم بارہ قوی میکل جوائن کو بلانا تاکہ وہ میری بھاری نعش کو اٹھا کر قبر کے گڑھے میں ڈال دیں۔ مگر سو میری نعش کے لئے سمندر کی گہرائی زیادہ موزون ہے۔ میری نعش آخر کیوں اتنی بھاری ہوگی اس لئے کہ میرے دل میں دو عالم کے خزان پوشیدہ ہیں۔ سمندر کی گہرائی میرے لئے مناسب ہے اور میں وہیں رہ سکوں گا کیونکہ ایک طرف مجھ میں دنیا کی ساری کلفتیں ہنگامہ آرائی کرتی ہوگی اور دوسری طرف محبت اپنی پوری تیزی کے ساتھ جوش مار رہی ہوگی“

تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں نے غالب اور ہائے کا موازنہ کیا تھا جو محض سطحی تصور کی بنا پر نہ تھا بلکہ خاصی فکر اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا۔ ہائے کے سوانح شائع ہونے سے یہ رنگ ذرا صاف ہو جاتا ہے، اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور ہائے کے سینوں میں ایک ہی دل تڑپتا تھا۔ رقعات غالب پڑھئے اور ساتھ ہی ساتھ ہائے کے خطوط کا بھی مطالعہ کیجئے پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کتنی دماغی قربت تھی۔ دونوں میں آواز کا نام تک نہیں اور نہ کسی جوش کو دبانے یا ظاہر کرنے کی کوئی خاص کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کلام گویا ایک پردہ ہے جس کو اٹھا کر وہ اپنے دل کی کیفیت عالم پر آشکارا کرتے ہیں۔ خلوت میں وہ بالکل اطمینان اور صفائی قلب سے باتیں کرتے ہیں۔ ان کی صحبتوں میں ہر حسین اور پُر رونق چیز کا ذکر ہوتا ہے۔ دونوں میں حقیقت کے دریافت کرنے کی تڑپ موجود ہے۔ دونوں کو آپ کسی خیالی معشوق کے لئے سرگردان اور پریشان پائیں گے۔ اُن کے کلام سے روح کو تازگی اور فرحت ملتی ہے، دماغ کو روشنی اور تاریکی کا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور عالی حوصلگی و رفعت خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ دونوں اپنے فن کے کامل استاد ہیں اور کون ہے جو اُن کے اثرات سے زندگی کے پوشیدہ راز کو معلوم کرنے کا خواہاں نہیں ہے؟ دونوں دنیا کی محالیف پر آنسو بہاتے ہیں۔ اُن کا دل انسانیت کے غم میں

بے قرار ہے لیکن انسان کی آخری تباہی پر کون ہے جس کو یقین نہیں ہے؟ دونوں طول ہیں مگر ان کے اس انداز میں بھی ایک شانہ نمکنت ہے۔

اردو ادب میں غالب کا وہی درجہ ہے جو جرمن ادب میں ہائے کا ہے۔ اردو نثر کی شگفتہ سیانی کی ابتدا کا سہرا بجا طور پر غالب کے سر ہے۔ غالب نے اس میں سلاست، ترنم، روانی اور حسن پیدا کیا اور اس کی ترقی کے لئے لامتناہی راستہ کھول دیا۔ لیکن غالب اور ہائے کا موازنہ ہمیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ دونوں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ موجودہ طرز زندگی اور خیالات کی رو سے پریشان ہو کر دونوں نے اپنی دنیا الگ آباد کی۔ دونوں کے حسرت و ارمان اور رنج و مسرت کے بیان سے راز دلی صاف ظاہر ہوتا ہے اور یہی ان کے فن کا سب سے بڑا جادو ہے جو دلوں کو مسح کر لیتا ہے۔ دونوں نے دل کی زبان میں نغمہ سنجی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تا ابد تازہ اور شاداب رہے گا۔

دونوں اس طرح حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کرتے ہیں اور اس طرح انسانی دل کے راز کو انکشاف کرتے ہیں کہ ہم فوراً ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ہمیں اپنے طرز بیان سے اس طرح حیرانی میں مبتلا کرتے ہیں کہ گویا اس راز کا افشا ہمارے زندگی کا عین مقصد تھا۔ دونوں کے دل میں انسانی مہر و دی اور محبت کا سمندر جوش مارتا ہے۔ دونوں کمال نو میدی و حیرت کے عالم میں انسانی گوشت پوست کو امید کے روح افزا پیاموں سے مسرور کرتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دونوں شعل کا کام دیتے ہیں۔ دونوں ایک خیالی حقیقت کے پیچھے بڑی سرگرمی اور جوش سے دوڑتے ہیں اور ہر راہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ لیکن دونوں کی سچی پیہم عالم کی لامتناہی وسعت میں جا کر گم ہو جاتی ہے۔ دونوں زخم دل کا علاج کرتے ہیں اور انتہائی حرام کے وقت دستگیری کرتے ہیں۔ دونوں انسانیت کو ایک خوش آئند زندگی کا مسرت آمیز پیغام دیتے ہیں۔ کمال اور اطمینان قلب دونوں کا اصل الاصول ہے۔ اور اس لئے ان کے راستے میں جتنی دقتیں حائل ہوتی ہیں ان کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مذہب پر غالب کا حملہ ویسا ہی سخت اور تیز ہے جیسا ہائے کا سخت اور تمسخر آمیز ہے۔ دونوں کو ایسے مذہب سے بالکل انس نہیں جو صرف نام کی خاطر زبان سے ادا کیا جائے۔ دونوں کبھی اپنی محنتوں کے ثمر حاصل کرنے کے شائق نہ تھے۔ دونوں ہمیشہ قسمت کے ہاتھوں نالاں رہے اور برابر زور و قلم اسی کی شکایت پر صرف کرتے رہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ مہارے قلم ہوئے

اگر ہائے نے انسانی ادب کی جنگ میں اپنی سپہ گری کا کمال دکھایا تو غالب بھی اس سے پیچھے نہیں رہا۔ غالب ہمیشہ رنگ و بو کے پردے میں حقیقت کو تلاش کرتا تھا اُس کا دل ہمیشہ محبت کے ولولوں سے سرشار رہا۔ قدیم روایات کا وہ سرے سے مخالف تھا اور ان کے خلاف اسی جوش اور سرگرمی سے آواز بلند کرتا رہا جس جوش اور سرگرمی سے جرمنی میں ہائے نے کی۔ دونوں کے کلام میں محبت کی چاشنی انساں کی نیکیوں اور کمزوریوں کا بیان بدرجہ اتم موجود ہے۔ لہذا دونوں کے کلام صفحہ بہستی پر روشن حروف میں جگمگا رہے ہیں اور اس عالم میں ہمیشہ تاریکی کو دور کرنے میں مدد دیتے رہیں گے۔

”قرا خاں“

نوائے راز

کوئی ادا فروش ہے کوئی جفا فروش بازارِ حسن میں ہوں میں تنہا دافا فروش
ہے کوئی اہل ہوش میں جاں باز تشنہ کام تیغِ فناے عشق ہے آپ بقا فروش
اہلِ جہاں سے اپنی نیچے بھی تو کس طرح وہ ہیں خدا فروش تو میں ماسوا فروش
اب مکرانِ حق سے شکایت نہیں مجھے جو بُت شکن تھے آج وہ خود ہیں خدا فروش

بزمِ سخن میں اور بھی تو خوش کلام ہیں

لے لے راز ایک تو ہی نہیں ہے نوا فروش

راز چاند پوری

نشاطِ روح

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں
 محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں
 اے تو بہارِ رنگِ رنگ و اے تو ورائے آبِ رنگ
 عشق کسی نگاہ میں، حُسن کسی نگاہ میں
 حُسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
 ملحد بے خبر بھی گم جلوہ لا الہ میں
 اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں
 تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں
 لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستان نہیں
 شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں
 رازِ فتادگی نہ پوچھ لذتِ خستگی نہ پوچھ
 ورنہ ہزار جبرئیل چھپ گئے گردِ راہ میں
 در پہ ترے جو آگیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا
 گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

حُسنِ خاموش

مغربی تہذیب نے ہماری طرزِ معاشرت، ہمارے اخلاق اور زبان وغیرہ پر تو اثر ڈالا ہی تھا، مگر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صنعت و حرفت اور دستکاری پر بھی اس قدر جلد اثر پڑے گا جیسا کہ سوسائٹی اور اخلاق پر کیونکہ اہل مشرق کے غیر میں مذہبیت اور ہندوستان والوں میں عبودیت کا عنصر بہت ہے۔ کتنی ہی رند مشرئی کیوں نہ پھیلے خدا کی یاد شکل سے جاتی ہے۔ سائنس ہم کو کتنا ہی پابند دہریت کیوں نہ کرے پھر بھی روحانی جذبات خود بخود دل پسند چیز میں، خواہ اس کا وجود دستِ قدرت سے ہو خواہ صنعتِ انسانی سے، جس کمال کے ساتھ ساتھ جمال کو بھی دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اگر کوئی مغرب شے پسند کی اس کو سوٹی پر پوری نہ اُترے تو اس کا توازن معیارِ اخلاق سے بھی درست نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تو فطرتِ اہل عقل پر روحانی ذوق حاوی ہو کر یکملواتا ہے کہ اسے نکل تبو خور سندم تو بوسے کے داری لیکن آخر کار مغربی تہذیب نے ہماری اس پاک پسند کو بالِ بستی کر دیا اور مادیات ہی نہیں بلکہ نفسیات کے اُن نظام کا خورِ بنا دیا جن کو کسی زمانے میں ہم خواب میں بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ حال کی صنعت سے وہ رذالت تو درکنار وہ سادگی بھی مٹتی معلوم ہوتی ہے۔

سب سیکھ لیا غم سے افسونِ شرارت * باقی وہ کہاں سادگی یا رکاب رنگ

زیادہ عرصہ نہیں ہوا اہل مشرق کا یہ خیال ہو گیا تھا کہ قدیم ہندوستان میں مصوری و نقاشی کا وجود تھا ہی نہیں، اور اگر قرونِ وسطیٰ میں کچھ مثالیں ملتی ہیں تو وہ چین یا ایران سے مستعار کی ہوئی ہیں۔ مگر چند جفاکش تلاش کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ ہندوستانی صنعتِ مصوری اور بتِ تراشی کی صنف میں یورپ سے کہیں زیادہ دلچسپ و قدیم ہے۔ قدامت کے اعتبار سے اگر یونان کی صناعی کو ہم نظر انداز کریں تو یورپ میں کہیں کوئی ایسی مثال نہ ملے گی جو ہندوستان پر اپنی بزرگی کا سکہ جاسکے، یونان بھی ایک حد تک مصر و ایران کا خوشہ چین رہا ہے، اگر ہندوستان میں آئے دن انقلابات نہ ہوتے تو آج ہمارا ملک مصوری و نقاشی کا پورا پورا عجائب خانہ ہوتا۔ پھر بھی بہت کچھ ہے کیونکہ جس قوم نے ہند کو اپنا ملک اور گھر بنایا کچھ نہ کچھ اپنی نشانی از قسمِ مصوری و دستکاری چھوڑ دی تاکہ جس خاموش سے قومی تہذیب کی یادگار قائم ہے اور دیکھنے والی آنکھیں آثارِ الصنادید سے کمالِ رفنگاں کا اندازہ کر لیں۔

نہیں منت کش تابِ شنیدنِ استاں میری خوشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

قوموں کے انقلاب نے ہندوستان میں اس فن کی صد ہا قسمیں چھوڑی ہیں۔ نمایاں طور پر ہم بدھ - ہندو مسلم اور موجودہ زمانے میں مغربی اثرات کی مثالوں کو زیادہ پاتے ہیں جو حسب مراتب اپنی اپنی خصوصیتوں میں کامل دیکھی گئیں ہیں۔

ابتدائی زمانے یعنی تخلیق تہذیب کے وقت جب انسان پیٹ کے دھندوں سے کسی قدر فراغت کا ذوق بھی پانچکا ہوگا جب زمین و آسمان پر ظاہری ہی نہیں بلکہ باطنی نظروں بھی پڑتی ہوگی، جب وہ فطرت عالم "شوقی تحریر" کے ہر پیکر تصویر پر متعجبانہ نظر ڈالتا ہوگا، المختصر جب ان مظاہر کو دیکھ کر اسے اظہار خیالات کے ذریعے کی جستجو ہوئی ہوگی اس وقت خواہ مخواہ طبیعت بھلی بُری شکلوں کو دیکھ کر ایسی ہی نقل کرنے پر مائل ہوئی ہوگی، چنانچہ واقعہ ایسا ہی ہوا جس کی شہادت علیٰ مصرعے خطوط نقشی سے عیاں ہے۔ یہی خطوط یا شکلیں آج کل رسم خط کی ابتدا سمجھی جاتی ہیں اور ان کا اثر چینی رسم الخط میں اب بھی نمایاں ہے۔ مصری "خطوط نقشی" کو مجموعہ حروف یعنی الفاظ ہیں تاہم چونکہ وہ حروف اظہار اشکال پر مبنی ہیں اس لئے ایک قسم کی تصویر بھی کہے جاسکتے ہیں لفظ "آدمی" بجائے اتحاد الف - دال یم اور بی کے اس وقت محض سر و سینہ اور ہاتھ پاؤں رکھنے والی شکل سے ظاہر کیا جاتا تھا اور کھڑی بیٹھی اور لیٹی تصویریں حرکات انسانی کے لئے اظہار کا ذریعہ بھی جاتی تھیں اور یہ شکلیں اس زمانے کی طرز تحریر تھیں۔ اس کی مطابقت آج کل کی مصوری سے اس طرح سمجھنا چاہئے کہ موجودہ مصوری خیالات و جذبات کو بھی ظاہر کر دیتی ہے مگر اس وقت صرف ایک خاکہ ہی کافی تھا۔ رفتہ رفتہ ان شکلوں سے اہل کی نقل کا عنصر دور ہوتا گیا یہاں تک کہ ایران کے "خطوط غروٹی" ایجاد ہوئے اور رسم خط ایک علیحدہ فن ہو گیا۔ شاید پہلے ایک ہی رسم خط کا وجود ہو مگر اب تو کثرت تحریر تہذیب پر نمایاں اثر ڈال رہی ہے اور چونکہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب میں نفاق بہت کچھ شامل ہے اس لئے رسم خط بھی اردو ہندی کی لٹو ٹوٹیں میں پڑا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ خود یہ فن اس جھگڑے سے عاجز آ گیا ہے

کس کی ملت میں گنوں آپ کو تبت لائے شیخ تو کسے گبر مجھے گبر مسلمان مجھ کو

مصوری کے وجود کا بہانہ رسم الخط کے علاوہ کم کوشا نہائے پاستاں سے بھی مل سکتا ہے۔ ہندی پاستاں میں بیان کیا جاتا ہے کہ برہمن کے مردہ لڑکے کو زندہ کرنا چاہا لیکن یم نے روح واپس دینا گوارا نہ کیا اس لئے برہمن نے ایک تصویر بنا کر اس میں جان ڈال دی۔ پس تصویر بننے کی ابتدا یوں ہوئی بلبل اسلام اور عیسائیت کے یہاں

۱۔ یم۔ فضائے آسمانی کا خدا۔ سرخ شام کا بادشاہ جہاں نیک لوگوں کی رو میں نصرت آسمانی کی ہے مگر کرتی میں (آریہ لوگوں کا عقیدہ)

آدم کا پتلا بنایا گیا تھا جس کی شہادت بائبل اور قرآن شریف میں اظہر من الشمس ہے پس حضرت انسان نے عیسیٰ الدیال اور برہما کی نقل کرنی شروع کی۔ اسی میں نے آدم کا پتلا بنا کر فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم کیا شیطان نے انکار کیا، نکالا گیا، شاید جل بھی کر اُس نے حضرت انسان کو یہ تدبیر سمجھائی کہ تم اسی میں آدم کا پتلا بنا کر سجدہ کرو۔ میں اس وقت شیطان کی مخالفت یا موافقت سے کچھ واسطہ نہیں مگر اور سنئے شاعر کو جب الہام ہوتا ہے تو الہام بالاکے راز بتا جاتا ہے مصور کو بھی کچھ ایسا ہی وسیلہ خواب کے ذریعے سے ممکن ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یوحنا دیوی نے ایک حسین نوجوان کو خواب میں دیکھا اور اپنی سہیلی چتر لیکھا سے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کو پھر دیکھوں۔ ”انچہ چتر لیکھا نے کنیا کے پوتے ازدھ کی تصویر بنائی اور اسی ریلے سے مصوری کی ابتدا ہوئی۔ یا مشہور ہے کہ مابھمان بادشاہ دہلی نے چوتھے آسمان پر دہلی کی جامع مسجد خواب میں دیکھی اور ایک فقیر کا دل کے ذریعہ سے سہارا نے یہ نقشہ بنایا جس کی تعمیر دارالصدر میں ہو گئی۔ شاید اگر نے کائنات محل بھی باغ فردوس کے کسی محل کا نمونہ ہے چنانچہ اجماع کی اکثر علامتوں کے دروازے پر لکھا ہے۔

ہمیں است وہمیں است ہمیں است

اگر فردوس بر روتے زمین است

یہ واقعہ ہے۔ بد کے مجسمے روحانی جذبات ظاہر کرتے ہیں، ہندوؤں کی تصویریں کرشن جی کی محبت آمیز اور بھولی ائیں دکھلاتی ہیں اور مغل لوگ آرائش دربار وغیرہ کا اظہار زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پس اگر مسلمان جنت الفردوس کے سنے پیش کریں تو کوئی تعجب نہیں رہے۔ روحانی جذبات وہ بھی مسلمانوں کی مصوری میں ظاہر کئے گئے ہیں بشرطیکہ روحانیت سے متعلق تصویریں دیکھی جائیں۔ یوں تو پستی نفس کے خوف سے اسلام میں مصوری ناجائز رکھی گئی ہے مگر پھر بھی بدرجہ کمال یہ چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم حضرت ابراہیم اوٹھم کی تصویر کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں جس میں روحانیت اور نیچریت کے تمام مظاہر حتی الامکان دکھائے گئے ہیں۔ ”حضرت موصوف مرقہ“، بابوں کے لئے کہ محو تبت الفت میں دریا کے کنارے ایک لکڑی کے سارے علی الصباح بیٹھے ہوئے ہیں آسمان ہمیں کہیں ابر کے ٹکڑے ہیں اور ایک کپڑا آپ کے سر پر سایہ لگن ہے جس میں پریاں دیا حوریں سمجھئے مگر ہر علامت گئے ہیں اس کا سہ، ہانسی اور شہنائی لئے ترانہ روحانی آسمانی سازوں کی آواز پر گارہی ہیں اور نور جنت میں ابر سے چھن چھن کر آپ کے فرق کی طرف مائل ہند میں ہے مگر مسلمانوں نے زیادہ تر فردوس ہی کو ظاہر کیا ہے باغ، عمارت، پیل بوٹوں پر مبنی ہے۔ یوں تو مغل بادشاہوں کے یہاں کمال مصوری کے نمونے روحانی ہمارے

۱۔ یہ تصویر امیر الدولہ پبلک لائبریری، قیصر باغ لکھنؤ میں موجود ہے۔

اور ہر قسم کے فطرتی جذبات ظاہر کرنے والے ہیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل مصوری ہندوستان میں چین سے آئی اور یہاں سے تقدیس کارنگ لے کر پھر مذہب کے مذہب سے چین اور تمام مشرق میں پھیل گئی۔ بعد ازاں بدھ مذہب کے زوال پر کرشن جی اور مرلی منوہر ایسے دیوتاؤں کے مجسمے بنائے جانے لگے اور رادھا کی سواری مہنس اور طاؤس وغیرہ پر ظاہر کی گئی اور یہ اس فن کی ترقی کا وہ دور ہے جب رامائن اور مہا بھارت کی داستانیں پیکر تصویر اختیار کرنے لگیں جیسے آج کل متوسطین شعرا کے خیالات ادبِ اردو کے رسالوں میں آرٹ بلاکس کے ذریعے سے پیکر تصویر اختیار کر رہے ہیں۔ اُس وقت یہی اثرات یونان میں بھی مقابلتہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہومر کے خیالات بتوں اور تصویروں میں عیاں کئے جاتے تھے۔ خدائے محبت کی رتھ فاخناؤں کا جوڑا اپنے کندھوں پر رکھ کر کھینچتا تھا اور معجزہ لہنت کا تیریاؤں کھٹے کہ تیر نظر صاف دل کے پار سو جایا کرتا تھا۔ مگر ٹھیک اسی وقت ہندوستان میں کنہیا جی نے اپنی بانسری سے وہ داستانِ محبت سنائی کہ رادھا تو رادھا جھگل کے جانور بھی محو الفت ہو گئے۔ اور جہاں تک اس بانسری کی آواز گئی اتنی فضا ایک بقیعہ نور بن گئی۔ ایسے ہی خیالات کی بتا پر قرون وسطیٰ کی تصویریں کھینچی گئیں اور آج کل بھی بعض ہندو ماہرین ان خیالات کو پیکر تصویر دیتے ہیں۔ شاعروں نے تو یہاں تک لکھنا شروع کیا کہ چند رماں دیوی اگرے کے تاج روضے پر آتی ہے اور رادھا کی روح دریا سے کھنکھانے لگے گول کے گنڈ پر دخی مہاتماؤں کی آنکھوں سے اشنان کرتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے چنانچہ انشا ایسے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں ادھا کے گنڈ پر اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے گھنڈ پر
شیدو کے گلے سے پار تہی جی لپٹ گئیں کیا ہی بہا آج ہے برمھا کے گنڈ پر
اے موسم خزاں گلے آئے کو تیرے آگ ببل اداس بھی ہے اک سوکھے دُند پر

چنانچہ ہندو مصوری میں دریاؤں کے گھاٹ، پہاڑوں کے دامنوں میں مادھوؤں کے ٹھکانے اور قد کی فضا میں مندروں کے مناظر وغیرہ بہت ہیں۔ اکثر کسی ویرانے میں مندر دکھایا گیا ہے جس کے پاس برگدوں کے درخت مادھوؤں کی طرح بڑی بڑی جٹائیں لٹکانے کھڑے ہیں، جڑ کے پاس مادھو جی کے چکنے چکنے مجسمے رکھے ہیں اور کنواری دیویاں تھال ہتھیلی پر رکھ کر آ رہی ہیں اور عقیدت کی مجسم تصویر بن کر کسی چھوٹے گنبد دار

مندرمیں پرشاد چڑھانے داخل ہو رہی ہیں۔ ہنود نے اپنے مذہبی احساس کے مطابق یہاں تک امتیاز ظاہر کیا ہے کہ شیوجی کے مندر اور مجسموں میں ایک مقدس خوف طاری رہتا ہے کیونکہ وہ خدائے فنا ہیں، وشنوجی کے یہاں رحم و مرحمت کے محبت آمیز اثرات نمایاں ہیں کیونکہ وہ خدائے حسن و عنایات ہیں، اور برہما کے یہاں بزرگی اور بڑے تعظیم محبت دلوں پر طاری ہو جاتی ہے کیونکہ وہ خدائے تخلیق ہیں۔

چاہے جس شکل سے مثال صفت اس میں نہ آئے عالم آئینہ کے مانند دریا رہے ایک پس یہی اثرات قرون وسطیٰ کی مصوری سے بھی ظاہر ہیں۔

ہندوستان میں مصوری کی ترقی کا ابتدائی زمانہ مہاتما بدھ کا عہد زریں ہے جب کہ بدھ مذہب کے فیض سے تمام ملک پر امن و مرحمت کی ہوا چل رہی تھی اور ہر شخص کشت و خون سے عاجز اگر زوال کی شکل میں محو تھا۔ اس زمانے میں بدھ کے مجسمے ایسے بنائے گئے جو اپنی ماہیت سے حصول نروان یا فنا فی المسرت ہونے کے طریقے بتلا رہے ہوں اور نیک کاموں کی نصیحت کر رہے ہوں۔ ان مجسموں کی شکل سے دنیا کی ناپائیداری اور عالم بالا کی رعب دار تقدیس ظاہر ہوتی ہے۔ یہ صفت بدھ مذہب کی ترقی کے ساتھ تمام ایشیا میں پھیل گئی اور جب بدھ کو اتارا اور اس کے بعد خدا مان لیا گیا تو اُس کے مجسموں کو بھی ویسا ہی رنگ روپ دیا گیا اور بدھ کے سامنے لوگ ہاتھ جوڑے دعائیں مانگتے اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہوئے دکھائے گئے۔ ماہرین فن نے بدھ کے مجسموں میں روحانی کشش دوڑانے کی کوششیں کیں جس کا اثر تبت میں اب تک ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک بُت تراش نے بدھ کی شکل بنا کر تبت کے کسی راجہ کو پیش کی جس کی پُر تاثیر کشش نے اُس کو بدھ مذہب کا پیرو بنا دیا۔

یہی بات ایران کے نامی مصور مانی سے بھی وجود میں آئی تھی جس نے اپنی تصویروں کو دست قدرت کی کاریگری ثابت کر کے پیغمبری کا دعوے کر لیا تھا۔

ہندوستان میں بھکشو نقاشوں کو بہت جلد زوال ہونا شروع ہوا کیونکہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندو مذہب میں بیداری شروع ہو گئی۔ بدھ کی صلح کل نصیحتیں شجاعانہ جذبات کو مردہ کئے دیتی تھیں، اس لئے راجپوت چترپو کے سورج بنسی اور چندر بنسی خون نے جوش مارا اور بدھ کی تصویروں اور مجسموں کی جگہ رامائن اور مہا بھارت کے برزیتہ اور معاشرتی نمونے تصویروں میں دکھائے جانے لگے۔

۱۵ بعض مورخ مانی، کو چین کا باشندہ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مغلوں کا زمانہ اور مغلوں میں خصوصاً اکبر و جہانگیر کا زمانہ مصوری کے لئے عہدِ زریں تھا۔ سلاطین تیموریہ خاص طور پر مصوری کے دلدادہ تھے۔ بڑے بڑے مشہور نقاش ان بادشاہوں کی سرکار میں ملازم تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سلطان حسین والی خراسان کے یہاں بہزاد ایسا مشہور مصور گزر رہا ہے جس کا ذکر بابر نے اپنے خودنوشت حالات میں بہت تعریف سے کیا ہے۔ یہ لوگ نظامی و فردوسی وغیرہ کے تغیل کو اپنے ہنرمیں ایسی طرح نمایاں کرتے کہ اگر مغربی مصور Raphael بھی دیکھتا تو وجد کرتا۔ اُس وقت کی مصوری نے جس کا بیان آئینِ اکبری میں خاص طور پر کیا گیا ہے ہر رنگ کی تصویریں چھوڑی ہیں جو اب ہندوستان سے یورپ چلی گئیں اور جن کو اب ہم نگاہِ یاس سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہندوستان میں جو تصویریں باقی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی مصوری نے علمِ مجلس، دربار، سیر و شکار، میدانِ کارزار، قلعہ گیرئی، قدرتی مناظر اور اظہارِ جذباتِ حسن و الفت، وغیرہ کے تمام اقسام پر ہنر آزمائی کی۔ آج کل جذباتِ حسن و الفت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور معاشرتی نمونے بھی تمام و کمال ظاہر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مرقعِ چغتائی کے نمونوں سے ظاہر ہے۔ لیکن مغلوں کے وقت میں بھی اظہارِ حسن و محبت کی بہت کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک تصویر میں ظاہر کیا گیا ہے کہ معشوق عاشق پر اہل برہمچاری سے اور عاشقِ مغلدستہ لئے دارنگی کے عالم میں سلسلے کھڑا ہے اور کچھ سوال و جواب ہو رہے ہیں۔ حاشیہ تصویر پر سوال لکھا ہے۔

گجولے عاشقِ صادق چراگلدستہ آوردی؟ دلِ بلبل نکستی غنچہ را دل بستہ آوردی؟

عاشق جواب دیتا ہے۔

نہ بہر زہد دستم جان من گلدستہ آوردم بہ خوبی لاف سے زد گل بہ پیشیت بستہ آوردم اور کمال یہ ہے کہ پھولوں کو کچھ خنداں اور کچھ پژمرده ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح کمالِ مصوری اور کمالِ شاعری کے نمونے ساتھ ساتھ دیکھے گئے ہیں اور حتی الامکان ”حسن خاموش“ کو بولتی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج کل ہندوستان کی نقاشی میں بعض لوگ اس بات کے کوشاں ہیں کہ مغربی اثرات کے ساتھ ساتھ قدیم راجپوت اور مغل خوبیوں کو بھی تصویر میں زندہ رکھیں۔

مصوری کے علاوہ دیگر فنونِ حرفت و دستکاری اپنی مقامی خصوصیتوں کے ساتھ مشہور ہیں۔ دکنی، پنجابی، مراد آبادی، جے پوری کام اپنی اپنی جگہ پر خصوصیت رکھتے ہیں۔ جن میں سے دلی اور لکھنؤ کی دستکاریاں زبانِ اردو

۱۵ یہ تصویر ”حمیدیہ لائبریری“ بھوپال میں دیکھی گئی۔

کی امتیازی خصوصیتوں کی طرح مشہور عام ہیں مصوری سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ہندوستان نے عالم نگاری میں ایرانی اثرات کی وجہ سے بہت ترقی حاصل کی۔ مغل ہیگیا کی جدت پسند طبیعتوں نے آرائش و زیبہ زینت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، چنانچہ نور جہاں، متنازل اور زیب النساء کی کوششوں نے صرف لباس و زیور ہی نہیں بلکہ عام دستکاری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ اور آج کل یورپ کی کامل پسندی اور فطرت طرازی نے اُس پر چار چاند لگا دیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ مشرقی مصوری ”جزوہ یعنی خط و خال کی طرف زیادہ مائل ہے اور مغربی مصوری شکل“ بلکہ آس پاس کا خاکہ بھی ضروری سمجھتی ہے۔ مشرقی نقاش بھی اب شکل کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور یہی ایک اچھا اثر ہے جو یورپ کے آرٹ سے ہم کو حاصل ہوا۔

المقتصر قدیم مصوری و نقاشی بالکل روحانی تھی۔ قرون وسطیٰ میں رزم و بزم کی تصویریں دکھلائی گئیں۔ اور اب فطرت اور نیچر پر غلبہ غالب ہے۔ لیکن اردو رسالوں میں جو شعرائے متوسطین کے خیالات پر فن مصوری کی ہنر آزمایا کی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ عالم خیال کا ایک منطوم طلم بھی باندھا جاتا ہے اگر حسن و سادگی اور مظاہر فطرت کے ساتھ کچھ روحانی جھلک بھی لئے ہوں تو صحیح معنی میں فن مصوری کا نمونہ کمال میں۔

جہاں تک کہ مذہب کا تعلق مصوری اور بت تراشی سے ہے ہم ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام عالم کو زمانہ قدیم میں گمراہ پاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی سبق آموز بت شکنی سے لے کر محمود و غزنوی کی بت شکنی تک یہی رونار ہا مگر اسلام نے بہت کچھ مسیحائی کی جس سے بہرہ اندوز ہو کر کبیر داس اور گرو نانک ایسے بزرگ خود بخود بت پرستی کے خلاف یکپہرہ کھڑے ہو گئے اور اب یہ روحانی مرض قریب قریب مٹنے لگا، گوپت درجے کے لوگوں میں ابھی باقی ہے۔

ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے لوگ اپنے خیال ہی کو نہیں بلکہ روح کے اُس مقدس احساس کو بھی پیکر تصویر میں لانے کے کوشاں تھے جو انہیں وجود معبود کا پتہ دے رہا تھا۔ تاکہ دقت مراقبہ اور سچی تصویر کی تکلیف نفع ہو جائے اور یہ ایک غلطی تھی جس کو مسلمانوں نے رفع کرنے کے لئے بتوں اور تصویروں سے اختلاف ظاہر کیا۔

کیونکہ

جو نقش ہے ہستی کا دیکھو کا نظر آتا ہے

پر دے پر مصوری ہی تنہا نظر آتا ہے

تاہم حسن خاموش سے ہم کو ارتقاءے روحانیت کی بہت کچھ تاریخ مل جاتی ہے اور روحانیت ہی نہیں بلکہ امتیاز حسن اور معاشرتی پہلو کا بھی بہت کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر قدیم مصوری ہمارے جذبات کو بیدار کر کے زبان سے تعریف کے کلمات کھلائے۔ کوئی حیرت نہیں اگر شاعر حسن خاموش کی زندہ مثال دیکھ کر حسن کو حق اور حق کو حسن کہے۔ گو اسی شرط پر کیوں نہ ہو کہ حسن جب ہی تک حسن ہے جب تک کہ رسوا نہ کیا گیا ہو۔ یہ عجیب بات نہیں اگر کوئی یتیم شاعرانہ انہماک کے ساتھ روضہ تاج کو دیکھ کر ساختہ انسان نہیں بلکہ ساختہ ملامت کہے کہ ”روئے زمین کے سر کا تلج ہے“ یا یہ کہ اُس جنت کا جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے زندہ خاکی نمونہ ہے۔ اگر ہماری نگاہیں بنگارِ فطرت کے حسن کو دیکھ کر حیران ہوتی اور دل کو محو کیفیت کر دیتی ہیں تو انسانی جدوجہد اور کوشش بھی کچھ نہ کچھ گر گزرتی ہے، پس گزشتہ قوموں کی یادگاریں اپنے قیام تک اُن کا نام روشن رکھیں گی ع

جاگ رہی ہیں نکمیتیں پھول ہیں ابنا زین
اگر ہم فنِ مصوری اور نقاشی کے ان مظاہر اور ان جیتی جاگتی تصویروں کو زندگی کے دھندوں میں پڑ کر یا کسی اور قسم کی غفلت سے خاموش کر دیں اور اُن کی قدر نہ کریں اور اُن کو حادثِ آسمانی میں تباہ ہو جانے یا غیر قوموں کا ذخیرہ ہو جانے دیں تو ہماری کم نصیبی ہے۔

جن چیزوں میں روحانیت، صداقت، عزت اور محبت کی کچھ بھی بوجہ اگر پرستش کے لائق نہیں تو کم از کم پرورش کے لائق ضرور ہیں ورنہ ہاتھ سے گئی چیزوں کا افسوس تو ہمیشہ رہتا ہے۔ وہ چیزیں پھر کہاں ہے
ماشوق و معشوق بھی آخر فسانہ ہو گئے
جانے گریہ! اب یہاں کیا مجنوں کہاں؟

سید مقبول حسین

غزل

تبسم نہیں ہے گل افشائیاں ہیں تبسم نہیں ہے غزلخو انیاں ہیں
 نہ ہے آپ کے حسن کا دورِ نصفت جدھر دیکھتا ہوں ستم رانیاں ہیں
 تمہے گھر کی جانب نمازوں میں سُرخ ہو تمہے در پہ سجدوں میں پشائیاں ہیں
 خوشا! اک تری نسبتِ غم کہ جس سے خوشی پر خوشی کی فدا انیاں ہیں
 مہ و مہر مشاطہ بن کر چلے ہیں نئی سے نئی جلوہ سامانیاں ہیں
 کوئی پردہ داری کے بھی تو کب تک ترادرد ہے اور عریانیاں ہیں
 سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں خطائیں نہ کر کے پشائیاں ہیں
 تقلصے کرم کے نہ شکوے ستم کے ادا دانیاں سی ادا دانیاں ہیں
 اگر کارِ الفت کو مشکل سمجھ لوں تو کیا ترکِ الفت میں آسانیاں ہیں
 ادھر فکرِ دنیا، ادھر خوفِ عقبے پریشانیوں پر پریشانیاں ہیں
 اگر اذن ہو ہر دو عالم سے کہہ دوں تمہارے مقدر میں ویرانیاں ہیں

اب آزاد ہے اور سکوتِ مسلسل

وہ لفاظیاں ہیں نہ لسانیاں ہیں
 حکیم ازاد انصاری

شیطان اور بزرگ

بیٹھے بیٹھے انجیل کا ایک جملہ جو یاد آیا تو معاً یہ خیال گذر کر آگے وقتوں کے لوگ بہت غصیلے تھے یا آج کل کے لوگ زیادہ شائستہ ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے ”Get thee behind me, Satan.“ اس کا لفظی ترجمہ ہے ”پچھے ہٹ بے شیطان!“ لاجول ولاقوتہ۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے کہ ایک ہستی اپنا فرض منصبی ادا کرے اور اُسے جھڑک کر کہا جائے چل! ہم نہیں آتے۔ تیری ایسی کی تیری!“ اگر بغرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نیک رہنے کے لئے ترش رو ہونا لازمی ہے پھر بھی ناگوار سا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مقدس ترش روئی کے ساتھ اندازِ گفتگو بھی باز ایسی ہو۔ آج کل کی زندگی میں سینکڑوں دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیطان کو سخت سے سخت جواب اگر کسی نے دیا تو بس اتنا ہی کما۔ ”واسع معاف کیجئے۔ آج ناچ میں شریک نہ ہو سکوں گا“ قصہ ختم ہوا۔ نہ یہ کہ بازاری زبان اور پھر ہزاروں سالوں تک اس کا چرچا! آخر وہی دیا ہنسنے وہی شیطان ہے مگر اخلاق وسیع تر ہیں، یہاں تک کہ آج کل کے محمد شاہ رنگیلوں کو عیش پرستی کا تواتر بھی بارِ خاطر ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اسی خیالی کشمکش میں تھا کہ حضرت ڈیش کی خوشبو آئی۔ نہیں ان کے سگریٹ کی! ابھی کمرے سے باہر ہی تھے کہ فرماتے ہیں۔

ڈیش۔ اب کہیں چلو گے بھی یا یونہی اس کمرے کا ناک میں دم کرو گے؟ تمہارا کمرہ تم سے اکتا چکا ہے۔ کمرے کا خنّی ہے کہ کبھی کبھی تازہ ہوا اسے بھی نصیب ہو۔

میں۔ ایک مشکل حل کر دو تو جہاں کمرہ چلوں۔

ڈیش۔ اگر مشکل مشکل ہے تو تو بندہ حاضر ہے لیکن آسان مشکلوں کے لئے کسی قومی لیڈر کو چندہ عطا کیجئے۔ میں۔ واقعی خوفناک مشکل ہے (یہ کہہ کر اسے ”ہٹ بے شیطان“ والی دقت پیش کی۔ ڈیش صاحب نیا سگریٹ جلا کر فرماتے ہیں)

ڈیش۔ میں تم سے میں دفعہ کہ چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ زمانہ گذشتہ کی کسی بات کو بھی اس طرح سے بیان نہ کرو جس طرح کہ وہ ہوئی بلکہ اس طرح سے بیان کرو جس طرح سے کہ تمہارا اپنا نسب

پورا ہو۔ مرنے والے مر مرا چکے۔ نہ ہم سے پوچھ کر وہ پیدا ہوئے نہ ہم سے پوچھ کر انہوں نے کھایا، پہنا، برتا پوجا۔ اگر ان کا ہم پر کوئی حق ہے تو بس اس قدر کہ ہم یہ ثابت نہ کریں کہ وہ بہت گمراہ تھے۔ میں۔ تو گویا تاریخ کوئی چیز نہیں۔

ڈیش۔ بہت بڑی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ اسے بدلتے رہنا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اخبار روزانہ کلمہ کھلا حالات حاضرہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ ایک اخبار میں ایک وزیر دانشمندی کا پتلا ہے تو دوسرے میں نقشب کا بھوت۔ آخر تاریخ اسی مصالح سے تیار ہوگی اور آج کل کے ٹکے سیر والے وزیر تو کیا ہمارے سامنے کسی نپدیلین، کسی کلاؤ، کسی اورنگ زیب موجود ہیں اور جیسی ضرورت ہوگی ابھی اور تیار ہونگے۔ میں۔ اچھا! آپ تاریخ کو رہنے دیجئے۔ اصل مطلب پر آئیے۔

ڈیش۔ یہی تو اصل مطلب تھا کہ جس طرح ہم تاریخی ہستیوں کی حسب ضرورت اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہمیں پیغمبروں کو اصلاح کا بیڑا بھی اٹھانا چاہئے۔ میں۔ تو بکر و توبہ! کیا کفر کہتے ہو!

ڈیش۔ کفر تم تو کہتے ہو۔ تم اور تمہارے ہم خیال ہر دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ سب کے سب پیغمبر ناکامیاب ہوئے اور دنیا ویسی ہی بُری ہے جیسی کہ ان کے نازل ہونے سے پہلے بُری تھی۔ میرٹل میں چونکہ پیغمبروں کی سچی عظمت ہے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بے انتہا کامیاب ہوئے۔ میں۔ وہ کیسے۔

ڈیش۔ بالکل آسان ہے۔ فرض کرو کہ کسی پیغمبر نے حکم دیا کہ زیتون کا تیل حرام ہے۔ مگر خود اس کی امت کے کچھ لوگ دنباد میں غرضی میں ہلدی میں زیتون کے تیل کے خم لٹھکاتے رہے۔ تم لوگ تو یہ کہہ دو گے کہ اس امر کی تعمیل نہیں ہوئی۔ گویا پیغمبر کو اس خاص معاملہ میں ناکامیابی ہوئی۔ میں یہ کہوں گا کہ ممانعت ہرگز نہ تھی۔ صرف یہ حکم تھا کہ جنہیں آسانی سے میسر نہ ہو سکے وہ خواہ مخواہ زیتون کے تیل کی ہوس میں مغرور نہ ہوں۔ یہی صورت اس جملے کی ہے۔ میں اس جملے کا ترجمہ یوں کروں گا۔ جناب من۔ مجبوراً میں آپ کی طرف پیٹھ کر رہا ہوں۔ مجھے دوسری طرف جاننا ہے۔ قصہ ختم ہوا۔ فرض کرو کہ تم نے یہ نتیجہ نکالا ہوتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ بہت صاف گو تھے اور آج کل منافقت کا زور ہے۔

میں۔ یہ نتیجہ تو ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ تو ذرا اسے عقائد کے فرق پر دھمکیاں دیتے

تھے کہ جلو گے، بھنوکے، دنیا غرق ہو جائے گی۔ بات بات پر قیامت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔
 ڈیش۔ تم بہت اکھڑ ہو۔ یہ اُن لوگوں کا محاورہ تھا، رنگیں بیاباں تھیں۔ اور کچھ بھی ہو سوال یہ نہیں کہ وہ کیا تھے بلکہ یہ کہ ہم انہیں کس کام میں لاسکتے ہیں؟ کسی چیز کو برا کہنا اور پھر اُسے استعمال کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہمارا فرض عین یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے عقاید تبدیل کرتے رہیں۔ تمام موجودہ تنقیدی تفسیروں کا مرکزی اصول ہی یہ ہے کہ زمانہ سابق کے عقاید کی اصلاح کی جائے۔ نہ صرف عقاید کی بلکہ عادات کی۔
 میں۔ خاک تم نے میری مشکل حل کی۔ ایک مشکل کو دس مزید گورکھ دھندوں میں لپیٹ دیا۔

ڈیش۔ بھائی تم فیض ایل انسان ہو۔ میں بچارا سیدھا سادھا قدامت پسند ہوں۔ مجھے واقعی زمانہ ماضی کی ہر وہ چیز پسند ہے جو میری رائے کے موافق ہے اور جو بظاہر میری رائے کے موافق نہیں اُسے میں عقل کے نور سے اپنی رائے کے موافق کر لیتا ہوں۔ آخر خدا نے عقل انسان کو اس لئے تو نہیں دی کہ اُس کا استعمال نہ کیا جائے۔ بندہ خدا! لوگ معجزوں پر ماتہ صاف کر چکے۔ ضروری غیر ضروری احادیث رائج کر چکے اور نرم ابھی یہ ٹھوکریں کھا رہے ہو کہ معمولی سے ترجمے میں تصرف جائز ہے کہ نہیں۔ اگر کچھ بھی تمہیں پاس دفا ہے تو اللہ کا نام لو اور ماضی کو بدنام نہ ہونے دو۔

(میری بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں)

ڈیش۔ اگر سی اُن کی طرف کھسکاتے ہوئے۔ آداب۔ اجی بیگم صاحب کچھ ان حضرات کی تو اصلاح کیجئے فیض کے لئے بزرگوں سے علیک سلیک رکھنے کے روادار نہیں۔

میں۔ تم ڈیش کی بک بک پر نہ جاؤ۔ آپ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کے عقائد کی اصلاح ہمارا فرض عین ہے۔
 بیگم۔ سبحان اللہ۔ اپنے دھندوں سے تو فراغت نہیں بزرگوں کے پیچھے عقل کی لاشی لئے کون پھرے!
 ڈیش۔ این خانہ تمام آفتاب است۔ بیگم صاحبہ یہ تو سوچئے کہ ہمارے بزرگ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ اگر اور ان سے اچھا کام کوئی نہ بھی ہوا ہوتا تو کارِ خیر وہ کر گئے کہ ہم سے جانشین چھوڑ گئے۔
 بیگم۔ مگر اُن کے عقائد کی اصلاح کس طرح ممکن ہے؟

ڈیش۔ وہ خود تو میدان میں آکر لڑنے سے ہے۔ اب تو جو ہم کہیں سو وہ وہ ہیں۔ عصائے موسوی اور قبائے یوسفی سے آخر میں کچھ کام لینا ہے یا نہیں؟ اگر لینا ہے تو اپنی طرح ان چیزوں کو بدل کر قدامت پسندی کا ثبوت دیں۔

بیگم۔ آپ دراصل ہر بات کی تصحیک کرتے رہتے ہیں اور مولوی بچارے سچ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں الحاد کا اندر ہے۔ خود تو محمد ہوئے سو ہوئے اب بزرگوں کو بھی آندہ خیال کرنے چلے۔ یہ بے ایمانی کیا نیا مذہب ایجاد ہوا ہے؟
ڈیش۔ عورتوں کی اس تنگ خیالی سے دق آکر اسلام نے گزشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی عالم عورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ہرنیا مذہب ابتدا میں ایک ناپسندیدہ بدعت ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ہرنیا مذہب یہ بھی کہتا ہے کہ دنیا کو وہی سکھایا جا رہا ہے جو پہلے پیغمبر سکھلا گئے۔

بیگم۔ میں تو بحث کے محضے سے کوسوں بھاگتی ہوں۔ یہ بتائیے کہ چائے ابھی منگواؤں یا تھوڑی دیر ٹھیکر کر! میں۔ جیسے تمہاری خوشی ڈار لنگ

ڈیش (متحیر سے) ایمان داری کے دعوے اور ساتھ ہی الحمدوں کو چائے کی دعوت؟
بیگم (حقہ لٹا کر) یہی تو ہماری اخلاقی عظمت کا ثبوت ہے کہ سوشل تعلقات میں مذہبی اختلاف ہرج نہیں ہوتے۔ اللہ کے بندے آپ کو چائے پلائیں گے مگر اللہ آپ کو جہنم ہی بھیجے گا۔

ڈیش۔ مجھے جہنم رسید کر کے آپ کو کیا خوشی ہوگی؟
بیگم (ہنستے ہوئے) بے انتہا خوشی! یہ خوشی کہ انصاف ہوا اور سچ پوچھو تو جنت میں رہنے کی اصل خوشی ہی ہے کہ جن لوگوں نے یہ نہ مانا وہ جہنم میں ہیں۔ تمام اصلی اور سچی خوشی کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی اور اپنی غلطی کے باعث تکلیف میں ہو۔

ڈیش۔ معاذ اللہ! معاذ اللہ۔

(بیگم چائے کے لئے حکم دینے جاتی ہے)

میں۔ کیا تم کبھی بھی منانے سے کسی شکل مسئلہ پر گفتگو کر سکتے ہو؟
ڈیش۔ میں تو ہمیشہ ہی منانے سے گفتگو کرتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے اگر کسی نے شیطان سے درشت کلامی کی؟

میں۔ لاجول ولا قوۃ! عجیب جنت ہو! شائستگی سے گفتگو کرنا ہر شریف آدمی کا ذاتی فرض ہے، متکلم چاہے کوئی ہو۔ میرا پنا خیال یہ ہے کہ شیطان جو مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی وجہ زیادہ تر غالباً یہ ہے کہ ہم اسے ہر وقت شائستگی دیتے ہیں۔ کبھی شیطان الرحیم کہتے ہیں، کبھی اعوذ باللہ کہتے ہیں۔ آخر اس فضول دل آزاری سے حاصل کیا ہے؟ اگر ہم اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کریں تو ممکن ہے کہ وہ بھی ہمیں کم دکھ لے!

ڈیش - کیا مطلب؟

میں - یہ مطلب کہ اگر خوشامد خود خدا کو پسند ہے تو شیطان کو تو بہت ہی زیادہ پسند ہوگی۔ کیوں ہم شیطان کی اس کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائیں؟ جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی کر پیش آئے۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کا نگرسی یا مہاسبھاٹی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے۔ شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی اور کانگریس کا بھی بھلا ہوگا۔ ہم لوگ اپنی کج اخلاقی سے خواہ مخواہ شیطان کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔

ڈیش - خیال تو بہت اچھا ہے مگر مہاتموں اور پنڈتوں میں شیطان بچا کر کیا کرے گا؟
میں - کرے یا نہ کرے ہمارا تو کچھ چھٹکارا ہو۔

ڈیش - اچھا تو تم شیطان کو ہر دلعزیز بناؤ اور میں بزرگوں کے عقائد کی اصلاح کروں۔ اس تقسیم کار سے شاید قوم کچھ ابھرے۔

فلک پیم

سحرِ لغتہ

شبِ سیاہ، خموشی، تلاطمِ انجم
فضا میں نالہ کناں ہے منتِ سیاہ کی صدا
عباس ہے کیفیتِ کائنات تو لیسکن
جو میرے دل پہ گزرتی ہے کہ نہیں سکتا

اختر

انصاری دہلی

بزمِ خرابات

(۱) ساقی! قسحِ بادہ گلگوں لٹھدا
خلفے میں تھے متوجہ تھے دلِ کوشیہ
میں "اور نصویرِ بہشت و کوثر!"
آرہول و آوقوۃ الا یا للہ

(۲) زندوں کو روا ہے کامرانی ساقی
چہ روزِ جزا فقط کسائی ساقی
خشریں اگر ہوئی بھی پیشِ بانقض
جسے لگی جوابِ نوجوانی ساقی

(۳) بے مہج ہی امچ پیشِ پیسے ساقی
باقی نہیں اب کوئی ہوسے ساقی
یہ آگیا عشرت "دورِ صہب موقوف"
وہ ٹھیک گیا آسمانِ بیسے ساقی

(۴) مجروح نہ کر لطف کے اوقات سائل
بلکبلے کوئی یوں بھی خفا سائل
رفائے کہ وقتِ صبح رونما ہوگا
خاموش کہ باقی ہے ابھی اشکِ دل

جوش
لیج آبادی

تاریکی

میں نے ایک خواب دیکھا، جو اصل میں خواب نہ تھا،
روشن سورج بجھ گیا تھا، دھندلے بے نور ستارے کا محدود خلا میں بھٹکتے پھرتے تھے، اندھی اور تاریک دنیا چاند کی
کرنوں سے محروم ٹھنڈی ہوا میں گردش کر رہی تھی۔
صبح آئی اور چلی گئی، آئی اور اپنے ساتھ دن نہ لائی۔

انسان اپنی بربادی کے خوف میں ساری خواہشات بھول گئے تھے، تمام دل روشنی کے لئے خود غرضانہ دعاؤں
میں مشغول تھے، لوگ آگ جلا جلا کر زندہ تھے۔ حکومت کرتے ہوئے بادشاہوں کے محلات، غریبوں کی جھوپڑیاں اور تمام
ذی روحوں کے مسکن روشنی اور گرمی پہنچانے کے لئے جلا ڈالے گئے تھے۔
شہر کے شہر جل رہے تھے اور انسان اپنے مشتعل گھروں کے چاروں طرف جمع تھے، کہ ایک دوسرے کی
شکل دیکھ کر دل کو ڈھارس دیں۔

ایک خوفناک امید تھی جو ساری دنیا میں باقی رہ گئی تھی۔

جنگلوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ وہ جل جل کر گرتے جاتے تھے، اور اُن کی روشنی مدھم
ہوتی جاتی تھی، چٹختے ہوئے درختوں کے تنے ہیب آواز سے پھٹ کر کچھ جاتے تھے، اور اندھیرا ہو جاتا تھا۔
آدمیوں کے چہرے اس ڈمکاتی ہوئی روشنی میں ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے۔ اُن میں سے کچھ لیٹ گئے، اور
آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رٹنے لگے، اور بعض نے اپنی ٹھوڑیوں کو اپنی بند مٹھیوں پر رکھ لیا اور مسکرانے لگے، اور کچھ دوسرے دُسر
بھاگ رہے تھے، کہ اپنی جلتی ہوئی چٹاؤں میں لکڑیاں ڈالیں اور پھر مایوس ہو کر اندھیرے آسمان کی طرف جو گزری ہوئی دنیا کا
سیاہ تابوت معلوم ہوتا تھا، جھونانہ بے پنی سے دیکھتے تھے، اور لعنت بھیجتے ہوئے زمین پر گر کر کہنے لگتے تھے۔

جنگلی پرندے چختے تھے اور سہم کر اپنے بیکار بازوؤں کو پھر پھرتے ہوئے زمین پر گر گئے تھے، خوفناک درندے طبع
ہو گئے تھے اور کانپتے ہوئے شہروں میں گھس آئے تھے، سانپ زمین پر رینگتے تھے اور لوگوں کو لپٹ لپٹ کر بھنکا ریں
مارتے تھے، مگر اُن کا سر ختم ہو چکا تھا۔ اُن کو کھانے کے لئے مار لیا جاتا تھا۔

جنگ جو کچھ عرصے کے لئے بالکل ختم ہو گئی تھی پھر اپنا اثر دکھانے لگی۔

ایک ایک نوالہ خون سے خریداجاتا تھا، اور ایک دوسرے سے دُرُودِ نذیر میں بیٹھ کر زہر مار کر لیا جاتا تھا۔
محبت باقی نہ رہی تھی۔

دنیا کو صرف ایک خیال تھا اور وہ فری اور گناہ موت کا خیال تھا۔

قحط نے اپنا اثر تمام اعضاء پر ڈالنا شروع کر دیا تھا، آدمی مرتے تھے اور اُن کی ہڈیوں کو مثل اُن کے گوشت کے کوئی نزار نصیب نہ ہوتا تھا، ایک کمزور آدمی دوسرے کمزور آدمی کو کھالیتا تھا، حتیٰ کہ کتے بھی اپنے مالکوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئے، سوائے ایک کے کہ چاہنے آقا سے اُس کے مرنے کے بعد بھی وفادار رہا، پرندوں، درندوں اور بھوکے آدمیوں سے اُس نے اپنے آقا کی لاش کو بچایا، یہاں تک کہ بھوک نے اُن میں سے بہت سوں کو لایا اور باقی کے اُن مرے ہوؤں کو چٹ کر کھائے۔ خود اپنے لئے اُس نے کوئی غذا تلاش نہ کی، بلکہ اپنے مالک کا ہاتھ چاٹتے ہوئے جس سے کہ اُسے ہتھکی کی کوئی اُمید نہ تھی، وہ ایک ورد انگیز سسکی بھرتا ہوا مر گیا۔
جمع آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔

ایک بڑے شہر میں سے صرف دو زندہ رہے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے، وہ دونوں ایک بڑے مندر میں قربان گاہ کے بجھتے ہوئے انکاروں کے قریب جہاں بہت سی متبرک اشیا، ناپاک استعمال کے لئے ڈھیر کر دی گئی تھیں، انہوں نے اپنے ٹھنڈے اور سوکھے ہوئے ہاتھوں سے بھول کو گڑیا اور چند مہم انکاروں کو اپنے کمزور سانس سے ایک مہوم زندگی کی امید میں پھونکا، ایک چھوٹا سا مفسر آمیز شعلہ بلند ہوا، شعلے کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اُن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چیخ ماری، اور چیخ مار کر مر گئے، وہ صرف ڈر کر مر گئے، اور کسی نے کسی کو نہ پہچانا، کیونکہ اُن میں سے ہر ایک کے چہرے کو بھوک نے شیطان کی طرح بھیا نک کر دیا تھا۔

دنیا خالی ہو گئی تھی۔ کبھی آباد و پر شوکت، اب ایک بیکار و صیر، بے مہم، بے برگ، بے انسان، بے زندگی، موت کا ڈھیر۔
مٹی کلبے بے ترتیب مجموعہ، دریا، جھیلیں، سمندر بے ساکن تھے، اُن کی خاموش گہرائیوں میں کوئی حرکت نہ ہوتی تھی۔

جہاز بے طاقت کے سمندروں میں بے سُر ہے تھے اور اُن کے ستون ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، اور جو نہی کہ وہ پانی پر گرتے تھے، خاموشی سے تیرنے لگتے تھے، کوئی لہر نہ اٹھتی تھی۔ لہریں مر گئی تھیں، مد و جزر اپنی اپنی قبروں میں پہنچ چکے تھے، آندھیلیں بد بردار ہو، میں تحلیل ہو گئی تھیں، اور بادل ضائع ہو گئے تھے۔

تاریکی کو ان کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود تمام جہان تھی۔

محسن عبد اللہ

(لاٹو بارن)

نفاست کا طلسم

بعض دولت مند ہندوستانی کو ٹھیکوں کے گول کمرے میں فرش فرش، مینر اور کرسی، پردے اور قالینیں، آئینہ کے نمائشی خدوات اور دیواروں پر روکے پھیکے فوٹو کمپنیوں کے نو تعلیم یافتہ (یا نا تعلیم یافتہ) مذاق کا زندہ ثبوت ہیں۔ قالین اگر آگک بھجھو کا ہے تو پردے جگمگ اور مینر پوش خاکلی۔ کرسیوں کے علاوہ کی آب و تاب اگر ایک بھی ہو تو بھی ہر کرسی کا دم خم الگ ہے۔ ایک پر مٹی تو سخت الشرے تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتی، اور جو دوسری پرست ناپا ہو تو گویا کمر میں کسی نے آہنی سلاح ٹھونک دی۔ جس قدر یہ کمرے آنکھ کے لئے گستاخ اور کمر کے لئے ناہموار ہیں اسی قدر ان کی روحانی آب و ہوا کثیف ہے۔ بھلا جہاں قالین جت جت کر پردے سے کہہ رہی ہو ”بھتیا! خدا اپنے پاؤں تو ذرا ہٹاؤ“ اور جہاں زرق برق مینر پوش دیوار کی تصویریں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہوں وہاں ملنے کا کیا لطف، اور اگر مل بھی بیٹھیں تو ناممکن ہے کہ فریچر کے اس شور و بکا میں سچی نظروں کا، میٹھی باتوں کا جادو چلے اور رنگ لائے۔

انسان بالکل پھول ہیں جس طرح ٹو پھولوں کو مجلس دیتی ہے اُسی طرح گرم فریچر خیال کو، خیال کی عروسیت کو سوخت کر دیتا ہے۔ ہزار روحانی تصویر سے انسان ایسے کمرے میں داخل ہو، فصاحت کے ہزار اور شہزادہ خندہ سیم تنہا ہونے کے لئے لیٹا ہوں مگر جہاں ایسے کمرے میں ذرا بیٹھے تو باتیں یہ ہوتی ہیں کہ کلب میں آجکل جوتے میں دال بٹ رہی ہے، کانگریس کا چرچا نہیں چلتا، سرکار کا حقہ پانی بند ہے اور محلہ القیاس۔ یعنی جو باتیں برآمدے کے کسی ذلیل کو نہ میں ہونی چاہئیں وہ فریچر کے تشدد سے گول کمرے میں اُگلی جاتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے گول کمرے میں بھی اسی قابل +

جن لوگوں کو اس تنقید پر شک ہو، وہ ایک سیدھے سادے معیار سے اپنے گول کمرے کی لیاقت کو پرکھ لیں۔ کسی باہر راگ شیریں ادا سے دو بول سن لیں۔ اگر کمرے کا رنگ، پردے اور باقی لباس موزون نہیں تو راگ دیواروں سے سرخ میچ کر جان دیدیگا۔ لیکن اگر کوئی مستعلیق ہستی کی توجہ کا نمونہ ہو ہے تو راگ پھیلے گا، چیزوں سے لپٹے گا، دلوں میں کجے گا، آنکھیں بند ہو گئی، سارے جسم میں خفیف سارتھن ہو گا اور راگ روح کو لئے اڑے گا +

راقم صرف کو کسی کمرے کی تو بہن مقصود نہیں اور یہ تنقید محض تعلیمی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہندوستانی کو ٹھیکوں میں لگ سچوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہے تو اب یہ بھی لازمی ہے کہ کمروں کی تعلیم کی بھی استعداد ہو۔ بعض کو ٹھیکوں میں

اس وقت بھی گول کمرے نمایاں طور پر دلفریب ہیں۔ اس ضمن میں بیگم ب، ت گا گول کمرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے میں انسانیت ہے۔ اگلے دن چند منٹ مجھے تنہا اس کمرے سے ملاقات کا موقع ملا۔ نہ تو کمرہ بھر پر جھجھلایا نہ ”ادھر دیکھو، اُدھر دیکھو“ کہہ کر اُس نے میرے کان کھائے۔ نہ کیس رنگ ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے نہ تصویروں سے دیواریں جھکی پڑتی تھیں۔ بعض اچھے گول کروں کا سامان بھی بسا اوقات اس قسم کا ہوتا ہے جیسے غزل میں شعر یعنی ایک دوسرے سے آزاد، مگر بیگم ب، ت کے کمرے کے سامان آرائش میں غرور جس سے بھی بڑھ کر خلوص یگانگت کی جھلک تھی، یعنی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مزاج شناس نے ہر مختلف چیز کو زندہ اور با مذاق سمجھ کر اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھیک جگہ اور مناسب ہنشیں تجویز کئے ہیں اور اس مزاج شناسی کی داد میں کمرے کی ہر چیز خوش و خرم تھی +

جب میں داخل ہوا تو پہلی ہی کرسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ساتھ والی میز نے سیلی آواز سے کہا ”اس فوٹو کو تو ملاحظہ کیجئے“ فوٹو نے انداز سے کہا ”میرے بنیاد پر مستند کا کل میری Chin کے لئے کس قدر دلفریب Background (پس منظر) ہیں۔“ بندے نے پنجاب میں بیٹھے بیٹھے اس بہاری ادا کے عکس کی داد دی اور دل ہی دل میں کہا ”کمرہ کیا ہے کسی کی طبیعت کا طلسم ہے +

پرستارِ حسن

لے فوٹ - Chin کا اردو ترجمہ ایسے کمرے کے ذکر میں استعمال کرنا گناہ ہے۔ سخت گنوار لفظ ہے، اس کمرے کی نفاست کا یہی کافی ثبوت ہے، کہ سینکڑوں میل اس سے دور بیٹھے بھی اس کے خیال کے ساتھ زرخندان اور ذوقن جیسے لفظ بھی ثقیل معلوم ہوتے ہیں +



پروانہ

سلمانے سحر کے حُسن کی صنوتار کیا فضا پر چھانے لگی
 وہ انجم رقصاں ڈھلے، وہ شمع کی لوتھڑانے لگی
 جو مٹربے سے نکلیں تھی، مغل عشرت ختم ہوئی
 خوابیدہ فضا نے کروٹ لی کیفیتِ غفلت ختم ہوئی
 کچھ خاک کے قطرے، کچھ پرہیز بے برگِ نوا پروانوں کے
 یا، دیکھ، کہیں انجام نہ ہوں شیشے کے حسیں عنوانوں کے
 وہ آخر شبِ صندلا سا تجلی بارساں بھی ختم ہوا
 وہ شمع بھی اُٹھا وہ دھواں، لوابُہ دھواں بھی ختم ہوا

پروانہ کی مستی میں کیا کیا عبرت کے خزانے ملتے ہیں
 ہر دور میں اس کے کتنے لامحدود زمانے ملتے ہیں
 اعجازِ وفا ہے صبر و سکون سے، تلخیِ پیہم سہہ جانا
 یوں آتشِ دل کے شعلوں میں خاموش سلگ کر رہ جانا
 شب تیرہ دروں تھی شمع کی صنو نے مغل شبِ فرائی کی
 پروانہ کو دیکھو جس نے محبت ہی کے لئے قربانی کی
 احسان کی لذت شمع کے جل بجھنے کی ہوں کاغذ تھی
 پروانہ کے دل میں لیکن صرف الفت کی تجلی خشاں تھی
 تعمیرِ حیاتِ شمع ہے مضمر شمع کے پیہم جلنے میں
 پروانہ مگر محبوبِ رہنمائی اس راہِ وفا پر چلتی ہیں

اس طرح کوئی آزاد غرض، جاں اپنی کسی پر کھونہ سکا

وہ کام ہوا پروانہ سے خود شمع سے بھی جو ہو نہ سکا

اختر

عبرت

”بھلا کیوں وہ لوگ جنہیں میں چاہتی ہوں یہاں نہ آئیں۔ آخر کوئی سبب بھی؟“

”رہست خوب تو پھر آپ مختار ہیں۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے عطیہ دریچہ کی طرف گئی اور غصہ میں وہاں کھڑی ہو کر دریچے سے

باہر کی طرف بونی دیکھتی رہی۔ اگرچہ دراصل وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں رہی تھی۔“

”وہ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتی جو کہ یہ لوگ میرے کس کام کے ہیں؟“

”میری سمجھ پیزار کہ کون ہمارے کس کام کا ہے۔“ عطیہ نے جھٹاکر کہا۔

جمال نے تیزی سے کمرے کے فاصلہ کو طے کیا اور بڑھ کر کسی حد تک کرخنگی سے اپنا ماتھ اپنی بیوی کے

نازک کندھے پر رکھا اور کہا۔ ”مگر میں چاہتا ہوں کہ تم سمجھو کہ میں ان بے فکرے مردوں اور عورتوں کو ہر شام اپنے گھر میں بھرے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔“

”آپ ایسے ہی نہمان نواز تو ہیں۔“ عطیہ نے طعن سے کہا۔ ”اور تم تو ہمیشہ ان ہی لدقانونی کاخذاات یا

مختلف اخبارات میں دفن ہوئے بے ہتے ہو۔ اور میں تمہارے گھٹنے سے لگی بیٹی رکروں، اور تمہاری جرابیں

سیتی رکروں، کیوں ہے ناہی بات؟“

عطیہ! میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ قانونی دنیا میں نام پیدا کروں۔ اور پھر تمہارے لئے روپیہ کی ریل پل

کروں۔“

”ہاں؟ تو یہ سب میرے ہی لئے ہے؟ جی بجا کیوں نہیں؟“

”بیوی کے الفاظ سن کر جمال اس سے پرے ہٹ کر دور چلا گیا اور بولا غرتیں بڑی ہی کوتاہ عقل ہوتی ہیں۔“

”میں عورتوں کے بارے میں تمہاری اس رائے کے خلاف احتجاج کرتی ہوں۔“ عطیہ نے بیٹھے ہوئے

سردھری سے کہا۔

”اور ہاں کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بچوں کے سامنے یوں لڑا کریں؟“

”استغفر اللہ قطعاً ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں بالکل تم سے متفق ہوں۔“ وہ جھکا اور اس نے اپنے بیٹے

کے بل کھائے ہوئے بالوں کو چھوڑا اور بولا ”لو سچو اب اپنے اپنے بستروں پر جا کر سو رہو۔ وارا تم اور صفیہ تم بھی اپنا انجن لے لو“

”دیکھو جی یہ سگنل تو میرا ہے“

”جھوٹ جھوٹ یہ میرا تو ہے“

”اری بس کی گانٹھ کل تو تو نے اپنا سگنل توڑ ڈالا تھا“ یہ کہنے کے ساتھ دارا نے غصہ سے اپنا سگنل چھین لیا۔ بس پھر کیا تھا صفیہ لگی چیخنے چلانے اور سسکیاں بھرنے۔

”صفیہ! دارا! امت لڑو“ عطیہ نے یہ کہا اور اٹھ کر اپنی ننھی سی بیٹی صفیہ کو گود میں اٹھا لیا پھر بولی ”اوہ آؤ میرے بچو! کل تمہاری اتنا ماش کر کے سگنل مرست کر دے گی“

قبل اس کے کہ ماں بیٹی دوسری طرف جائیں۔ دارا نے اپنا کھلونا لے لیا اور اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر بولا ”ابا جان بھلا کیا یہ صفیہ ضد تن بس کی گانٹھ ہے کہ نہیں دیکھئے اپنا انجن اور سگنل تو کل توڑ پھوڑ ڈالا اور اب میرے کھلونے پر قبضہ جما بیٹھی۔ ڈھٹائی تو اس کی دیکھئے“

جب تنہائی ہوئی اور جمال اپنے بیٹے کو گود میں لینے کے لئے جھکا تو اُس کا چہرہ کسی قدر کمزور تھا۔ اور اُن نے بیٹے سے کہا ”اے میاں وہ غریب چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے۔ اس لئے تمہیں کو صبر و تحمل کی عادت ڈالنی چاہئے“

”ابا جان! وہ لڑکی ہے اسی لئے تو ضدی ہے۔ کیوں ہے نا؟“

اُس وقت اُس کی ماں کمرے میں داپس آگئی۔ اس کا باپ بولا۔ وہ ضدی نہیں ہے، دارا وہ ضرور تمہاری چیز تم کو دے دیتی، اگر تم ہی ذرا نرمی کا برتاؤ اس سے کرتے“

لڑکے نے برہمی سے تیوری چڑھائی اور بولا۔ ”لیکن میری بجائے وہی کیوں نرمی نہ برتے“ اس سوال پر اُس کا باپ یوں ہی سا مسکرا دیا۔

”اے بوڑھے بڑگوار دارا یہ ہم مردوں ہی کا حصہ ہے کہ نرمی برتا کریں“

”لیکن کہیں؟“ معصوم بیٹے نے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلاتے ہوئے جرات سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے بتکار کہا۔

باپ بولا ”بیٹے! نرمی اور مہربانی اچھی چیز ہے اور جب تم بڑے ہو گے تب تم کو یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ لو اب جاتو اور اگلے ہو سکے تو کل اپنی بہن کا انجن مرست کر دو“

قاتلہ لڑکیوں کے متعلق کچھ بڑبڑاتا اور لڑکیوں کی ضد اور انجنوں اور سنگنوں کی باتیں آپ ہی آپ کرتا ہوا
ماں کی طرف بڑھاتا کہ وہ اُسے پیارے۔ اور گو وہ ندامت سی تھی تاہم اُس نے اُسے پیار کیا۔ دآرا ماں سے پیار کے
اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہر ہتھم پر مخالفت اس کی حالت سے ظاہر تھی۔

بچے کا جانا تھا کہ عطیہ غضبناک ہو کر خاوند پر برس پڑی۔ اور بولی یہ کیا غضب ہے کہ تم ہمیشہ عورت ذات پر
ناک بھون چڑھاتے رہتے ہو؟ اور یہی تم ابھی سے اپنے بچے کو سکھا رہے ہو کہ وہ بھی تمہاری طرح عورت سے نفرت
کرنے لگے اور تم ہمیشہ بچے کو دکھانے ہو اور سمجھاتے ہو کہ نامراد عورتیں ہی بیوہ اور الٹی سمجھ کی ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی
تم نے یہی ثابت کیا ہے کہ نصیبوں چلی صفیہ ہی ضدی اور ذلیل ہے۔

”بجا! تو کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے؟“

”مجھے تو پتہ نہیں کہ تم نے کبھی اس بات کے جاننے کی بھی کوشش کی ہو کہ سنگل و حقیقت ہر کس کا؟“
جال یس کر کسی قدر تلخ ہنسی ہنسا۔ اور بولا ”میری پیاری عطیہ کیا یہ بھی کوئی سمجھ کی بات ہے کہ بچوں کے
سامنے یوں لڑا جائے؟“

”میں نے تو کوئی لڑائی نہیں کی ماں تم ہی ہو جو لڑائی مول لیتے ہو۔ اور یہ تمہارا قاعدہ ہے کہ تم خطا ہمیشہ
مجھ کو نصیب کی بتا کر کرتے ہو۔ میرے ملنے والوں سے تمہیں نفرت ہے اور یہ بات بھی تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ
میں کبھی ہنس بول ہی لیا کروں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بچوں کا خیال نہ ہو تو میں — میں تو تم کو باطل چھوڑ چھاڑ کر
کہیں کو محل گئی ہوتی“

”اور یہاں سے جا کر اپنی ماں کے پاس رہتیں کیا یہی بات ہے نا؟ جب اُس کے خاوند نے یہ فقرہ کہا تو
کہہ کر مڑا ہنسا بھی ”عطیہ! بھلا تم اپنے آپ کو کچھ کم سمجھتی ہو۔ ماشا اللہ تم ایک آتش فشاں پہاڑ ہو۔ میری تو خیر جب تم
اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھیں تو اُس سے تمہاری کیا بنتی تھی؟“

”بس جی بس! میرا تو آپ سے جی جلا ہوا ہے“ عطیہ نے چلا کر کہا اور تنہا سے آئے دن کے طعنوں سے سیر
چھلنی ہو چکا ہے اور تنہا سے عورتوں کے متعلق پرانے فرسودہ اور احمقانہ خیالات سے مجھے دلی نفرت ہے میں تو اب
یہ چاہتی ہوں کہ یہاں سے کہیں چلی جاؤں اور اپنے ٹکڑے کی آپ فکر کروں۔ آخر رزاق تو خدا ہے میں تو کب کی
سب کچھ کر گزرتی اگر بچوں کا پاس نہ ہوتا اور میں — میں تو آج ہی چلی جاؤں گی۔ بے بس میں تو اب جا کر سوتی ہوں“

یہ کہتے ہی وہ گویا کو دکر کرے سے باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زور سے کواڑ بند کرتی گئی۔

جمال کا نپتہ ہونے لائقوں سے اپنے قانونی کاغذات اٹھا کر قریب ہی کچھی ہوئی آرام کرسی پر دناز ہو گیا۔ امیدوار مسرت کی کیسی تباہی اور بربادی ہے! وہ اور عطیہ جو پوری والہیت سے ایک دوسرے کے بیماری تھے اب ان کا کیا حال ہے! عطیہ جس میں وہ تمام شوائی محاسن بجا انشا موجود تھے جو کہ کسی عورت میں خیال کر سکتا تھا کیسی سمجھدار اور خوش دل ہشاش بشاش اور ہمیشہ اور ہر حال میں اُس کی ہمدرد اور اس کے اشاروں کو سمجھنے والی تھی۔ اے اب کیا ہو گیا۔ ابتداء اُن کے باہم مل کر زندگی بسر کرنے کے کیسے کیسے دلہا ارادے تھے، جواب خاک میں مل چکے ہیں۔ جمال کو آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اپنی شادی کے ابتدائی ایام مسرت جو کشمیر میں بسر ہوئے تھے یاد آگئے۔ جھگرک کی طویل، خاموش، پر کیف چاند اتوں اور مسرت و سرشاری کے مختصر دنوں کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ اُس زمانہ میں کام کا کسے ہوش تھا۔ دنیا ہے یا جائے اک پیار کرنے والی عورت سب کا نعم البدل ہے۔ پھر اُسے وہ زمانہ بھی یاد آ گیا کہ اس جنتِ ارضی کی بے سودہ کس بے دلی کے ساتھ ممبئی میں اپنے کام پر واپس آیا تھا اور یہاں آکر انہوں نے اپنے لیے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ بیوی کی سلیقہ شعاری اور سلیم مذاق کے باعث ہر ایک بات دونوں کی طبیعت اور میلان کے مطابق انجام پاتی تھی۔ اس کے بعد اُسے اپنی بیوی کی تکلیف کی وہ گھڑیاں بھی یاد آئیں جب وہ اپنے پہلو ٹسٹ بیٹے اور بیٹی کی پیدائش پر موت کے پنجے سے بے شکل بچی تھی۔ اور پھر اس کی بتدیج آہستہ آہستہ شفا پائی، اور خود اس کا اپنی بیوی کی نہایت دلسوزی سے تیمارداری کرنا اور غربت وغیرہ غرض گذری ہوئی ایک ایک بات اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اس کے بعد دفعہ اُس کی بیوی کے مزاج میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ روپیہ اپنے مصارف کے لئے مانگنے اور نئے نئے طریقے اپنے دل بہلاؤ کے لئے ایجاد کرنے لگی۔ اور اس طرح آئے دن روپے کے سوال نے یہاں بیوی کے باہمی تعلقات میں ایک ناگوار تغیر پیدا کر دیا۔

عطیہ نے ایک گراموفون خریدا۔ اور جمال کو اس سے چڑھتی۔ اُس نے نہ صرف معمولی طور پر اپنی سیلیوں کے ساتھ نغمہ و سرود کی مجالس منعقد کرنی شروع کیں، بلکہ کھانے کے بعد روزانہ چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بلانا شروع کر دیا۔ جمال کو جمال نہ تھی کہ وہ ان لڑکڑوں کی شکایت کر سکے۔ وہ اسی طرح اپنے آپ کو اپنے دل بہلاؤ میں مختار سمجھتی تھی جیسا کہ اُس کے نزدیک جمال اپنے مذاق کی باتوں میں مختار تھا۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اُس کے ساتھ اب شاید نادانستگی میں آزادی کی ایک نئی ہوا بھی بیوی صاحبہ کے دماغ میں بھر گئی کہ بعض اوقات کسی قدیم تخی اور تندہی کے

ساتھ وہ اپنے خاوند کی معمولی سے معمولی بات کو بڑھا چڑھا کر رانی سے پہاڑ بنا دیا کرتی تھی۔ یہ روپیہ میرا ہے، یہ تو اُس کی روز کی بولی تھی۔ باہر کے لوگ جب اُس کے گھر پر نہ آتے تو وہ شوہر کے لئے معمولی رقم لکھ کر یا پیغام لے کر جہاں جہاں چاہتا چلی جاتی۔

اب تو یہ حال تھا کہ جمال کو اپنی بیوی کی زندگی میں کوئی حیات بخش عنصر دکھائی نہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بچے بھی میلا بیوی میں باہمی سر ہٹپٹول کا ایک خطرناک ذریعہ بن گئے تھے۔ اس لئے وہ کیا کر سکتا تھا؟ عطیہ اس کے پیشہ سے بھی ناراض تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند کام دام تو سب نہ کر کے لکھ لے اور اُس کے کھیل کود میں شامل ہو جائے۔ اور اس کے باوجود روپیہ دینے میں کمی نہ ہونے پائے۔ لیکن جمال کا اصولی طور پر یہ پختہ اعتقاد تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کا گھر اُس کی ذاتی سلطنت ہے۔ اگر اُس کے گھر پر ادھر ادھر کے بٹے ہوئے شرفا کی چڑھائی ہو تو کم از کم اس کی اجازت سے ہونی چاہئے۔

اسراف نے عطیہ کو بدل دیا۔ اُس کے لئے زندگی کے بعض عجیب مگر نئے دروازے کھل گئے۔ وہ خود توان میں بذوق و شوق داخل ہو گئی، لیکن اپنے خاوند کو تنہا حیرت زدہ اور بے چین کھڑا چھوڑ گئی۔ یہ سب باتیں تو ہمیں مگر جمال کو یقین تھا کہ یہ سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی اور یقیناً ہو جائیں گی، مگر اُس وقت جب اس کو مقدمات میں بڑی بڑی فیسیں ملنے لگیں گی۔ جمال کو اپنی ذات پر غیر محدود اور بجا بھروسہ تھا کہ اُس کی آمدنی ضرور ترقی کرے گی۔ اُس وقت وہ عطیہ کی ہر ایک فرمائش بجالایا کرے گا لیکن ابھی تو یہ بات میسر نہ تھی۔ جب زمانہ بدلے گا تو وہ اسے اپنے ہمراہ کہیں باہر لے جائے گا، اوریوں اُن کے لئے گویا ایک نیا دورِ سرست شروع ہو گا۔ یہی باہمی جھگڑے اور شکر رنجیاں جن سے اس کے دل میں گھاؤ پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ کدورتیں محض اُن کی زندگی کی سطح پر ہیں جو جلد ہی فراموش ہو جائیں گی۔

جمال تو اپنے ان خیالات کے سمندر میں تیر رہا تھا اور عطیہ اپنے بستر پر بیٹھی لباسِ شب زیب تن کر رہی تھی اور آپ ہی آپ غصہ اور اشتعال کی حالت میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے فرسودہ خیالات سے تنگ آ چکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی مہلک حالت شکایت اُس کی نوک زبان پر تھیں۔ ”اب میں ان بیہودگیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور میری ان مصیبتوں کی تلافی کوئی چیز جی کہ بچے بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس روز روز کی انتہا کھل سے نفرت کرتی ہوں اور میرا تمام اندوختہ اپنا غم غلط کرنے میں صرف ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ جمال نے تو روپیہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ ان باتوں کو پسند

نہیں کرتا اس لئے وہ روپیہ بھی نہیں دیتا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں بچوں کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ چلتے میں میری جوانی بغیر کسی تفریح و تفتن کے گزر جائے۔ سرکشی کا ایک طوفان اُس پر سوار ہوا اُس نے اپنا لبادہ اڑھا اور اٹھ کر ملقاتی کمرے کی طرف دوڑی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بگولے کی طرح اپنے خاندان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اُدھر دیکھو! اتم سے طعنے سنتے سنتے اور یہ دیکھ دیکھ کر میرا ہی لڑکا میرے اور اپنی بہن صغیہ کے مخالف ہو گیا ہے، میرا کلیجہ پک گیا ہے اور میں سخت بیمار ہوں۔ اس لئے بھی کہ میں بہت سست اور بے کار رہتی ہوں اور جب کچھ تفریح کرنا چاہتی ہوں تو بڑے الفاظ سنتی ہوں، ایسے کل یہاں سے رخصت ہوتی ہوں۔

حال نے کہا میں خود بچے کو ہمراہ لے کر پونا جا رہا ہوں۔ تم بھی کسی قدر خستہ ہو چکی ہو۔ یہ تبدیلی تمہارے لئے بہتر ہوگی۔
”میں بہتری ہی کے لئے تو یہاں سے جا رہی ہوں“ عطیہ نے باختصار کہا۔

”کیا تم دیوانی ہوئی ہو“

”میں کیوں دیوانی ہوئی بالکل تندرست اور باہوش ہوں لیکن اب میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔“
”مجھے تم خارج از بحث سمجھو۔ مگر کیا سچ مجھ تمہارا یہ ارادہ ہے کہ تم اپنے بچوں کو چھوڑ دو گی محض اس لئے کہ ہم میں کچھ شکر رنجیاں ہیں۔“

”نہیں“ عطیہ گرج کر بولی۔ ”اس لئے نہیں کہ ہم میں بعض شکر رنجیاں ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ میں بیمار ہوں۔ سخت بیمار۔ اور میری بیماری تمہارے ہر وقت کام میں لگے رہنے اور تمہارے طعنوں اور میری اپنی بے کاری و سستی اور زندگی کی خوفناک یکسانیت کے باعث جو تم میرے لئے تجویز کرتے ہو بڑھتی جائے گی۔“

”میں اب تک ایک بہت بڑے اور نہایت مشکل مقدمہ کے لئے تیاری کر رہا تھا۔“ جمال نے نرمی سے جواب دیا۔
”جی ہاں! اتم تو تعطیلات کے موقع پر بھی اس سال یونہی لگے رہے تھے۔ تم خود تو کسی تفریح میں شامل ہوتے نہیں البتہ ہر ایک چیز پر طعنہ زنی کرتے رہتے ہو۔“

”میں بے کاروں اور بے فکرؤں کی طرح راتوں کو موٹروں پر ادھر ادھر مارا مارا نہیں پھر سکتا۔“

”بہت اچھا۔ تو میں تو یہی کروں گی۔ لو بس میں جاتی ہوں۔“

”جانی کہاں ہو؟ باب جمال کا چہرہ بالکل سفید اور سخت ہو گیا اور اُس پر شکنیں پڑ گئیں۔ مگر باوجود اس کے اُس کی آواز اُس کے قابو میں تھی۔“

”مجھے نہیں معلوم شاید پہلے لیٹی کے پاس جاؤں“
 ”یہ تو وہ عورت ہے کہ میں ابداً روادار نہیں کہ تم اُس کے پاس ٹھہرو“
 ”نہیں میں اس کے پاس نہیں ٹھہرتی لیکن میری پیز اسے کہ تم کیا خیال کرتے ہو کیا نہیں کرتے۔ وہ میری دوست اور سہیلی ہے۔“

”یادشمن؟“
 ”نہیں وہ تو دشمن نہیں البتہ تم میرے دشمن اور جان کے لاگو ہو“ عطیہ نے وحشیانہ طور پر چیخ کر کہا۔ ”ذرا خیال تو کرو میرے دوستوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں کہتے ہو میں لیٹی کو چاہتی ہوں مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میری دوست ہے۔“
 ”اے کوئی قابلِ رشک شہرت حاصل نہیں“
 ”بالکل جھوٹ ہنید جھوٹ۔ چند بے شعور اور حاسد لوگ ایسی ایسی افواہیں اڑا رہے ہیں۔ لو میں جاتی ہوں میں تو کل کو یہاں سے چلی ہی جاؤں گی۔“
 ”یہ کہہ کر عطیہ جھپٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور غریب جمال پھر دوبارہ اپنی آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ یقیناً یہ بہت بیہودہ بات تھی۔“

شاید یہ بات غیر صحیح تھی کہ عطیہ محض چند بے معنی شکر رنجیوں کی بنا پر اس کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی تھی۔ مگر کیا اسے اپنے قانونی پیشہ کی بنا پر یہ تجربہ حاصل نہ تھا کہ تقریباً روزانہ بعض احمق نوجوان عورتیں اپنے فائدوں کو بغیر کسی معقول وجہ کے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ معاہدہ ایک خیالِ بکلی کی طرح اس کے دل میں چمک گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے تو جمال اس خیال سے ادھ مواسا ہو گیا۔

اس کے ایک لمحہ بعد تیزی سے اپنی بیوی کے کمرے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ اُس نے بلاتا مل اُس کے کمرے کے کواڑ کھول دیئے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی برش ہاتھ میں لئے کسی خیال میں گم ہنسی ہے ”عطیہ! یہ کہہ کر قدم بڑھاتا ہوا وہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اور ایک ایسی آوازیں جو اس کی بیوی نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی بولا۔“
 ”کیا تم میں اور مجھ میں کوئی اور شخص تو روک نہیں ہو گیا؟“
 ”اُس کی بیوی نے تقریباً بتم کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ کر کہا: ”اس ستم ظریفی کا شکریہ۔ میری ہتک کے لئے کچھ اور کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی اٹھانے رکھنے؟“

عطیہ کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جس سے اُس کے خاوند کو یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا حرف درست ہے اس خیال سے جو فوری اور اچانک احت اُسے حاصل ہوئی اُس نے ایک لمحہ کے لئے تو اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ وہ اپنے بڑے اور مضبوط بازوؤں میں اسے لے لے اور اپنے سینے سے بھینچ کر لگا لے، مگر ایک طبعی شعور نے اُسے فوراً متنبہ کر دیا کہ یہ طریقہ برتنا موزوں نہیں۔ دل میں یہ خیال گزرنے کے ساتھ ہی وہ بولا۔

”تو پھر تم دیوانی ہوئی ہو جو کہتی ہو کہ مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟“

”نہیں صاحب میرے ہوش بجا ہیں۔ کم از کم اتنی باموش تو ہوں جتنے آپ کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتے بس بس یہاں سے آپ تشریف لے جائیے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ یہاں آئیں اور آسمان سر پر اٹھائیں۔ واہ یہ بھی کئی بات ہے۔ اور نہیں تو اتنی مہربانی تو کیجئے کہ میرے کمرے کو میرے ہی لئے سنبھال دیجئے۔“

”میں تو خود اسے چھوڑ کر جانے کو ناپسند کرتی ہوں لیکن میں اسے ایک سبق دینا چاہتی ہوں۔“ عطیہ اپنے زانوؤں پر بیٹھ کے ہوئے ایک سیلی کو خط لکھ رہی تھی۔ ”میں اماں خاں کے زمانہ کی کہنہ اور پھوہڑ عورتوں میں سے نہیں ہوں، جو ہم پر تو طعنہ زنی کرتی ہیں لیکن خود کسی ایک مرد کی بھی دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اسی لئے میں اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ لیکن برخلاف اس کے سچ تو یہ ہے کہ وہ میری رگ رگ اور ذرہ ذرہ میں سما یا ہوا ہے۔ مگر اس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ میری ہر ایک تفریح اور کھیل سے بے کیف رہتا ہے اور اتنا برا مناتا ہے کہ اُسی تو بہ۔ تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ دیوالی آؤں یا کسی دوسری جگہ کا نام لیا تھا۔ بہ حال اب میں دو ہیمنوں کے لئے آزاد ہوں۔ اور خدا کا شکر اپنی ننہائی مبارک ننہائی کے لئے ادا کرتی ہوں۔ اور وہ بھی سمجھ تو جائے گا۔ خدا اس کو برکت دے۔ جس وقت اُسے گھر کا انتظام آپ کرنا پڑے گا اور بچوں کی نگرانی بھی کرنی پڑے گی تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا۔ میں خوشی سے اُسے معاف کرتی ہوں اُسے میرے پیارے خدا میری مدد کر۔ میری ازدواجی زندگی کو آسمان کر۔ لیکن ہائے ہائے۔ اے دیکھو تو سہی یہ مرد دے کس قدر جنت میں؟“

عطیہ نے اپنے خط کو سرسبز کر کے بند کر دیا تو مینا کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

”بانو! میاں دارا اب سے دُور کچھ علیل تو نہیں ہیں۔ مجھ سے تو انہیں دیکھا سنیں جاتا۔ کیا آپ آتی ہیں؟ جب میں کھانا کھا کر اُن کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ پکیپا ہے تھے۔ اور اُن کا ماتھا تو بہت ہی گوم ہے۔“

عطیہ یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور دفعۃً اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

”کیا کستی ہے ری مینا! انیس وہ بیمار نہ ہو گا۔ ابھی وہ چائے کے لئے نیچے آیا تھا تو بالکل بھلا چڑکا تو تھا۔“
 ”جی ہاں بیوی! وہ دن پھر تو ماشاء اللہ اچھے خاصے تھے“ کھلائی مینا نے کہا۔ ”پر ابھی ابھی کچھ مزاج خراب ہوا،“
 میں جانوں بہتر تو یہ ہے کہ فوراً ڈاکٹر صاحب کو بلا لیں۔“

عطیہ نے اپنے بستر پر دماں ہو کر دوسری طرف کے ہوئے ٹیلیفون کا رسیور ”سنبھالا اور کہا۔“ نہیں میں نہیں،
 مینا تم ہی ٹیلیفون پر ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ اور کہو کہ فوراً یہاں آجائیں۔ اور میں دارا کے پاس جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تو
 ددڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور بچوں کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کا ننھا سا معصوم بچہ بار بار کربٹ اضطراب سے
 کر دٹیں بدل رہا تھا اور تنہائی میں یوں بول رہا تھا۔ ”مینا! یہاں آؤ مجھے پیاس لگی ہے۔ اری مینا میرا سر بھٹا جاتا ہے
 مجھے پانی دو پانی۔“

ماں کو تو گویا وہ جانتا ہی نہ تھا۔

”بیمیری جان، یہ دیکھو تو تمہاری امی یہاں ہے۔ قربان ہو گئی، واری گئی امی! میرے بچے اتنی ہمتیں پانی
 پلائے گی۔“

بچے نے بڑی چابھت سے پانی پیا اور پھر بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اور نا طاقتی میں پڑا کر اہٹار ہا۔
 کھلائی واپس آگئی اور بولی ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں۔ ماں میں غریب صغیر کو تو آپ کے بستر پر سلا دوں خدا
 نخواستہ کوئی متعدی مرض نہ ہو۔“
 عطیہ نے اپنے لڑکے پر جھکے جھکے ہی رضامندی کے لئے سر ہلادیا۔ اور کھلائی صغیر کو جو وہیں اپنے بستر پر سو رہی تھی اٹھا
 کر باہر لے گئی۔

ڈاکٹر آیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی ہی دیر میں آیا ہے۔ بچے کا معائنہ کیا اور پھر عطیہ کو مخاطب ہو کر عرض کر کہا۔ کان کی
 تکلیف ہے۔ میں ایک دوسرے آدمی کو اس کی نگرانی کے لئے کل لے کر آؤں گا۔ یہ دوائی تو آج شب کو پلائیے اور زس کا
 اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔“

”یہ کان کی تکلیف کیا ہے۔ کہیں کان میں کوئی پھوڑا پھنسی تو نہیں؟“

میں صبح تک تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ماں مجھے امید ہے کہ بچہ اچھا ہو جائے گا۔ آپ کے میاں کہاں ہیں؟
 ”ڈرانگ روم میں۔“

ڈاکٹر چند ضروری ہدایات اور مہر روانہ الفاظ کہنے کے بعد جمال کے پاس چلا گیا۔ اور اُس سے کہنے لگا
 کان کے پیچھے ایک خطرناک قسم کا پھوڑا ہے۔
 ”آپ کا مطلب کیا ہے؟“ جمال نے کہا۔ اور اُس کا چہرہ بے رنگ اور ستا ہوا تھا۔

”مجھے توقع ہے کہ یہ پھوڑا بڑھے گا نہیں میں نے زس کو سمجھا دیا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن اگر آپریشن
 کی ضرورت ہی پڑی — ممکن ہے کہ آپریشن کسی قدر گہرا بھی ہو۔ میں صبح غور کروں گا اور صبح سویرے ہی حاضر ہوں گا“

دوسرے دن تو دارا کی حالت بہت ہی خراب تھی اور غیر معمولی تعبیل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا کہ آپریشن ہی ضروری
 ہے۔ پھر کیا تھا آن کی آن میں ڈاکٹر اور زسیں گھر میں بھر گئیں۔ کیونکہ عطیہ اس بات پر بالکل راضی نہ تھی کہ اُس کا بچہ
 شفا خانے میں جائے۔ صفیہ اپنے کھلنڈرے ساتھی کو یوں اچانک کھوکھو کر کچھ پریشان سی ہوئی۔ مگر اتنی ہی جتنی کہ ایک
 ننھی بچی ایک معصوم کے لئے ہو سکتی ہے۔

دارا کی حالت دم بدم بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے ماں باپ اس فکر و اندیشہ سے بے حال ہوئے
 جا رہے تھے کہ کیا یہ بچہ اُن سے چھن جائے گا۔ عطیہ کے دل میں کئی بار خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کے بازوؤں
 میں گر پڑے، لیکن اس کے مضبوط مگر پریشان چہرے پر ایک نظر کر کے وہ اپنا دل اُس کی طرف سے پھرنے لگتی تھی۔
 بعض اوقات تو اُس نے جمال کے یوں مردہ دلی اور بے جگری سے اس کمرے میں آنے پر بھی برا منایا اسے یہ خیال
 بھی بار بار آتا تھا کہ یہ شخص کوشش کرتا ہے کہ اس معصوم کو عورتوں کا مخالف بنا ڈالے۔ اور یہی ہمیشہ بیچاری صفیہ
 کے مقابلے میں لڑکے کی طرف راہی کرتا ہے۔ غرض اس کی فکر مند یوں نے اُس کی نفرت کو اور بڑھا دیا۔ اور جمال بھی ان
 باتوں کو دیکھ رہا تھا اور امنوس کے ساتھ اپنے بچے کی حالت اور کام کی کثرت سے گھلا جا رہا تھا اُس کے ہونٹوں پر مہر سی
 لگ گئی۔ اُس نے بیوی کی طرف کوئی میلان ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ یہ باتیں بے کار تھیں۔

آخر کار وہ دن بھی خدا خدا کر کے آیا کہ میاں دارا کمزور و نفعیہ لیسے کہ جسم میں خون کا ایک قطرہ نہ تھا چند منٹ کے لئے
 اپنے کبلوں میں لپٹ لپٹائے بستر پر ہی ٹیٹھ گئے۔

”ماشا اللہ اب تو ہمارے بڑے میاں“ تم اچھے ہو رہے ہو“ صبح کو ناشتے سے کچھ ہی پہلے اُس کے باپ نے کہا۔
 ”آبا جان! تو کیا میں کل نیچے چل سکوں گا؟“

”نہیں بھئی کل تو نہیں پرسوں شاید۔ اور میں تمہیں خود اپنی گود میں اٹھا کر نیچے لے جاؤں گا۔ ہے نا؟“

”نہیں اباجان! میں خود چل سکوں گا۔“

”اُس کا باپ ہنسنا اور بولا: ”کیا تم چل سکو گے بہت اچھا ہم بھی دیکھیں گے۔“

دارا نے پوچھا: ”کیا صفیہ میرے انجن کے ساتھ کھیل رہی ہوگی؟“

”اُس کے باپ نے مسکرا کر کہا: ”بھئی تم اچھے تو ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے وہ ضرور کھیلتی ہوگی مگر تم اس کی

پر روانہ کرو۔“

اتنا کہہ کر جمال اپنی بیوی کی طرف ہمدردی و صفائی کے لئے دیکھا کیا۔ لیکن وہ دارا پر جھکے ہوئے اُس

کے ارد گرد کے کھلونوں کو درست کرتی رہی۔

”دیکھتے جاؤ پھر دارا کو صفیہ کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔“ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ ”اب جو نبی کہ دارا

تندرست ہوا وہی پرانے جھگڑے پھر زندہ ہونگے۔“

جمال اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر گزشتہ فکر و تردد کے تین ہفتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا عطیہ نے اُس کو

چھوڑ کر چلے جانے کی احمقانہ دھکی کا خیال اپنے سر سے نکال دیا ہے؟ اب تو اُس نے بھی جی میں ٹھان لی تھی کہ اپنی بیوی

کو دکھائے کہ اب وہ ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے سرسری طور پر ایک مسودہ بھی تیار کر لیا تھا وہ کھا

دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قول کے مطابق عمل کرنے کو تیار ہے۔ اور پھر جب بھی عطیہ نے اپنی گفتگو شروع کی وہ فوراً یہ

تحریر اُس کے سپرد کر دے گا۔

آہ! اُس کی حسینہ و جمیلہ پری و ش عطیہ! وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اُس کی تصویر کو جو کمرے میں آویزاں

تھی ایک وارنگل کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے اتنی سختی کرے گا؟ کسکے گا؟ یا وہ حد سے

زیادہ نرم تھا اور ابھی اسے اور نرم اور ملائم ہونے کی ضرورت تھی؟ وہ اسے اپنے محبوب ننھے بچے کی نگرانی اور

مستل تیمارداری میں فداکارانہ مصروف دیکھ کر پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگا تھا۔ لیکن جھگڑوں کو چکا یا کس طرح

جائے؟ اور عورتوں سے نبہانے کی صورت کون سی ہے؟ وہ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق جب عطیہ اُس کے پاس نہ ہوگی

غور کر رہا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر جینا ناممکن ہے حتیٰ کہ عطیہ کے ننھے ننھے خیالات اور اُس کے حد سے

بڑھے ہوئے غصے اور نئی نئی آزادیوں کے باوجود وہ ہر طرح اُس کی محبت میں مبتلا اور ثابت قدم تھا۔ وہ اس کی

زندگی بخش آواز، اُس کی نازک و دلکش ہنسی، اس کے حسن اور نرم و فراست کا شیدائی تھا۔ عطیہ کی یہ رکھائی اور اکھڑیں

تو بعد میں اُن کی مسرور زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ اُس نے بتکرا اپنے دل میں اُس ناچاقی اور اس کے اسباب پر غور کیا جب کہ نے ان کی مسرتوں کے ساز کو بے آواز کر دیا تھا لیکن اس درز کو بند کرنے کی کوئی تدبیر بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اس دوران میں عطیہ بھی اپنے خاوند کی اس ہلکی طعن آمیز ہنسی پر غور کر رہی تھی جب کہ اُس نے دارا سے کہا تھا کہ ”تیس سمجھتا ہوں کہ صفیہ ضرور تمہارے انجن سے کھیل رہی ہو گی“ اُس کی نفرت کا بھٹنا ہوا شعلہ دوبارہ بھڑک اٹھا۔ اُسے عورتوں کے متعلق اس بے حیرانہ بولی ٹھوکی اور نیم ستوہانہ ”آواز کے سننے سے نفرت تھی۔ اس لئے اب جیسا کہ طے ہو چکا تھا وہ اپنی دوست لیلیٰ کے پاس جانے پر آمادہ تھی جس نے اُس کے آنے کے ارادے پر مبارکباد کی تھی اور جس نے اس خلیج کو جو خود عطیہ نے اپنے اور اپنے میاں کے درمیان پیدا کر لی تھی اور وسیع کر دیا تھا اتنے میں اُس کے بیٹے نے پکارا ”اتنی جان! کیا صفیہ اگر میرے ساتھ کھیلے گی؟“ دارا کی آواز ٹھکی ہوئی اور خشکی لئے ہوئے سنائی دی ”ہاں میرے بچے! قربان گئی! اتنی! کیوں نہیں وہ ضرور کھیلے گی اور اس سے تمہارا دل بہلے گا“

عطیہ نے صفیہ کو بلایا اور کہا ”میری بچی بیٹھے بیٹھے کوئی اچھا سا کھیل کھیلو جس میں شور نہ ہو اور نیچے اوپر دوڑتی نہ پھرو کہ اس سے تمہارے بھائی کے سر میں درد ہونے لگے گا۔ اتنی کو اب چند خط لکھنے ہیں وہ جانتی ہے اور ابھی دسپا آکر پیار کرے گی“

عطیہ نے یہ کہہ کر صفیہ کو ایک چھوٹی سی کرسی پر اُس بڑی کرسی کے سامنے جس پر میاں دارا کپڑوں میں لپٹے لیٹائے بیٹھے تھے بٹھا دیا اور خود بیڑھیوں سے اتر کر اپنے کمرے میں خط لکھنے کے لئے چلی گئی۔ وہاں جا کر اُس نے لیلیٰ کو تو یہ لکھا کہ وہ آئندہ دو شنبہ کو آتی ہے اور جمال کے لئے اس مضمون کا ایک مختصر رقمہ لکھا کہ وہ پونا جا رہی ہے اور موسم سرما وہیں گزارے گی۔ اور واپس صرف اُسی وقت آسکتی ہے کہ جمال نذر چھوڑ کر اپنے موجودہ رویہ کو بالکل بدل دے۔ مینا بچوں کی نگرانی کرے گی کہ وہ ان کی بچارن ہے۔ لیکن اگر سچ پوچھتے تو نہ تو میاں بیوی اور نہ بچے ان مسلسل ہنگاموں کے لئے تیار تھے۔

اُس کا خط تمام ہو گیا۔ وہ ”نرسری“ میں گئی کہ صفیہ کو وہاں سے لے کر سلا دے۔ مینا نیچے اپنے کسی ضروری کام میں لگی ہوئی تھی۔ نرسری میں صرف بچے ہی تھا تھے عطیہ نرسری کی طرف تاریکی میں سے ہو کر گئی۔ اور قبل اس کے کہ کمرے میں داخل ہو دو دفعہ صفیہ کی یہ آواز سن کر جہاں تھی وہیں ٹھم گئی۔

لو آؤ اُمی جان اور ابا جان والا کھیل پھر کھیلیں۔ مجھے تو وہ کھیل بہت ہی اچھا لگتا ہے۔
دارا مانڈگی کے ساتھ سنبھلا۔

یہ خیال کر کے کہ یہ بچے کیا کھیل کھیلے ہیں۔ عطیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

”بہت اچھا“ دارا نے کہا ”تو اب کس طرح شروع کریں؟“

”ایسے ہی جیسے کہ کھیلی دفعہ امی جان اور ابا جان میں ہوا تھا“

صفیہ نے سر ہلایا اور بولی ”ہاں تم گھنوں نے بنو اور میں ناراض ہو گئی، خوفناک ناراض۔ اور چیخ چیخ کر آواز

بکالوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے تیور بدل لئے۔ اور غصے سے اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

عطیہ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جب اُس نے صفیہ کا چہرہ دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ اُس نے

حیرت زدہ ہو کر قدم پیچھے ہٹا لیا۔

”جہاں تم نے مجھے کبھی سکھ نہیں دیا تم تو کہیں کے وحشی درندے ہو“

”میری جان عطیہ!“ دارا نے پورے طور پر اپنے باپ کی نقل اتارتے ہوئے متبسم ہو کر اپنی بھینوؤں کو

اٹھانے کے بعد کہا ”کیا میں نے کبھی تمہاری کسی فرمائش کو رد کیا ہے؟ تم عورتیں بھی عجیب ناشکر گزراہوتی ہو۔“

”بس رہنے دو۔ تم ذرا ذرا سی چیز لانے سے تو انکار کر دیتے ہو۔ تم تو بس ایک درندہ ہو۔ میرا تو تم سے جی

جلتا ہے۔ تم کبھی ”انسان“ نہ بنو گے۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ میں تو اس وقت کو روتی ہوں جب میں نے تم

سے شادی کی تھی۔ کاش نہ ہوتی!“

صفیہ گرم ہو ہو کر اٹھتی تھی اور زسری کے فرش پر اچھل اچھل پڑتی تھی اور کہتی جاتی تھی ”تم وحشی ہو

وحشی۔ تمہارے خالے ہی ختم نہیں ہوتے۔ نہیں معلوم تم ایسے جانور میرے پلے کہاں سے پڑ گئے؟“

”میری پیاری عطیہ تمہیں بتاؤں اس سے زیادہ تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں“

”کرنا چاہو تو بہت کچھ“ صفیہ نے چیخ کر کہا ”میں تو ہر رات نئی نئی تفریحیں، نئے نئے کھیل قسم قسم کے

گراموفون باجے چاہتی ہوں۔ لیکن میں تم سے سیر ہو چکی ہیں۔ تم نے تو تم سے بھر پایا۔ میرے لئے تو تم ایک خوفناک

مصیبت اور مصیب بلا ہو۔ میں تو اب یہی دعا کرتی ہوں کہ تمہارا جنازہ اٹھے۔ کسی کی آنی جال بندے تم کو آئے۔

جیسا تم نے مجھ کو جلایا ہے“

دارا نے آہ بھری اور تھک کر کمزوری سے تیچھے کو جھک گیا اور پھر کسی قدر گہری ٹھنڈی سانس بھری۔

”اب بولتے کیوں نہیں۔ کیا منہ کوتالے لگ گئے ہیں۔“ صفیہ نے بھر کر کہا۔
 ”افوہ! عطیہ میں تو متیں سمجھاتے سمجھاتے بے جان ہو گیا۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں
 ابھی اپنے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔“

عطیہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ صفیہ کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔
 ”بچو یہ سونے کا وقت ہے۔“ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ لیکن اُس کی آواز میں ایک ترعنا
 لرزش پائی جاتی تھی۔ اور دارا کے چہرے پر نکاح اور شنگی کی علامات ہوید اٹھیں جو باطل اس کے مشابہتیں جو
 اکثر جمال کے چہرہ پر ہویدا ہو جایا کرتی تھیں۔

عطیہ کے لئے یہ ایک اچانک انکشاف تھا۔ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ ایسا روشن اور صاف سبق آج تک کسی
 عورت کو نہیں ملا تھا۔ اُس پر یہ بات باطل واضح ہو گئی کہ اُن کے آپس کے جھگڑے میں خطا کس کی تھی عطیہ کے لئے
 یہ ایک روح فرسائدہ اور ایک جانکاہ حادثہ تھا کہ صفیہ بیماری کے مائے صابر و شاکر دارا کو گالیاں دے دے
 کر آپ مزے لے رہی تھی۔ جب اُس نے صفیہ کو گود میں اٹھایا تو اُس نے دارا کو آہستگی سے یہ کہتے سنا
 کہ لڑکیاں بڑی وحشی ہوتی ہیں۔ یہ بات عطیہ پر صادق آتی تھی۔ وہی جمال کے لئے وحشی بنی ہوئی تھی۔
 وہ جمال جس سے شادی کرنے کی اُسے اس قدر آرزو اور تمنا تھی اور جو غریب اپنی جان مارا کر اُس کے
 لئے کام کرتا تھا اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ہر وقت اپنے ہی کو قصور وار سمجھتا تھا۔

اسے خیال آیا کہ کیا اس کی دوست لیلیٰ خوش تھی؟ اس نے تو اسے کبھی شاد نہیں دیکھا جب سے اُس نے
 اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کی ہے اور وہ بھی بلا کسی معقول وجہ اور سبب کے وہ کبھی خوش نہیں ہوئی۔

کسی چیز نے نامعلوم طور پر اُس کی انسانی محبت میں ایک جوش سا پیدا کر دیا جس نے عطیہ کے گہرے روحی
 زخموں کو یک دم سحرانہ طور پر مندمل کر دیا۔ اسے اپنے بیمار بچے دارا کے چہرے پر باطل جمال جیسی گھبراہٹ اور پریشانی
 کے آثار نظر آئے اور اُس نے دل میں سوچا کہ وہ کیا غضب کرنے والی تھی کہ اپنے جمال، اپنے شوہر اپنے
 قابل رشک شوہر کو چھوڑ جانا چاہتی تھی۔ اس خیال کا آتما تھا کہ اُس نے جھٹ پٹ صفیہ کو مینا کی گود میں بے
 کردار آکھڑے ہی پیار سے بوسہ دیا اور پھر نہایت تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صفیہ کے الفاظ اس کے کان میں گونج رہے تھے کڑاٹی جان تم ناراض تو نہیں کہ میں تمہاری طرح ناراض ہو رہی تھی۔ اور مینا کے بے کیف چہرے نے اُس کے دل میں ایک اور درد پیدا کر دیا۔ وہ آرام کرسی پر بے اختیار گر پڑی اور سسکیاں لینے لگی۔ ایسی سسکیاں جو اُس نے اپنی عمر میں کبھی نہ سنی تھیں..... آخر کار..... بے حالی میں لرزتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھی اور اُس نے اپنے منہ پر پانی ڈالا اور آنسوؤں کو خشک کیا اور اس کے بعد آہستگی سے اپنے خاوند کے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

”عطیہ کیا تم ہو؟“ اُس نے بغیر دیکھنے کے کہا۔

”ہاں جال میں ہی ہوں“

وہ اٹھا اور اُس کی نگاہ کاغذوں پر چھکی ہوئی تھی۔ ”میں نے ایک تجویز کی ہے کہ جب تم باہر ہوگی تو میں تمہارے اخراجات کے لئے کس قدر روپیہ دے سکوں گا۔ اُس نے آہستگی سے کہا اور میں — عطیہ؟ ہیں یہ کیا؟ جب اُس نے اس کے چہرے کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہ نہایت پژمردہ اور افسردہ ہو رہا ہے وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اُس نے کہا ”کیا دارا کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟“ اور اس کی آواز میں فکر مندی کی علامات نمایاں ہو گئیں۔

”نہیں جال! لیکن میں — میں —“ وہ اپنی باہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھی اور ان کو مضبوطی سے اس کی گردن میں حائل کر دیا۔

”ہائے جال! جال! جال!“ اس نے کہا اور سسکیاں لیتی ہوئی اس کے اور قریب ہو گئی۔

”میرے پیاری میری جان!“ جال نے آہستہ سے کہا اور زور سے اُس کو اپنے گلے سے لگالیا۔ اور کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ مطمئن تھا کہ ایک فوری راحت اُسے مل گئی ہے، اور وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننے کی پروا ہی کرتا تھا کہ عطیہ میں تغیر کیسے پیدا ہوا۔

”جال! ہیں ہی اب تک تمہارے لئے وحشی بنی رہی“

”اور میں بھی کچھ کم احمق نہ تھا“

”اب تو تم مجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ کیا جادو کر دو گے؟“ نادان عطیہ نے پوچھا۔

جال نے کہا ”میں نے تو کبھی بھول کر بھی یہ ارادہ نہیں کیا کہ تم کو، اپنی نادان بھولی زندگی کی فیتہ کو اپنے سر جادو کر دوں“

غزل

نہ میں زمیں کے لئے ہوں نہ آسماں کے لئے
 ہوا ہوں خلق ترے سنگِ استاں کے لئے
 بشر کے دم سے کون و مکان کی آرائش
 کچھ ہے نقشِ یہ تزیینِ وہاں کے لئے
 مرے بیانِ وفا پر نہ عتاب سے کام
 کیا ہے ذکر ترا حقِ داستاں کے لئے
 فدا ہوا ہوں میں تجھ پر کہ عیش میں کاٹوں
 فنا ہوا ہوں میں آرامِ جاوداں کے لئے
 بہارِ گلشنِ ہستی میں جی نہیں لگتا
 خبر نہیں کہ میں بے تاب ہوں کہاں کے لئے
 ہوائے الفتِ منزلِ اڑائے چل مجھ کو
 مثالِ گردِ پریشاں ہوں کارواں کے لئے
 مزارِ افسرِ بے کس زمیں پہ رہنے دو
 کوئی جگہ تو رہے دورِ آسماں کے لئے

پھلاوہ

فیروز نے اخبار ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا ”آج اس میں میرے ایک دوست کے انتقال کی خبر ہے۔ میں نے اُسے صرف ایک دفعہ دیکھا ہے مگر وہ اکثر میرے خیال کی آنکھوں کے سامنے رہا ہے۔ کیا خوب آدمی تھا! رات کا وقت تھا اور گاڑی راولپنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ میں ایک اول درجہ کے کمرے میں تھا اور میرا ایک ہی ہم سفر کہیں راستے میں اتر چکا تھا۔ تنہائی مجھے ناگوار نہ تھی کیونکہ اب میں جس قدر چاہتا پھیل سکتا تھا اور نرم نرم گدیوں پر مجھے دعوتِ استراحت دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے لمپ بجا دیا، اپنا اوور کٹ اوڑھا اور اعلیٰ ناک کا ایک لمبا سانس لیتے ہوئے دراز ہو گیا کہ اب وہاں کوئی نہ تھا جسے میرے پاؤں پھیلانے سے تکلیف ہوتی۔

”گاڑی اب ایک وسیع میدان میں سے گزر رہی تھی۔ انجن پوری رفتار پر جا رہا تھا اور میرا کمرہ کسی پرانے کیے کی طرح ہچکولے کھاتا رواں تھا۔ یہ ہچکولے مجھے اپنے کندھوں کے بل پر آگے اور پیچھے مسلسل جنبش دے رہے تھے، سر کے اوپر میرے سوٹ کیس میں سے ایک باریک آواز نکل رہی تھی، کھڑکیاں کھٹ کھٹ بج رہی تھیں اور ہیمپوں اور برکیوں سے ہولناک چیخوں کی سی آواز آرہی تھی۔ لیکن جونہی کہ میں نے آنکھیں بند کیں اس شور کی نے مجھ پر چھانے لگی، میں اپنے آپ کو پھر بچپن کے زمانے میں پانے لگا اور مجھے اپنی کھلائی کی لوری کی شیریں آواز آنے لگی۔

”انہیں مہمل خیالات میں مجھے نیند آگئی۔ گاڑی چلتی رہی اور اُس کا شور میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

یہ ایک کمرے کی فضا متغیر ہو گئی اور میں جاگ اٹھا۔ میرے منہ کے قریب تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو کمرہ بدستور خالی تھا اور میرے سامنے والا دروازہ بھی بند تھا۔ مجھے پھر نیند آرہی تھی کہ رات کی سرد ہوا کا ایک اور تھپیڑا اگر مجھے لگا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو میرے سر کی طرف کا دروازہ چوہٹ کھلا تھا اور فرش پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کے پاؤں پائیدان پر تھے۔

”میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میرا دماغ ابھی نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ سب سے پہلے مجھ پر متوہمانہ خوف سا چھا گیا۔ کیونکہ پوری رفتار سے جاتی ہوئی گاڑی میں یہ ایک کسی انسان کے ظاہر ہونے پر یہی

خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی ٹھوٹ ہے۔ پھر مجھے گاڑیوں میں آگھسنے والے لیٹروں، اچکوں اور خنیوں کا خیال آیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں اور گو میرے اور دوسرے مسافروں کے درمیان صرف ایک لکڑی کا تختہ حائل ہے لیکن میں کسی ذریعہ سے بھی اُن کو اپنے خطرے سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے!

حفاظت نفس کے جذبے سے مجبور ہو کر میں اُس پر ٹوٹ پڑا اور اپنی کنبیوں اور گھٹنوں سے لے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا لیکن دروازے کو بے تحاشا پکڑے رہا، اور میں اُس کی گرفت ڈھیلی کر کے اُسے باہر پھینکنے کی سعی میں مصروف رہا۔ اس میں شک نہیں کہ میں ایک محفوظ جگہ پر کھڑا تھا اور مجھے یہ فوقیت حاصل تھی۔

”خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں کوئی نصرت نہ پہنچاؤں گا!“ یہ الفاظ اُس نے ایسی لجاجت سے کہے کہ مجھے اپنے سلوک پر شرم آگئی اور میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ناہیتا کا نپتا وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے وہاں سے ہٹ کر لمپ روشن کر دیا۔

”اس کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہے۔ وہ ایک غریب کسان تھا اور اُس نے موٹے کھدر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کی سیاہ پگڑی اُس کے چہرے سے کچھ زیادہ تاریک نہ تھی جس میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور پیلے پیلے دانت نمایاں تھے۔ وہ احمقانہ مسنویت میں کھٹکھٹلا رہا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے بھید میں سے کچھ تلاش بھی کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں اپنی نیکی پر امنوس کرنے لگا۔ ابھی وہ تلاش میں مصروف تھا کہ میں نے اپنے ریوالور پر ہاتھ ڈالا۔ اب وہ بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کر سکتا تھا۔

”آہستہ سے اُس نے کوئی چیز اپنے بھید میں سے نکالی، اور میں نے بھی اُس کی تقلید میں اپنا ریوالور آدھا باہر نکال لیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں محض ایک فرسودہ کاغذ کی تھوٹی سی کتر تھی، جسے وہ خوشی سے میری طرف بڑھا رہا تھا۔

”دیکھ لو، میرے پاس محکٹ موجود ہے!“

”میں نے اُس کی طرف دیکھا اور منہس پڑا

”میں نے کہا لیکن یہ تو پرانا ہے! یہ تو سالہا سال سے بے کار ہو چکا ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا یہ منہس چلتی

گاڑی میں چھلا گئیں لگانے اور یوں لوگوں کو ڈرنے کی معافی دے سکتا ہے“

”اس پر اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا، اُسے پھر خوف ہو گیا ہے کہ میں اسے باہر پھینک دوں گا لیکن

اپنی حساسیت کے باعث مجھے اس پر رحم آنے لگا۔

”میں نے کہا ”تم اندر آ جاؤ اور دروازہ بند کر دو۔“

”رہنیں صاحب، شکریہ! اُس نے کوئی آواز سے کہا ”مجھے اندر آنے کا حق نہیں ہے! میں یہیں باہر

بیٹھوں گا میں اُس جگہ کے قابل نہیں۔“

”اور وہ دروازے ہی میں بیٹھا رہا۔ میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا اور میرے گھٹنے اُس کے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہوا طوفان کی طرح اندر آرہی تھی، اور روشنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دروازے میں سے چھین کر اور ہمارے بے ڈول سایوں کو ساتھ لے کر خبر میدان کو چھوتا ہوا ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ تار کے کھمبے رات کے سیاہ پردے پر زرد رنگ کے عمودی نقوش کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے تھے، اور چنگاریوں کے جگنو انہن سے نکل نکل کر پیچھے کی طرف بھاگتے تھے۔“

”وہ مضطرب سا اندر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے اطمینان سے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں۔“

میں نے اُسے ایک سگارشیش کیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اُس نے باتیں شروع کر دیں۔

”اُس نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا سفر ہر ہفتے کیا کرتا ہے۔ وہ شیشن سے دو گھنٹہ گاڑی کا انتظار کرتا رہتا ہے اور جب وہ قریب پہنچتی ہے تو دوڑ کر ایک ہی چملانگ میں اُسے پکڑ لیتا ہے، اور پادمان پکھسکتا ہوا کسی خالی کمرے تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر گاڑی کے کسی شیشن پر داخل ہونے سے پہلے ہی کود جاتا ہے اور جب وہ چل پڑتی ہے تو پھر اس پر چڑھ آتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی گاڑی بدل لیتا ہے تاکہ سنگ دل گاڑی والوں کی نظر سے بچا رہے۔“

”میں نے پوچھا ”لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟ اور ہر ہفتے تم اتنے بڑے خطرے میں کیوں پڑتے ہو؟“

معلوم ہوا کہ وہ انوار کی چھٹی اپنے بال بچوں میں گزارنا چاہتا تھا مگر وہ اور اس کی بیوی انتہائے غربت کے باعث اکٹھے نہ رہ سکتے تھے۔ وہ ایک شہر میں کام کرتا تھا اور اُس کی بیوی کسی دوسرے شہر میں۔ پہلے پہل وہ یہ سفر پیدل طے کیا کرتا تھا اور ساری رات چلتا رہتا تھا، مگر جب وہ وہاں پہنچتا تو بے حال ہو کر گر جاتا تھا اور مکان کے باعث نہ اپنی بیوی سے بات کر سکتا نہ بچوں سے کھیل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بے باک ہو گیا اور اب اس نے گمر پینے کا ایک آسان رستہ نکال لیا۔ بچوں کو دیکھ کر اُس کے اعضا میں بقیہ ہفتے کے لئے زیادہ قن دہی سے کام کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس کے تین بچے تھے۔ سب سے چھوٹی لڑکی ابھی اچھی طرح چل بھی نہ سکتی تھی لیکن

وہ اپنے باپ کو پہچانتی تھی اور جب کبھی وہ آتا وہ پیار لینے کے لئے اُس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیتی تھی۔

”میں نے اُس سے کہا لیکن کیا تم ڈرتے نہیں کہ کسی دن یہ سفر تمہارا آخری سفر نہ ہو جائے؟“

”دوہہ مسکرایا اور اُس کے مسکرانے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے پر اعتماد ہے! نہیں، جب گاڑی کسی گستہ عند گھوڑے کی طرح شعلے اگھتی اُس کی طرف بڑھی چلی آتی تھی تو اس کو ڈرنہ آتا تھا۔ وہ کافی دلیر تھا، ایک ہی جست میں وہ اس کے اوپر ہوتا، اور گو کبھی کبھی اترتے وقت اسے ایک آدھ دھتکا لگ جاتا لیکن وہ پیسوں کی زد سے اپنے آپ کو صاف بچا لیا کرتا۔“

”اُسے صرف مسافروں کا خطرہ ہوتا تھا۔ اول درجہ کی گاڑیاں اُسے عموماً خالی ملتی تھیں لیکن آج کی طرح کے مواقع بھی اسے پیش آہی جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کی چیخوں نے اسے ایسا ڈرایا کہ اسے گاڑی سے اترتے ہی بنی اور باقی راستہ پیدل چل کر جانا پڑا۔“

”ایک رات جب وہ چوری چوری ایک دروازہ کھول رہا تھا کسی نے اُس کے سر پر اس زور کی ضرب برسید کی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اُس دن اُسے یقین تھا کہ یہ اُس کا آخری سفر ہے! یہ بات سناتے سناتے اُس نے اپنی پیشانی پر مجھے ایک بہت بڑا دلخ دکھایا۔“

”آہ، اُس کے ساتھ بڑی بدسلوکی ہوئی تھی لیکن اس کی اُس کو شکایت نہ تھی۔ اُسے لوگوں سے گلہ نہ تھا کہ کیوں وہ اس سے ڈرتے اور اپنی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں۔ جو سلوک اُس سے ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا۔ مگر جرم کے سوا اُس کے پاس چارہ کار ہی کیا تھا جب کہ وہ محسوس و تلاش تھا اور اسے اپنے بچوں کو دیکھنے کی آرزو بھی تھی۔“

”راتنے میں گاڑی کی رفتار کم ہوئی شروع ہوئی جیسے کوئی شیش آرہا ہو۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔“
”میں نے کہا دیکھو، تمہارے شیش پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ایک قیام آؤر ہو گا، تم بیٹھے رہو اور تمہارا کرایہ میں ادا کروں گا۔“

”اُس نے بلاتامل جواب دیا! نہیں صاحب، گاڑی پھر بھی مجھے دروازے سے گزرنے نہ دے گا۔ اُس نے کبھی مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ دیکھے۔ مگر میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کو یہ سفر مبارک ہو۔ میں نے آپ جیسا رحم دل اور نیک کوئی آدمی نہیں دیکھا!“

دنیا سے رنگ و بو

(۱)

(۳)

دلچسپ میں مناظر دنیا سے رنگ و بو کے اہل نظر ہزاروں ہر ایک گل بدامین
حیرت زدہ ہے ناظر نظارہ چین سے بے خوف بے محابا میں مجھ و دیگر گلشن
ہر گل ہی جانِ احت وہ بے خودی و طاری
سرایہ دارِ عشرت پروا نہیں کسی کی

(۲)

(۴)

حسنِ بے سارِ رنگیں دلکش ہے دلکش بھی کچھ اہل دل نشہ سناہ میں تاک کے ہیں
آئینہ دارِ نزہت نرگس ہے موتیا بھی وہ بے پئے ہوئے ہی بیخود بنے ہوئے ہیں
نیزنگِ شانِ یزدان ہر گل نظریں اُن کی
ہر سمت ہے نمایا ہے جامِ زندگانی

(۵)

ہشیار دیکھ غافل! یہ وقت ہے غنیمت
اک جامِ تُو بھی لے بڑھ کر اگر سو بہت

انجام سے نہ گھبرا

انجام نیک ہوگا

شاعر اور معذیہ

لندن میں ہر جگہ ہن نہیں برتا، بلکہ بعض ایسے محلے بھی ہیں جہاں افلاس اور تنہی و سستی کے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسی گھر کو لیجئے جو گلی کے ٹکڑ پر واقع ہے، اور تنگ دستی کے جملہ نوادر کا مکان بن رہا ہے۔ ایک بیوہ عورت بسترِ ملائت پر کراہ رہی ہے، اور اس کا قیم لڑکا پائری سرہانے بیٹھا لنگنار رہا ہے بیماری بجائے خود ایک معصیت ہے، مگر جب اس کے ساتھ ناداری بھی حملہ کرے تو کوڑھ میں کھلج کی مثل صادق آتی ہے۔ عورت کراہے جاتی ہے لڑکا لنگناتے جاتا ہے اور کسی ایسی بات کا امکان نہیں جو اس ماحول میں کوئی تغیر پیدا کر سکے۔ عورت کو اپنے سہاگ کے دن یاد آتے ہیں، لڑکے کو باپ کی محبت براتی ہے، لیکن یہ اتحاد خیال کسی گفتگو کا موجب نہیں ہوتا۔ آفتاب اپنے سفر کی وہ منزل طے کر چکا ہے جہاں بیٹھ کر وہ اہلِ دنیا کو خصمتِ چاشت دیتا ہے۔ لیکن آج اس کی فروسے ان ماں بیٹیوں کا نام خارج ہے۔ ماں کو خوراک تو کچا دو آنکھ میسر نہیں آتی، اور لڑکے کے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہیں پڑی، مگر وہ لنگناتے جاتا ہے اور اس بے مزہ زندگی کو ناخوشگوار گھڑیاں مزے سے گزارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر ضبط کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس لئے معذور ہے اگر اس ہولناک تنہائی، اس بھیانک ناداری اور ماں کی اس طویل بیماری میں دامنِ صبر اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اُس کی آنکھیں اُن محرابِ دردِ دروں سے دادِ طلب کریں جنہیں عرفِ عام میں آنسو کہتے ہیں۔ لڑکو گواہی ابھی سن کے اُس حصار بے نکلا ہے جسے چپن کہتے ہیں۔ مگر آخر مرد کا بچہ ہے اور اس کی غیرت قبول نہیں کرتی کہ اُس کی ماں ایک سنگترے کے لئے ترسے اور کہے۔ ”میری زندگی ایک سنگترے کے لئے ختم ہوتی ہے“، وہ منہ دیکھتا ہے۔ لندن اپنی گونا گوں مصروفیتوں کے ساتھ ایک خوش رقم کتاب کی طرح اس کے سامنے کھلا پڑا ہے، لیکن وہ اس کے پڑھنے کے ناقابل ہے۔ تنازعِ بقا میں ایک ایسا خاموش اعترافِ شکست اُس کے منہ غیرت پر تازیانہ کا کام کرتا ہے مگر بے کسی رنگ جمائے جاتی ہے اُسے سنگترہ حاصل کرنے کی تمام راہیں سدود نظر آتی ہر تھوڑی دیر کی رائگان خاموشی کے بعد پھر وہ لنگناتے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی بے معنی گنگناتے حسرت و یاس شکیلی تھی، اور اس دردناک منظر کو اور بھی اداس کر دیتی تھی۔ اس لنگنا ہٹ کی صورت کو معافی سے بچو نہ دیا جائے تو وہ گیتِ صورت پذیر ہوتا تھا جسے اُس نے خود تیار کیا تھا اور جس کے لنگناتے میں وہ اپنی

میرالم زندگی کو یک قلم بھول جاتا تھا۔ یہ گیت نہ صرف شاعری بلکہ موسیقی کے اعتبار سے بھی ایک احسن تصنیف کا قابلِ تحسین نمونہ تھا۔ لیکن فوئز مصنف اپنی متاعِ گرامیہ کی قدر و قیمت سے بیگانہ تھا۔ اس گلوگیرِ گرد و پیش کے نامتناہی سلسلہ سے تنگ آگیا تو اس نے کھر ٹکی سے جھانک کر اپنی نگاہوں کے لئے کوئی اور فضا پیدا کرنی چاہی۔ نیل گوں آسمان پر سو بج سنہری پوڈر بکھیر رہا تھا۔ آپ رواں سے ہوا اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔

کارخانوں کی سرِفعلک چینیوں سے دھواں نکل کر آسمان کی خبر لارہا تھا۔ سڑکوں پر کوئی آ رہا تھا کوئی جلد نہ تھا۔ دوکانوں پر خریداروں کا جگمگاٹا تھا۔ کوئی خریدتا تھا کوئی بیچتا تھا۔ گاڑیوں کا تانتا بندھا تھا۔ دھور بار بار داری کے فرائض بڑی بردباری سے بجالا رہے تھے۔ پرند فضا میں چکر کاٹ کاٹ کر دانے دسکے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غرض کائنات کا ہر ذرہ اپنے فرائض کی بجا آوری اور روزی پیدا کرنے میں سرگرم تھا مگر اس وسیع گیند پر ایک گوشہ ایسا نہ تھا جہاں پاٹری کسبِ معاش کے لئے تنگ و دوکرسکے۔ سب کل پرنے سرورف کا رتھے۔ کارخانہ قدرت میں ایک بے کار ایک عضوِ معطل صرف پاٹری کی ذات تھی۔ اتنے میں ایک بٹھا بڑے بڑے اشتہاروں کا بستہ بٹل ہیں دابے، ایک ہنڈیا ہاتھ میں لئے آٹھکلا۔ اُس نے سامنے والی دیوار کو غور سے دیکھا اور ٹھہر گیا۔ پھر اُس نے ایک قدر آدمِ اشتہاروں کا چپان کیا اور چلتا بنا۔ پاٹری کی آوارہ نگاہیں اشتہار پر جم گئیں اور اس کے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ اس شب کو میڈم بلیرن ایک ایوانِ موسیقی میں نغمہ سرا ہوگی اس اشتہار کے مطالعہ نے جلتی آگ پر نیل ڈال دیا۔ بیم ورجا کی کشمکش زیادہ تیز و تند ہو گئی۔ کشمکش بھی میڈم کا گانا سن سکتا، ایک نیاز ختم تھا جس کا مرہم اس کے گیت کے پاس نہ تھا۔ آخر دردا اس حد سے تجاوز کر گیا جب بقولِ حکیم غالب وہ دوا بن جاتا ہے۔ پاٹری نے ایک غبار آلود آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سنہرے بالوں کو سنوارا، ٹوپی سر پر رکھی اور لکڑی کے ایک پرانے اور بے رنگ و روغن مند و تپے سے چن بوبیڈ اور رنگ پریدہ کاغذ جیب میں ڈال کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس عالی شان محل میں وہ سب سامانِ حیش و تنم مہیا ہے جو دولت کے اشائے پر لگا رہتا ہے۔ فرش فروش، آرائش زیب و زینت مبالغے اور سلیقے کے درمیان ٹھٹھہ کر رہی ہے۔ ضروریاتِ راحت و آرام کی بوقلمونی قدرت کو جہنتِ جدید کی طرح انداز می کا مشورہ دیتی ہے۔ اس محل کی جلوہ گاہ میں ایک پری پیکر کرے کے قیوہم آئینوں میں عکس لگن ہے۔ اور کثرت میں فصاحت کی حقیقت پر وعظ کہہ رہی ہے۔ سر پایہ ہوش و

خرد کو پریشان کرنے کا سامان ہنوز کنہ صول پر چھول رہا ہے۔ نیم ہزار آنکھیں طمانیت قلب کا اظہار کر رہی ہیں۔ سفید ریشم سے لہان چھوٹ چھوٹ کر نکل رہا ہے۔ غرض جن نسلوانی کے جملہ نوادر کی نمائش اس عرصہ میں بند ہے۔ مگر ایک تپائی پر ایک سونے کی گھنٹی پڑی تھی۔ اس پر اچھلی رکھی۔ ایک دلکش آواز سے مکرہ مہر ہو گیا۔ خادمہ باب حاضر ہوا۔

غنیہ نے کہا: کون ہیں آپ؟ ان ملاقاتوں سے دم ناک ہیں آگیا لان کے نزدیک غنیہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ شب کو گاتی ہے اور دن بھر ان کی تقریظوں پر سر دھنتی ہے (دراخاموٹی) جیو تم بڑے ہو گئے مگر کسی کو ڈالنا نہ آیا۔

”محض نو کیا عرض کروں۔ سرکار کی بدولت کیا نہیں آتا مگر محض وہ بھولے بھالے لڑکے کے سامنے کس منہ سے جھوٹ بولوں۔ ورنہ میری سخن سازی کا لوہا بڑے بڑے لارڈ ڈانتے ہیں۔“

”یہ بات ہے تو آنے دو! سے۔ بچوں کا دل توڑنا مجھے بھی گوارا نہیں۔“

پائری ایک ہاتھ میں کاغذ اور دوسرے میں ٹوپی پکڑے داخل ہوا جھک کر آداب بجا لایا اور اس کی جنبش بڑ پرکھنے لگا۔ اور اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اماں بیمار ہیں، اور ہمیں کھانا تو رہا ایک طرف دوا تک خریدنے کی توقع نہیں۔ اس امید پر آیا ہوں کہ اگر آپ ایک دفعہ میرے اس گیت کو گانے کا شرف عطا کریں تو ممکن ہے کہ کوئی اس کا حق تصنیف خرید لے اور میں اماں کے لئے دوا اور سنگترہ خرید سکوں۔“

سرفرد حسینہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ اُس نے پائری سے کاغذ لے کر اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر ایک نظر نے اُسے جتا دیا کہ یہ گیت سرسری نظر سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے پہلے تو اس نے یونہی گنگنا کر اس کی موسیقیت کا امتحان کیا پھر دوڑی دوڑی گئی اور پیانو پر گنا کر پرکھا اور اٹھے پاؤں واپس آکر کہنے لگی۔

”یہ گیت تم نے لکھا ہے ایہ سن اور الفاظ کا یہ جن انتخاب! اچھا تو آج شب گانا سننے آؤ گے۔“

”مشوق سے، مگر اماں۔“

”میں کسی کو تیار داری کے لئے بھیج دوں گی۔ اس کی فکر نہ کرو یہ دوسرے شلنگ۔ ان سے فی الحال دوا اور خوراک خرید لو اور یہ محض ہراسے دکھا کر تم میرے پاس پہنچ جاؤ گے۔“

پائری رخصت ہوا تو اُس کی رفتاریں فرق تھا۔ سوچ کی روشنی زیادہ روشن اور دنیا رہنے کے قابل نظر آتی تھی وہ چیزیں جن کے بدل سکتے کا خیال اُسے قناعت کی تلقین کرتا تھا اب اسے لوازم حیات سے معلوم ہوتی تھیں۔ دوا اور سنگتوں کے علاوہ اُس نے اتنی چیزیں خریدیں کہ دس شلنگ ٹھکانے لگ گئے گھر آیا اور چہرے سامنے رکھ کر ان سے لپٹ گیا۔

پاٹری کو آج کا دن معمول سے زیادہ لمبا معلوم ہوا کہ بجٹ کتنے ہی میں نہ آتا تھا۔ آخر آفتاب نے سرمایہ دار سرور تباہی کر کے مزدور کے حال پر رحم کھایا اور خدا خدا کر کے دنیا کا پیچھا چھوڑا۔ پاٹری نے کھانے سے فرصت پائی ہی تھی کہ ایک فکٹر ایک نرس کو لے کر اپنی اور بیار کے آرام کا انتظام کرنے لگا۔ ماں کی نگہداشت سے مطمئن ہو کر پاٹری نے ایوان موسیقی کا رخ کیا۔ داخل ہوا تو اُسے اور ہی دنیا نظر آئی۔ بجلی کی روشنی کی چمک اور خواتین کے جواہرات کی دھلک نے ایوان کو رشک فلک بنا رکھا تھا۔ کوئی نشست خالی نہ تھی۔ اور یہ جم غفیر بہتین گوش ہو کر پرے کی طرف ٹھکی بانٹے تک رہا تھا۔ آخر ساز چڑھے۔ حاضرین کی نشست گاہیں روشنی برائے نام رہ گئی۔ پردہ اٹھا تو ایک ماہ جیس جلوہ نگاہ تھی۔ اس کے حسن گلوں کو دیکھ کر یہ جو حیرت دنیا خراج تحسین ادا کرنے میں کھوس گئی اور اُسے دھیان تک نہ رہا کہ اس مجسمہ غنائی وزیر یابی کا فرض صرف بصارت افزوی نہیں بلکہ سماعت پروری بھی ہے۔

یہ عالم دیکھ کر دم بخود پاٹری کا ننھا سادل دھکودھکود کر رہا تھا۔ پہلے ہی اسے کچھ شک سا تھا اب تو بالکل ناامید ہو گیا کہ یہ خاتون ایسے پُر وقار مجھے کے سامنے اُس کا گیت گانے کو کیونکر روار کھے گی۔ لیکن پانیوں کی دلکش صدا نے خشک حانوں پر پانی ڈالا اور وہ سمجھ گیا کہ اس کے پردوں میں اس کا گیت بول رہا ہے۔ گانا کیا تھا ایک بولتا ہوا ہاد تھا جس نے حاضرین کی سادہ بہ ہی چھین لی، اور یہ قصر تعبیر ماتم فنان کی صورت سو گوار نظر آنے لگا۔ سید سے سائے الفاظ کیا سوز و گداز اور رقت کے لیے نشتر پوشیدہ تھے کہ حاضرین کے دل میں اتر گئے۔ بڑے بڑے گھاگ تھیٹر نواز معترف تھے کہ انہوں نے آج کب تک ایسا پڑا اور درد انگیز گیت نہیں سنا۔

پاٹری اس غیر متوقع کامیابی سے مدہوش ہو رہا تھا۔ وہ کئی دفعہ اس حقیقت کو خواب سمجھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہ کب ایوان موسیقی سے نکلا اور کب گھر پہنچا۔

دوسرے دن پاٹری یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میڈم بلیرن کی شانہ کاڑھی نہ صرف اُس کے مکان کے سامنے آکر رک گئی، بلکہ میڈم اس کے مکان میں داخل ہوئی اور ایک شکستہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاٹری کو اُس نے گود میں لے لیا۔ اور اس کے سنہرے بالوں میں اپنے ہاتھ سے شانہ کرتے ہوئے اُس کی ماں سے کہنے لگی ”بی بی تمہارے بیٹے نے تمہاری عزت کو تمہارے بدل دیا ہے۔ مبارک ہے وہ ماں جسے خدا نے ایسا بیٹا عنایت کیا۔ آج صبح لندن کے ایک مشہور ناشر نے اس کے گیت کے عوض ساڑھے چار ہزار روپے کی رقم پیش کی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ جب اس کی فروخت سے ایک خاص رقم وصول ہو جائے گی تو پاٹری شریکِ منفعت شمار ہوگا۔ تمہارا بچہ حقیقی معنوں میں نامیہ درجن ہے مگر اب تک کی کتاب اور دل کھول کر خرچ کرو۔“

نور الہی
محمد عمر

اے سکھی

اے سکھی! بارہویا کے وہ گونا گوں محسوسات جو تیری موجودگی میں سراپا راحت تھے لبِ لمحے محض ہر الم خوابِ معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے خیال کی نیرنگیاں تھیں! کون جانتا تھا کہ کسی دن میں اور تو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے! لوگ کہتے ہیں پریت کے حالوں میں پھنس کر تو نے میری محبت کے اُس تار کو توڑ ڈالا ہے جو میرے اور تیرے من کو ایک کئے ہوئے تھا! کیا واقعی وہ ٹوٹ گیا اور اب تجھے میرے دل کی دھڑکن نہ سنائی دے گی؟ سچ بتا میری سکھی! آج جب کہ میرے دل کے مندر میں گم کردہ مسرتوں نے ایک شورشِ پاک کر دی ہے کیا اس وقت تو میرے ان جذبات سے محض بیگانہ ہے؟

اے سکھی! خزاں کے موسم میں، جب سورج افقِ مغرب میں غائب ہو گیا تھا اور تو مجھ سے مل کر آہستہ خزاں کے ساتھ واپس جا رہی تھی تجھے نہیں معلوم (آہ تو نے پھر کر میری طرف نہیں دیکھا تھا) کہ میں نے تیری واپسی کی راہ میں کتنے موتی بکھیرے! میں دور تک تیرے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

اے سکھی! تو نے اپنی محبت پر میرے دل کا آرام قربان کر دیا مگر میں تجھ کو بے وفائے کہوں گی کیونکہ ریت کے دیوتا نے تیری طرف دیکھا اور تو ان نگاہوں کی طرف کھچی چلی گئی!

آہ! ایک شام تھی جب تو مجھ سے بچھڑ گئی اور مجھے نہیں معلوم کہ اب کون دن کسے گا جب میرے خیال کی تاریک بستیوں میں تیرے ملاپ سے ایک نور افشاں روشنی کی نمود ہوگی۔ نہ معلوم فطرت کے دھیان میں اس پیم کی بجلی کا کون سا وقت ہو! تو چلی گئی! تیرے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد مجھے مطلق ہوش نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ شاید میں تھوڑی دیر کے لئے کھو سی گئی مگر اب میرا اضطراب نہ پوچھ؟ میں نہیں جانتی اے سکھی! کہ اب دنیا میں کیا ہو گیا ہے!

آہ! نہ معلوم کیوں یہ دنیا کے راہ و رسم دو محبت کرنے والوں کے درمیان خلیج بن کر حائل ہو جاتے ہیں اس لئے میں جانتی ہوں کہ کسی محبت کا ایک آتشیں ہاتھ تجھ کو مجھ سے چھین کر لے گیا۔ مگر میں حیران ہوں کہ میرے دل نے پندارِ مسرت کیوں چھوڑ دیا؟ اسے کس سماوی طاقت نے مجبور کر دیا ہے!!!

اے سکھی تیری جدائی کی الم خیز لذتوں نے، شاید دنیاوی مناظر کا دلکش رنگ سلب کر لیا ہے۔ وہ تمام نظارے جو تیری موجودگی میں مسرت نواز معلوم ہوتے تھے مجھے اب ذرا بھی تسکین فراہم نہیں محسوس ہوتے! مگر یہ کیوں؟ اے میری سکھی! یہ تمام دلی بے چینیاں کیوں؟ صرف اس لئے کہ تو مجھ سے دور ہے۔ موسم بہار کی دلفریبیاں اب میرے لئے ناخوشگوار ہو گئی ہیں۔ رجب میں غنچہ کو چمکتا ہوا دیکھتی ہوں تو مجھے تیرے نرم و خوش آئینہ مقصود کا خیال آ جاتا ہے اسی طرح جب بلبل کوئی موسیٰ راگ گاتا ہے تو مجھے وہ گیت یاد آ جاتے ہیں جو میں ادھر تو ہم آواز ہو کر گایا کرتے تھے!

اے سکھی! کیا تو وہ دلفریب رات بھول گئی جب پھولوں میں محبت تھی۔ جب چاند کی ترنم پاش روشنی چھائی ہوئی تھی۔ جب راہ نور دستائے بھی ممکنگی باندھے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور جب بلبل کی میٹھی میٹھی لوریاں سن کر کائنات بھی سوئی ہوئی تھی۔ اُس رات چمن کا ایک پر نور ستارہ — چاندنی کا ایک نازک پھول سمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا میں اسے توڑنے کے لئے لپکی لیکن تو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "رحن کچھ دور ہی سے نظر افروز ہوتا ہے!" میں رک گئی لیکن میرا دل مچلا جاتا تھا کیونکہ چاہت کو ہمیشہ حصول کی آرزو رہتی ہے! بس اے سکھی! وہی میرے اور تیرے ملاپ کی آخری رات تھی جس کا خیال میری دسوزی کے لئے تازیانہ ہے۔ رقص موسیقی کے بغیر ہمیشہ نشہ رہتا ہے! پھر میں تجھ سے جدا ہو کر کیسے شاد رہوں۔ میں نے تو تیرے بغیر کبھی کسی منظر کا لطف نہیں اٹھایا!!!

اے سکھی! یہ ایک سہانی شام ہے جنگل میں کیف چھایا ہوا ہے۔ آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ دھندلی سی مری نقاب کے نیچے نوزائیدہ چاند "ماہ پارہ" بن کر چمک رہا ہے اور اس کے گرد تاروں کے پھیلے ہوئے شرار، بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے نیل پر ایک انشاں چھڑک دی گئی ہے!

سمادی سطح ہمارے نظر فریب ہے لیکن متبسم و گلریز صحرانہ خوبوں کا مرقع بنا ہوا ہے، جہاں لطیف اور تازہ ہواؤں نے عجیب ترنم زاکینیت پیدا کر دی۔ جو خوشنما اور دلفریب پھولوں پر آج غیر معمولی محبت ہے۔ ہندی کی لہریں برابر لوٹ رہی ہیں اور کبھی کبھی ان کے ٹھمرنے پر معلوم ہونے لگتا ہے کہ پانی کی عین گہرائی فلک تیشال بن گئی ہے!

خاموش جنگل میں، دریا کے کنارے پر معلق، خدا جانے کتنی کافوری شمعیں روشن ہیں یعنی جگنو تیز ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے تارے ٹوٹ کر گر رہے ہیں!

آہ! کہیں پھینکا رہا ہے مگر اس کا وجد آفریں ترانہ مجھے اب ایک دل سوز نغمہ معلوم ہوتا ہے!
مجھ سے بہت دور کہیں آبشار لالپ ہے ہیں لیکن اُن کے راگ میرے لئے اب ایک مانتی لگے ہیں!
جس میں رہا بَدل کے غمگین تاروں کو چھڑھینے کے سوا، کوئی اور علامت نہ ہوا مجھے ہوا کی شوخیں بھی ناپسند ہیں
اور پھولوں کی مسکراہٹ سے لیکر غمناک خیال میری روح میں نفوذ کر رہا ہے۔ آہ! کائنات اپنی حسن آرائی کے لئے کوئی
موقع و محل نہیں دیکھتی!

لٹم دنا زک گھانسیں بھی میرے لئے آرام دہ نہیں محسوس ہوتیں۔ ندی کا خرامِ عشوہ پاش برابر جاری
ہے اور میں نہیں جانتی کہ اس کی لہریں میرے کتنے آنسوؤں کو بہائے گئیں ہیں!
یہ شام نہ جانے کیوں اتنی دلغریاں لے کر طلوع ہوئی ہے جو حسن کو نظارہ کا آرزو مند کر دے۔ لیکن آہ مجھے
اس سے کچھ سوکار نہیں کیونکہ میں بہار کے سائے لطف بھول چکی ہوں۔ اے سکھی! اگر گر جانے والی رات میری
آنکھوں میں سما گئی ہے جب تو میرے ساتھ تھی۔ اب کوئی منظر میری نگاہوں میں نہیں سما تا۔ جب تو ساتھ نہ
ہو تو ایک اکیلی، تیری سکھی، کس چیر سے دلچسپی لے؟ کیونکہ اے سکھی! بہار کے بغیر تو، کبھی بلبل بھی چین میں نہیں
آیا کرتی!

اے کاش! وہ مسرت بالے پھر لپٹ آئیں جن میں تو مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ کاش تو پھر اسی اندازِ خرام
سے واپس آجائے!

تجھے ان لہروں کی موگند! بتا! اے میری اچھی سکھی کہ تو کب آئے گی؟ کیا تو اس لئے نہیں آتی کہ میں نے
تیری واپسی کے لئے، ندی کے کنارے سے کوئی نایاب تحفہ نہیں چنا؟

دنیا میں نایاب تحفے تو شاید یہی ہیں، پھولوں کی کلیاں، مسرت کے الفاظ، محبت کے جذبات موتیوں کی لڑیاں
اور ستاروں کی بنیدیاں مگر سب اپنی جگہ پر خوبصورت نظر فریب میں اس لئے ہیں ان میں سے کس کو انتخاب کرتی؟
ہاں مجھے یاد آتا ہے کہ تجھے چھائے ہوئے آسمان کے بکھرے ہوئے ستارے بہت پسند تھے مگر میں میرے لئے
تاروں کے منہ گور کہاں سے پاؤں؟

اچھا۔ اُن لے سکھی! میں اپنے اشکوں کا، اُن اشکوں کا، جو میں نے تیری یاد میں بہائے ہیں قطرہ قطرہ
جمع کر کے اُن کی لڑیاں پر دوں گی اور اے سکھی! جب تو واپس آئے گی تو میں یہ ہار تیرے گلے میں ڈال دوں گی!!

غاک نشیں

تہذیب فاطمہ عباسی

مختل ادب

ٹی جلی بولی

۱۹۲۹ء کی آل انڈیا ہندی پرچار سبھا کے صدر ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری تھے۔ ان کا خطبہ صدارت جہاں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اصلاح کی موثر تجاویز کا حامل ہے وہاں ادبی لحاظ سے بھی ایک نہایت دلکش اور بلند پایہ چیز ہے۔ ہم اس کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔

ہم ایک ٹی جلی ہندوستانی زبان کے پھیلائے کی ترکیبیں سوچنے اور اس راستہ میں جو دشواریاں اور ٹھنائیاں ہیں ان پر غور اور وچار کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

اس ٹی جلی زبان کی بابت میں دو باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ ایک تو خود زبان کی شکل صورت دوسری اس کی لکھن کی بابت۔ پہلے خود زبان کو لیجئے۔ کوئی بھاشا یا تو بولنے والوں کے دل کی حالت اور جذبات کو ظاہر کرتی ہے جسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ یا پھر یہ اس کا ذریعہ ہوتی ہے کہ دن رات کی زندگی میں جو ضرورتیں پڑیں ان کو ایک دوسرے پر ظاہر کر سکیں۔ بھاشا ان دونوں صورتوں میں سے کیسے پیدا ہوئی اس کی بابت کسی کا کوئی خیال ہو ہندوستانی بھاشا کے لئے تو ہر حالت میں ایک ہی راستہ پر آگے بڑھنا ہے۔ ہم اگر یہ مان لیں کہ ٹی جلی زبان اپنی اصلی غرض کی وجہ سے کبھی بھی صرف ایک گروہ کی زبان نہیں ہو سکتی جس میں دوسرے گروہ کی بھاشا ذرا بھی ٹی نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم کسی گروہ کے اچھے لکھنے والوں کا یہ حق چھین لیتے ہیں کہ وہ اپنے خاص انوکھے انداز میں لکھیں اور اس طرح بھاشا کے خزانے کو مالا مال کریں۔ ہاں یہ بات ضرور غور کرنے کی ہے کہ جان بوجھ اور سوچ سمجھ کر اچھے لکھنے والے کہاں تک زبان میں خل دیں۔ اور میں اس پر اس جگہ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ تو سب انیس گے کہ آپس میں میل جول سے جو ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں ان کا زبان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ معاشی اور ارتقا کی ضرورتوں سے بھاشا میں کتنے ہی نئے نئے لفظ آجاتے ہیں اسی میل جول سے چھوٹے چھوٹے گانوں کی زبان بڑھ کر صوبہ کی زبان اور یہ بڑھ کر ساری قوم کے دیس کی زبان بن جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ ایک جگہ اور دوسری جگہ کی زبان الگ ہوتی اور پھر مل جل کر ایک بنتی ہے خود سہج میں ایک حصہ ایک طرح بولتا ہے اور دوسرا دوسری طرح مگانوں کے کسان اور شہر کے شہری بات چیت کا اپنا

اپنا انداز رکھتے ہیں شاعر اور کوئی بھاشا میں اپنی جدا رسم بنالیتے ہیں۔ اپدیش اور وعظ کہنے والے اپنا الگ رنگ نکالتے ہیں مگر پھر بھی یہ سب مل جل کر ایسی بھاشا بنالیتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آتی ہے اور جسے سب مان لیتے ہیں اور یہ سب کچھ چپکے چپکے ہوتا رہتا ہے۔ بھاشا کے جو بولنے والے سچ سچ کوئی اچھی بات یا کوئی بری بات کہتے ہیں یا کسی بات کو اوروں سے اچھی طرح کہہ دیتے ہیں انہیں کا طریقہ سب کو بھاجاتا ہے اور سب اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ مدرسے، اخبار، کتابیں نامک یہ سب چیزیں اپنے اثر سے زبان کو ایک سا بنانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ پر اگر ان اثروں سے کوئی بھی جان بوجھ کر اس کی فکر کرے کہ کسی ایک گروہ کی زبان تو ملی جلی بھاشا میں زیادہ آجائے اور دوسرے کی اس میں ذرا نہ ملے پائے، کسی ایک پیشہ والے کے شہ تو لے لے جائیں اور دوسرے کے نہیں۔ کسی ایک صوبہ کی بات چیت کا انداز بھاشا میں جان بوجھ کر ملایا جائے دوسروں کا نہیں، تو پھر سب چیزیں قومی راشرٹری بھاشا کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہی بات ہے کہ میں ان کو شمشوں سے بہت ڈرتا ہوں جو ہندوستانی زبان کو مسلمانوں کی زبان بنانے کے لئے عربی لفظ ٹھونس کر اور ہندوؤں کی زبان بنانے کے لئے سنسکرت ملا کر کی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے دیس کے لوگوں سے بات چیت ہی نہیں کرنا چاہتے اچھا ہے کہ وہ عربی یا سنسکرت ہی کو اپنی زبان بنالیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ ان زبانوں میں بھی کچھ بہت نہ کہہ سکیں گے۔ مگر خیر ان کی خوشی۔ گروہ ایک ملی جلی ہندوستانی زبان کی جڑ کیوں کاٹتے ہیں انہیں اگر عربی یا سنسکرت سے بہت لگاؤ ہے تو وہ ہندوستانی زبان کو ہندو مسلمان راجا اور پر جا اور ترا و رکھن کے رہنے والوں کی ملی جلی زبان بننے سے کیوں رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ ننھا سا بچہ جو اسی میل کے لئے پیدا ہوا تھا کیسے بڑھے گا۔ ہندوستانی بھاشا نہ عربی ہے نہ سنسکرت، اور نہ ہو سکتی ہے، یہ تو سب ہندوستانی ہے یعنی اس بڑے دیس کے سب رہنے والوں کی زبان جس میں سب ایک دوسرے کی بات سمجھیں جس پر سب کو ناز ہو جس کی سیوا میں سب کا حصہ ہو جس پر پورا قبضہ کرنے کا حوصلہ کوئی نہ کر سکے جو لوگ ہندوستانی زبان کا پرچار کرتے ہیں ان کا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ اس میں زبردستی ایسے عربی اور سنسکرت لفظ نہ ملنے دیں جن سے یہ سب کی زبان نہ رہے پائے اور کسی ایک فرقہ کی زبان بن جائے۔ اس لئے کہ سب کے میل جول کی یہاں تو ملی جلی زبان ہونی چاہئے۔

میں نے جو کچھ کہا اس سے آپ سمجھیں گے کہ میں بھاشا کو بس کام کاج کے لئے ضروری جانتا ہوں کہ ایک آدمی دوسرے سے اپنا مطلب کہہ سکے۔ منڈی اور بازار میں اپنا لین دین کا کام نکال سکے اور اسی لئے نہیں چاہتا ہوں کہ بھاشا سہل اور سادہ، اور سب کی سمجھ میں آنے والی اور سب کے لئے ایک سی ہو۔ ہاں آپ کا یہ سمجھنا کچھ ٹھیک ہے۔ میں بے شک بھاشا کا یہ کام سمجھتا ہوں پر خالی ہی نہیں سمجھتا۔ الگ الگ دیسوں کے لوگوں میں بات

جیت کے لئے جو زبانیں لوگوں نے بنائی ہیں جیسے مولینا کی سمساری زبان یا اسیرانتو جس میں ہر چیز کے آخر میں "وہ" ہر صنف کے آخر میں "آ" ہر کام کے نام کے آخر میں "ای" سائے حکموں کے آخر میں "او" ہے یا اسی طرح اور میں نہیں چاہتا کہ آپ ہندوستانی بھاشا کو کتر بیونت کر ایسا باقاعدہ کر دیں۔ میں مانتا ہوں کہ کاروبار کام کلج سے آگے بڑھ کر ہر زبان اپنے آپ کو خوبصورت اور سندر بنانے کا بھی حق رکھتی ہے۔ ہر زبان کے ٹکڑوں میں آپس میں ایسا رشتہ ہوتا ہے جو بس اسی میں ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا اور ہر زبان کو اس خوبصورتی کے پیدا کرنے کا حق ہے پر میرا یقین ہے کہ جہاں کہیں آدمی اپنے دل کے حال کو اچھی اور خوبصورت اور سندر طرح سے دوسروں پر ظاہر کرتا ہے، چاہے بھاشا میں چاہے تصویر میں، چاہے بات میں چاہے رگ میں چاہے بڑی بڑی عمارتوں میں۔ جو چیز سچی طرح سندر ہوتی ہے اس کا کسی نہ کسی مفید اور کام کی چیز سے ضرور بڑا تعلق ہوتا ہے۔ بھاشا میں بھی حسن اور خوبصورتی کام کی باتوں کے ساتھ مل سکتی ہے، نہیں تو یہ ممکن ہے کہ بھاشا ضرورت سے زیادہ خوبصورت، ضرورت سے زیادہ بناوٹی ہو جائے۔ بہت زیادہ لکھے پڑھے بن بن کر باتیں کرنے والے ہمیشہ زبان کو ایسا ہی بناوٹی بنا دیتے ہیں پر میری کوئی جانتا ہے کہ یہ لوگ زبان کے کچھ بہت بڑے دوست نہیں ہوتے۔ کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں جب آپس کا رشتہ کمزور ہو جاتا ہے تو زبان نیچے گرنے لگتی ہے، ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھانے کی ضرورت اپنا راستہ لیتی ہے اور بناوٹ سجاوٹ اپنا۔ عام لوگ پہلی کے ساتھ ہوتے ہیں، بہت پڑھے لکھے دوسری کے ساتھ، لیکن جدائی سے زبان کے دونوں حصے بڑے بڑے ٹٹے میں رہتے ہیں۔ لیٹن زبان کا حشر یہی ہوا۔ یونانی اور سنسکرت پر یہی گزری۔ میرے نزدیک تو کسی زبان کے اوپر بڑھنے اور نیچے گرنے کی اس سے بہتر کوئی نشانی نہیں کہ اس میں کام کی بات اور بناوٹ سجاوٹ میں کیا تعلق ہے۔ جب کوئی قوم بنتی ہوتی ہے۔ جب بڑی بڑی باتیں اور نئے نئے خیال تنک پہنچانے ہوتے ہیں جب آپس کے جھگڑے مٹنے مٹانے ہوتے ہیں، جب سب چیزوں کی کایا پلٹنی ہوتی ہے تو زبان کو سہل اور سادہ رہنا پڑتا ہے اور بناوٹ سجاوٹ دور کھڑی رہتی ہے۔ پر جب قوم بن جاتی ہے ترقی کے رستے پر پڑھ لیتی ہے یا چین سے دن کاٹتی ہے، جب مدت بڑھ جاتی ہے، لوگ سب ایک طرح رہنے بسنے لگتے ہیں رسم و رواج سب میں ایک سے ہو جاتے ہیں تو زبان میں بناوٹ سجاوٹ کے دن آتے ہیں، ہم تو ابھی اپنی قوم بنائے ہیں ہماری زبان کو سہل اور سادہ رہنا چاہئے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس سادگی کے ساتھ جس کے لئے میں آپ کے کہہ رہا ہوں آپ کی بھاشا سندر اور خوبصورت اور زوردار نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہو سکتی ہے۔ پر تب ہی کہ یہ آدمی آدمی میں بس اپنا کام نکالنے کے لئے بول چال کا

کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دل کے اندر بھری ہوئی آگ کی گرمی ہو جو باہر نکلے۔ دلوں کے اندر لہریں مارتے ہوئے دریا کا بہاؤ ہو جو سینہ میں نہ سما سکے اور باہر نہ نکلے۔ ہندوستانی زبان کے لئے دل کی یہ گرمی اور خیالات کا یہ بہاؤ ایک ملی جلی ہندوستانی قوم کے خیال سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستانی زبان اسی ملاپ کا نشان ہے، ہم میں یہ خیال جتنا بچتا ہو گا اور اسی خیال کے ساتھ جن چیزوں کو لگاؤ ہے جب وہ بڑھیں گی تو ہماری زبان میں بھی گرمی اور خوبصورتی لائے گی۔ قوم کو جن چیزوں سے لگاؤ اور جن باتوں سے پریم ہوتا ہے انہی کا روپ اس کی زبان کی خوبصورتی اور زور میں دکھائی دیتا ہے۔

اب رہا لیکن اس سوال میں جہاں لفظوں کے معاملہ میں ہندوستان دونوں سے چاہتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کا خیال کریں اور اپنا الگ الگ خاص حق نہ جتائیں اور زبان میں جس جس جگہ سے ہو سکے ایسے لفظ لائیں جو ہماری بھاشا کے رنگ سے میل کھاتے ہوں، ہاں لیکن کے معاملہ میں ہندو یا مسلمان کسی سے نہیں چاہتا کہ وہ اپنی لیکن چھوڑ دیں میں نے اپنی سواگت سیتی کے سبھاپتی کی وہ بات بڑی دلچسپی سے سنی جو انہوں نے مسلمانوں سے کہی ہے کہ وہ عربی لیکن چھوڑ کر دیوناگری لیکن اختیار کر لیں۔ انہوں نے یہ بات مل سے کہی ہے اور صاف صاف کہی ہے، جسے میں بہت پسند کرتا ہوں لیکن میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ یہ یقین ہے اور میں نے کانگریس کے سبھاپتی کی حیثیت سے بھی یہی کہا تھا کہ ہندو مسلمانوں میں جو سیاسی یا مذہبی جگاڑ ہے وہ اصل میں ایک زیادہ گہرے مقابلہ کی اوپری شکل ہے جو ہندوستان کے سوا اور ملکوں میں بھی رہا ہے اور تازہ جس سے نا آشنا نہیں یہ دراصل دو الگ الگ تہذیبوں کا فرق ہے جو ایک دوسرے سے آکر ملی ہیں۔ اس جگاڑ کو دور کرنے کی سب سے اچھی شکل میرے خیال میں یہ ہے کہ ہر تہذیب کو باقی رہنے کا حق دیا جائے، آپس میں رواداری اور ایک دوسرے کی عزت پیدا کی جائے اور ایسے موقع نکالے جائیں کہ دونوں آپس میں مل کر ایک دوسرے کی دل کی گلی کو سمجھ سکیں۔ اس میں ہندوستان کا سیاسی بھلا ہی نہیں دیکھتا بلکہ اس کی تہذیب اور تمدن کی ترقی کے لئے بھی یہی ضروری ہے کہ اس دیس میں جتنی قومیں آباد ہیں ان کے تمدنوں کو اپنی اپنی جگہ پر رہنے اور بچنے پھولنے کا حق دیا جائے تاکہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے دل لہجے والے رنگ میں ہر ایک اپنا اپنا سرا مل سکے۔ یہ ضروری ہے کہ اس میں دیر لگے گی مگر تمدنوں کا ملنا اور بہ لٹنا کوئی باز نیچروں کا کھیل اور تماشا نہیں کہ جب چاہا انہیں ملا دیا اور جب چاہا بدل دیا۔ ہم میں اتنی عقل ہونی چاہئے کہ ہم ٹھیکریں انتظار کر سکیں۔ مسلمانوں سے یہ کہنا کہ وہ اپنی عربی لیکن چھوڑ دیں، اس سے یہ کہنا کہ تم اپنی ساری تاریخ کے سرمایہ سے ماتھ دھو بیٹھو، اس لئے کہ اسی لیکن کے ذریعہ تو اس خواندگی کو بھی اس کے ماتھ میں آئی ہے، جس میں اس کے سارے کچلے کام رکھے ہیں۔ یہ کبھی اس سے چھین لینا خود اسی کے لئے برا نہیں ساری دنیا کے لئے برا ہے۔

وجدانیات

ہر جلوہ ترے حسن کی محفل نکلا ہر ذرہ ترے درد کا حامل نکلا
جب غور سے یہ بستی عالم دیکھی تاحد نظر سلسلہ دل نکلا
کیا لطف نظر ظاہر ہے یہ جلوہ کیا ہے ترکیبِ دل و دیدہ بین کیا ہے
کیا دیکھا نگاہوں نے، نہ دیکھو اس کو یہ دیکھو نگاہوں میں تماشا کیا ہے
خونِ دل پر شوق بہا دیتی ہیں اشکوں سے گل تازہ کھلا دیتی ہیں
روتا ہوں تو سیرِ غم جہاں کسے آنکھیں مری اک باغ لگا دیتی ہیں
"خضرِ راہ"

تعلیماتِ کبیر

- ۱- پھولوں کے باغ میں نہ جا، لے دوست وہاں نہ جا!
خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے۔
"تو کنول کی ہزار پتیوں میں اپنی جگہ بنا اور وہاں سے حسنِ لازوال کا تماشا کر۔"
- ۲- "مخلوقِ برہما (خالق) ہیں ہے اور برہما خود مخلوق میں موجود ہے۔" وہ دونوں ایکٹھ سرے سے جدا ہیں اور ملے ہوئے بھی۔
وہ خود درخت بھی ہے بیج بھی اور نمبھی وہی ہے۔ وہ خود پھول ہے۔ میوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے۔
وہ خود سورج ہے، روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہو جائے۔ وہ خود برہما ہے، مخلوق بھی اور بایا بھی۔
وہ خود مختلف صورتوں میں اور لامحدود مکان میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔
وہ خود سانس ہے، لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے۔
وہ خود حد ہے، خود ہی لامحدود بھی ہے، اور محدود اور لامحدود کی حدود سے بالاتر بھی ہے۔
وہ خود پاک ہے اور ہر لائش سے مبرا ہے، وہ برہما اور مخلوق سائرہ وار ہے۔
- ۳- "اے پانڈے! تو کہتا کیا ہے؟ ہندو اور ترک، یہ کہاں سے آئے ہیں۔ یہ رات کس نے نکالا ہے، ہلپے دل کی لاشی
لو، بہشت کہاں ہے۔ کس نے لے حاصل کیا ہے؟ لے ہیوقوف الان خالی خالی باتوں کو ترک کر اور رام نام چپ۔ تم تو
بدعاشی کی باتیں کرتے ہو۔ لے کبیر! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت گمراہی میں رہا۔"
"دارو"

مطبوعات جدیدہ

173853
29 9 13

پرواز خیال - یہ قیمتی تصنیف کی ایک نہایت خوبصورت مبلکہ کتاب ہے خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی کا دیوان کہنا چاہئے۔ ابتدا میں خواجہ عبدالرؤف صاحب شہرت لکھنوی کے قلم سے ۴۵ صفحہ کا ایک مہبوط مقدمہ ہے، اس کے بعد حبیبوں کی مختصر انتماس ہے اور پھر غزلیات میں جو ۸۰ صفحات پر ختم ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت اور کاغذ کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپ ہے۔ بیل، ارشدول کا رنگ سرخ ہے اور ضمنوں کے لئے عام سیاہ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔

مقدمہ میں شہرت صاحب نے پہلے تو زبان اردو کی مختصر تاریخ لکھی ہے، پھر مرکز کا جھگڑا پھیلنا اور اس سلسلہ میں عثمانیوں کی مردم نشانی اور غزلیت زبان میں عوام کی شرکت کا گلہ کر کے قند رنگ اور الفاظ میں کیا ہے اور پھر حمید صاحب کی شاعری پر تنقید لکھی ہے حمید صاحب کی زبان واقعی نہایت صاف اور صمیم ہے۔ اشعار فن کے لحاظ سے بے عیب ہیں، لیکن ان میں کیف و اثر اور جدت نہایت کمی بہت کمی ہے عموماً مضامین بالکل سادہ ہیں۔ چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

طور پر لطف یہ کائنات ہوا	آن تک سورت آشنائے ہوا
تیرے بیمار سے اچھے ہیں	کوئی منت کش دوا نہ ہوا
عہدہ گر جب تیغ کے کرسائے قاتل ہوا	نار کی چٹاکے بولی تو بھی اس قابل ہوا
مٹ گیا جہنم والو حیف ہے نشان اپنا	تھا اسی فنس میں تو کل تک آشیان اپنا

قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے :- خواجہ حمید الدین صاحب ۹۰ - امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

”ومی شاعر“ انگریزی زبان کا ایک ہفتہ وار علمی، ادبی اور سیاسی اسلامی اخبار ہے جو مولوی غریب احمد صاحب کی ادارت میں الہ آباد سے نکلتا شروع ہوا ہے اسلامیات پر اس میں بعض نہایت مفید اور پر معلومات مضامین شائع ہوتے ہیں۔ قومی معاملات پر آزادانہ رائے رکھتا ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں یہ اخبار بہت بڑا حصہ لے گا۔ حجم ۲۰ صفحات اور سالانہ قیمت چھ روپے بارہ آنے ہے۔

کامیابی - جس نظامی ایٹرنل ٹریجر کسپنی لمیٹڈ دہلی کا ماہوار رسالہ جس کے قلم نگار اس وقت تک اس کے چھ سو سے زائد شائع ہو چکے ہیں اس میں اچھے اچھے ادیبوں کے قلم سے تجاراتی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو علم و عمل کی تلقین کی جاتی ہے اور انہیں ترقی و کامیابی کے راستے بتائے جاتے ہیں۔ دیکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ ہر صفحہ پر تصویر اور بلاک ڈیزائن ہے چھاپا گیا ہے حجم ۸۴ صفحات اور سالانہ چندہ دو روپے۔

مخزن الحساب - الجبر ایچ۔ اے۔ ایک جامع کتاب ہے جس میں ریٹیکر ٹریل، ایس۔ سی کلاس اور نارنل سکولوں کے نصاب کے مطابق ایک ہزار دو سو نہایت اہم ستھانی سوالات پر حل کے میں شکل ہولات کے حل اور حل کے متعلق ہدایات بھی لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۰۰ سے زائد مسائل اور نمونہ امتحانات کے پچھلے بھی دیے ہیں جن سے کتاب اور زیادہ کارآمد ہو گئی ہے۔ مخزن الحساب لکھنؤ

حساب کی تمام مروجہ کتابوں کا پچوڑ ہے، اور جو طلباء اس زیر مشق رکھیں گے ضرور کامیاب ہونگے۔ حجم ۲۵ صفحات قیمت ایک روپے۔

آپ کی بیگمات کیلئے لاجواب تحفہ

کشیدہ کاری کی اصلی مشین

یہ وہی بے نظیر مشین ہے جسکی نسبت اخبار تہذیب نسواں میں ایک محترم خاتون اپنے مضمون کے دوران میں فرماتی ہیں کہ ”سچ تو یہ ہے کہ اشتہار کی تعریف و توصیف بے جا نہیں۔ اسی نیچھی سی چیز اپنی بساط سے زیادہ کارآمد ہے جو ہمیں اس کے وسیع استعمال کی خوبی واقف میں ضرور مجھ سے متفق ہوگی کہ اگر اشیائیں ایسی خوبصورت کارآمد ہوتی ہیں کہ کمرہ ملاقات گویا ایک ننھا سدا بہار باغیچہ بن جاتا ہے جہاں بادِ نسیم کا خوف نہ خزاں کا اندیشہ — پرفے، مہر پوش، گدیاں، فوٹو فریم، پلیٹیں وغیرہ کے لئے یہ کاریگری نہایت موندن سے مگر احتیاط سے زیر استعمال رکھیں تو سالہا سال تک یہ چیزیں خراب نہیں ہوتیں۔ بچوں کے کلوک اور فراک پر بھی خصوصاً گرم لباس پر ایک ایک چھوٹا سا پھول خوشنما معلوم ہوگا اور پرندے تو عموماً بہت خوبصورت کارڈے جاتے ہیں۔“

ان الفاظ پر ہمارا کچھ اضافہ کرنا ہے۔ سو دیکھو کہ آپ ایک مشین محض سالانہ منگوا کر دیکھتے دنوں میں آپ کا گھر پر رونق ہو جائے گا۔ محض محفل سوتی اور دوسرے مناسب کپڑوں پر نہایت عمدہ میل بوٹے نکالنے کے لئے ہماری مشین نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے جو خوش کام میں سرانجام دیتی ہے اس کا ابھرا ہوا کام فی الحقیقت بڑا دل فریب ہوتا ہے یہ مشین آپ کی بچیوں کے لئے ایک نہایت اچھی سہیلی ثابت ہوگی جو انہیں نون میں ایسی ہنرمند بنا دے گی کہ لوگ حیران ہوں گے۔

قیمت مشین و سامان متعلقہ حسب ذیل ہے

مشین درجہ اول جو بے حد مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے محلی کس میں بند ہے چار پے آٹھ آنے درجہ دوم تین پے پینش بھی اچھی خاصی ہے کپڑا آنے کا فریم جسکی قسم اعلیٰ ایک روپیہ آٹھ آنے ریشم کی پھیاں ایک دوپہ اور رانی دجن کپڑے پر چھپے ہوئے نقشے آٹھ آنے فی عدد سب چیزوں کا اٹھا محصول ڈاک ۸

اس مکمل سٹ کو استعمال کر رکھنے کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا پالش شدہ نیا کر دیا ہے قیمت صرف ایک پے چار آنے ہر مشین کے ہمراہ کام کا نمونہ اور مفصل ترکیب استعمال اردو اور انگریزی میں بھیجی جاتی ہے نقلی مشینیں بازار میں بہت آگئی ہیں اصلی مشین کے لئے آپ صرف ہمارا پتہ یاد رکھیں ہماری فرم کی نسبت مختصر جواب بذمہ متنازعہ صاحب سیزنڈنٹ پولیس بمبئی لٹریچر میں تصدیق کی جاتی ہے کہ اس احمد صاحب کے ہاں کی کشیدہ کاری کی مشین کارآمد اور پائیدار ہے ہر ایک بہن اس سے مستفید ہو سکتی ہے وغیرہ بھی اس کارخانہ سے اچھا دستیاب ہوا (اخبار کا حوالہ سے دینے سے پکیٹنگ کا خرچ نہیں لگے گا۔

زرنگار محلی جوتیاں

یہ نفیس اور خوبصورت جوتیاں جن پر وضعہ از سنا کام بنا ہوا ہے نفیس مزاج اصحاب اور بیگمات کے لئے تیار کروائی گئی ہیں پہلنے میں آرام دہ اور ہلکی۔ دیکھنے میں خوشنما اور دلکش اور دامن کے لحاظ سے گویا معنت ہیں۔ گھروں میں پہننے سلیپوں کا عمدہ بدل ثابت ہوگی۔ کہیں آنے جانے کے وقت پہننے آپ کی عزت و بالا کریں گی۔ قیمت زمانہ ساز محفل پر پچھلے نمبرے کام والی دوپے چار آنے فی جوڑہ۔ مردانہ ساز محفل یا چمڑہ پر سنا کام اور دس آنے فی جوڑہ سیاہی کا خاکہ فرمائش کے ساتھ آنا چاہئے۔ فرمائش میں رسالہ کا حوالہ دینے سے پکیٹنگ معنت،

ملنی کپتہ سائیں احمد انڈیپنڈی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۵ لاہور

بال متز گولیاں (ہمدرد اطفال)

بچوں کی سارے طبیعت سے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور
 ٹھوسے روئی ہو جاتا ہے لیکن یہی نو سالانہ تندرستی کی حالت میں
 ایک مسرت کو دو بالا کر دیتی ہیں۔ جو شخص اولکین سے ہی پیاسے لنگی
 جوانی کیسی ہوگی۔ اور کیا کر سکے گا۔ اس لئے زیادہ نکو تندرست اور بخت
 کو طاقت و رہنمائے کیلئے بال متز گولیاں کا استعمال کرادیں گی گولیاں
 بچوں کی جلد شکایتوں مثلاً دست کا آٹانے کا ہونا شکم کا بڑھنا جسم کا زرد
 پڑنا تلی سستی۔ کالی۔ دہلاہن وغیرہ دور ہو کر پوری صحت اور تندرستی
 پستی چالاک حاصل ہوتی ہے قیمت فی ڈبیر جس میں سگولیاں ہیں،
 ایک روپیہ (درا)

تمام انداموں کے متفق ہو گئے

تمام مذاہب اور فرقے اسی طرح متفق ہو گئے ہیں کہ ایک سر کیسیاں میں
 ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ سلطان عیسیٰ پندت مولوی۔ پادری۔ ان سب
 کی متفقہ آوازیں ہیں کہ دوا زنا حال کی بجاہت ہیں۔ اور اپنا تالی نہیں
 رکھتے۔ (۳) بالوں بھی بارہ دہتے ہیں۔ (۴) پشیر زیادتی ہیں۔ (۵) اہمیت
 بالوں کے برائے نام ہے۔ (۶) علاوہ اس کے کہ گولیاں خون کی نراہوں
 صدمہ بند ہو رہی ہیں۔ جو بھی استعمال کرتا ہے تعریف کئے بغیر نہیں رہتا۔
 بھی ضرور بخیر کریں۔ ٹھوسے ایام میں بھی یہ بھی خون کی خرابی اور کئی
 درد و سہ کی کمزوری دماغ اور قوت حافظہ کی کمی وغیرہ دور کر کے اور جلد طاقت
 مدد و جلد طاقت و توانائی حاصل ہوگی قیمت برائے نام ۲۰ گولیاں فی ڈبیر
 ۵ ڈبیراں صحت و تندرستی کی نعمت خوشی و مسرت کا منبع تہا راستہ دکھلائے
 تہا دوست کتاب کام شاستر بالکل مفت ملگا کر ملاحظہ فرمادیں۔

وید شاستری منی شکر جی گوڑیہ ڈم جی جام نگر کا ٹھیکہ دار

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نیا ایجاد آلہ پرس و رنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں۔ ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے
 آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ جو کسی روح آپ چاہیں۔ آلہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا درست
 جواب دیگی معمولی لکھا پڑھا ہر اور ہر ذہن کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی چاکشی کی ضرورت ہے عالم بالا کے
 حالات معلوم کرنا گندہ کا پتہ لگانا چوکی سرخ معلوم کرنا دشمن سے بددینا یہ تمام باتیں فتح پانا سخت سے سخت کام سے حسب نواہ کام نکھلانا اور دینا مفصل
 پر ایک سیکنڈ میں خبریں مباحثہ دیکھنا نوکری یا دوزخ کا حاصل کرنا بددعاؤں کی عبارت پڑھنا مقتل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیاء معلوم کرنا
 وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں۔ اس نایاب چیز کا ہر گھر میں موجود ہونا لازمی ہے۔ اصل قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصے کے لئے محدود
 صرف تین روپے آٹھ آنے لئے عبا میں گئے ہدایات مفت ارسال ہوگی۔ لپٹا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں تحریر فرمائیں۔

کمپلر منڈیکھٹ (H) جالبندھر شہر (پنجاب)

ہر قسم کی بہترین ترکی ٹوپیاں مناسب قیمت پر

ممتاز کیپ ٹاپس دہلی

نے متا کر کے نیا انتظام کیا ہے۔

جو براہ راست ولایت سے آتی ہیں۔ اسی لئے مقابلہ اپنے خریداروں کو مستعد کرتے دامنوں پر پڑا نہیں روانہ کرتا ہے جس سے خود اپنے شہر تیرہ گز مقامات سے ڈیڑھ کفایت اور اطمینان حاصل ہوگا۔ صرف اپنے سر کا ٹاپ اور رنگ کی تفصیل فرمادیں۔

ترکی ملائم ٹوپیاں بانات تیلی

- ۱۔ صحرائے عرب چھاپ بانات افضل ترین۔ نہایت ملائم رواں باریک۔ ۶/۰
- ۲۔ بچہ چھاپ بانات نہایت عمدہ ملائم رواں لمبر باریک۔ ۴/۰
- ۳۔ افغانی چھاپ بانات نہایت ہی تپش ریشم کے ملائم بہترین چیزیں ٹوپی ۳/۰
- ۴۔ بھندنا ہر قسم برائے ترکی ٹوپی ۱/۰ ۱/۴ ۱/۶ ۱/۸ ۱/۱۰ ۱/۱۲ ۱/۱۵ ۱/۱۸ ۱/۲۰
- ۵۔ علاوہ ازین ہر قسم کی ترکی سخت اور فلیٹ کیپ اور ہر وضع کی بالدار ریشمی وغیرہ ٹوپیاں بھی موجود ہیں۔

نوٹ۔ دوکانداروں کیلئے خاص رعایت جو بذریعہ خط و کتابت پہنچتی

ترکی ملائم ٹوپیاں بانات موٹی

- ۱۔ سلطان چھاپ بانات بہت ہی موٹی اور نہایت ملائم ۶/۰
- ۲۔ ڈبل شیر کو لا اصلی بانات ۴/۸
- ۳۔ شیر کو لا اصلی ۴/۰
- ۴۔ نور نقلی ۳/۰
- ۵۔ جہاز چھاپ ۲/۸
- ۶۔ نور السدر بانات قدرے موٹی ۲/۰
- ۷۔ دیگر نرم ٹوپیاں ۱۱/۰ ۱۱/۸ ۱۱/۶ ۱۱/۴ ۱۱/۲ ۱۱/۱

نوٹ۔ قیمت ٹوپی علاوہ بھندنا ہے۔ محصول ایک بذریعہ خریدار

ملنے کا پتہ ممتاز کیپ ٹاپس ۱۵ دھلے

جذبات ہمایوں

آزبیل خاں بہادر ریاں محمد شاہدین صاحب مرحوم بی لے بارٹ لاج چیف کو رطب پنجاب کا مجموعہ کلام جس میں امن کی دلولہ انگیز اخلاقی فلسفیانہ نظمیں۔ اور دکش غزلیات درج ہیں شروع میں ان کے سبق آموز حالات زندگی اور کلام ہمایوں پر تبصرہ کیا گیا ہے حجم ۸۰ صفحات دو تصویریں اسنے درج کی۔ لکھائی چھپائی و لاشی کا فخر قیمت درجہ اول ایکٹ پیہ دوم ۱۲ علاوہ محصول ڈاک

انتھ

مینچر سالہ ہمایوں ۱۳۸۶ لارنس روڈ۔ لاہور

جام صہبائی

حضرت انصہبائی کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے آپ کی حیات افروز اور روح پرور رباعیات ملک مختلف بلند پایہ رسائل میں شائع ہو کر نقادان فن سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ جام صہبائی کی خوبونکی ضمت کے لئے حضرت کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت صرف ۸ ملٹی کا پتہ

جلال الدین اکبر۔ الراعی بلڈنگ بیروں بھائی

دروازہ۔ لاہور

جدید فرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے!

طبعہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر ساگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔
اعلیٰ طبقت کی خواتین میں لگانے کا اس کارخانہ کا تیار کردہ بونویر آمل شہال کی ہیں۔
لگانے کی یہ عطر



دوستدارِ ایشیائی

ایک سو پچاس ایڈیشن کی مکمل تاریخ کیسے سمجھ سکیں گے
مشرقِ ہندوستانی کی مختصر تفصیل

دیباچہ ہندوستانی مغربی کے مشہور علماء و اسکالرز کی اچھے اچھے لکھے ہوئے اور تحاریر نامہ حضرت علامہ سراقیل سے
مختصر کی مختصر بنیاد ہندوستانی کے علم سے مغربیوں کے تامل پر مبنی ہے
ہندوستان کے مشہور اور بہترین کاتب آج کے لکھنؤ اور راجستھان کے نامور کاتبوں کا نام غالب اور سراقیل کا نام غالب
ایسا صحیح اور خوش خط نسخہ آج تک شائع نہیں ہوا
میں کی لکھائی چھپائی اور حسنِ ترتیب کی مثال ہندوستان ایک صدی تک پیش نہ کر سکے گا
یہ مرقع پچاس نگین شاہکاروں کا ایک شاندار مجموعہ

Twenty-one Coloured Plates reproduced in 4 colours by a world famous firm in Europe.
Two Coloured Outline Plates Classical work of Chughtai.
Two Reproductions of Chughtai's most fascinating pencil sketches.
Nine Colour Illustrations And the rest : Illuminated plates on tints.
Bound in Imitation Morocco, marked with beautiful design on face and back in gold, workmanship of a European firm. Enclosed in a handsome box.
All the 300 pages printed on Japan Vellum & high class Chromo, one sided thick Art paper with highly decorated and artistic borders. SIZE 12" x 10".

ہندوستان ہندوستانی تمدن کی اس عظیم شان سے ہمیں ملے گا اور ہم سمجھیں گے کہ کیونکہ اس کے لکھنؤ کی ایڈیشن شائع ہو گیا
یہ ہندوستان سب غریبوں کے قریب حضرت شہزادہ آج ہے
میں لکھنؤ

جہانگیر ایک کلب چاکسویان لاہور

مرقع چغتائی اور نقشاوان فن

سٹوڈیو لنڈن :- چغتائی کی تصویریں نظمیں ہیں جو ساز موسیقی سے آزاد رنگ اور خطوط سے آزاد سنہ شاعری جذبات سے گہرا کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ جو کچھ اس وقت تک ان کے متعلق کیا جا چکا ہے وہ اس زیادہ روشنی ڈالتی ہیں + قبل یورپ میں دور جدید کی مصوری کا اولین پیش رو اور ایشیائی دور احیا کا سند کے ٹائمز { صبح ترین مظہر قرار دیا جا چکا ہے +

برٹش ایمپائر ریویو لنڈن { ویسٹمنسٹرن ٹائمز لنڈن میں ایشیائی مصوری میں جدید ترین دور احیا کے متعلق در اپنی تصاویر میں جالباتی شش خطوں اور رنگوں میں نئی نئی ترکیبیں وضع کرتا ہے۔ جو ہر طرح سے قابل شائش ہے + موڈرن ائمڈین آرٹسٹ { چغتائی کی کامیابی کا راز اسکی تصاویر کے تحریریں پنہاں ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ہمارے محسوسات کو بند کرتا ہے۔ اسکی رباعیات عمر خیام کی بناٹی ہوئی تصویریں رباعیات عمر خیام کی ان تصویروں سے جو اس وقت تک پیش کی جا چکی ہیں بلند ترین میں مع مغربی مصو ڈیولیک کی تصویروں کے سبکی رباعیات کی تصویروں کو دنیا سے عالم کی شہرت حاصل ہے +

سٹینوے امریکہ { چغتائی اور روسی مصو نگار اسک کی تصویریں فن کی خصوصیات اور اسکی خوبوں کی کام ایک لکڑ بارے کا کام ہے اور چغتائی کی تصاویر ماضی و انت کے شاہکار ہیں۔ چغتائی اپنے فن کا بہترین استاد ہے۔ اسکی تصاویر تخیلی بلکہ تخیلی ہیں کیونکہ ان کا ہر ایک پہلو مادیت کی آلودگی سے بالکل پاک ہے۔ اسکی تمام تصاویر عجائے غریب تخیل کا نمونہ ہیں۔ انگریزی مصو برن جون کے مانند اسکی تصاویر پر ایک دیوانی کیفیت اور سکوت آگین فضا طاری ہے۔ اسکی تصاویر کی طرف متوجہ ہونے سے اس فن کے پھر سے شہر ہو جاتا ہے کیونکہ اسکے شاہکاروں پر ایک خاص فقدان اور اوجھٹ طاری ہے۔ اس شہر کے سامنے مغربی مصو تمام اور بعد سے معلوم دینے لگتے ہیں۔ اس کے ایشیائی تخیلات نے ہمارے سطح نظر کو بدل دیا ہے +

چغتائی بنگال سکول کے مصو روں سے الگ اور بالکل مختلف ہے اس میں بنگالی مانچسٹر گارڈین لنڈن { تصویروں کی نسبت رنگوں کا کمال خیال کی شہرت اور احساس جیات بہت زیادہ ہے +

ڈاکٹر جیمز کزنز بالینڈ { چغتائی کا تعلق ایک ایسے ارمان بھرے گرجے سے ہے جو کبھی کاروان جیات ڈاکٹر جیمز کزنز بالینڈ سے دل بھر کر مطمئن نہیں ہوتے۔ چغتائی انگریزی شاعر کینٹ کی طرح ہے جس نے ادیت سے بچ کر ایک یونانی دنیا میں پناہ لی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ چغتائی یہ پناہ اپنے آپ میں حاصل کرتا ہے۔ وہ ہمارے درمیان ایک نیا پیغام لے کر آیا ہے۔ ایسا پیغام کہ ہم اس کے ایک غیر فانی سرور حاصل کریں +

چغتائی حسن آرنگی اور فنون اور جالیات کا بہترین مظہر ہے۔ یہیں + ونیکا ناچیل مدراس { مرقع چغتائی نہیں آسکتا تھا کہ ہم ہندوستان میں ایسی شاعر کتاب کبھی حاصل کر سکیں + مرقع چغتائی قدیم اور جدید فن طباعت میں ایک انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ٹائمز آف انڈیا { سے قبل ہندوستان کے کسی زبان میں بھی ایسی شاعر کتاب شائع نہیں کی + مدراس میل { مرقع چغتائی جدید ہندوستانی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ آج تک کسی جدید ہندوستانی مصو کی کتاب اس شان اور معیار سے کبھی طبع نہیں ہوئی +

ملنے کا پتہ جہانگیر بک کلب چاکسواران۔ لاہور۔ قیمت ستر روپے

